کلیات آنند نرائن ملا

ترتیب و تدوین

خلیق انجم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2010
تعداد : 550
قیمت : -/170 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1349

Kulliyat-e-Anand Narayan Mulla
Compiled by
Khaliq Anjum

ISBN :978-81-7587-419-0

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025
فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

کلاسیکی ادب کی بازیافت کا سلسلہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں جاری وساری ہے مگر بیش تر زبانوں میں اس وقت بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب متعدد ادب پارے زمانے کی دست و برد کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس کا ایک حل یہ ہے کہ ان اہل قلم کے شہ پاروں کو محفوظ کر لیا جائے جو زیادہ عرصہ نہ گزرنے کے باوجود نئے کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ جن کے بارے میں اندازہ ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان کے فن پاروں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس بارے میں ایک منصوبہ بند پروگرام کے تحت قومی اردو کونسل نے سب سے پہلے پریم چند کی کلیات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ کلیات پریم چند کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا اور متعدد نئے کلاسیک سے متعلق جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ''کلیات آنند نرائن ملاّ'' کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کی ترتیب و تدوین ڈاکٹر خلیق انجم نے کی ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جن شاعروں نے اردو شعر و ادب میں اپنے لیے ایک ممتاز حیثیت بنائی ہے ان میں پنڈت آنند نرائن ملاّ کا نام بہت نمایاں ہے۔ آنند نرائن ملاّ کا شمار اردو کے ممتاز ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ مختلف اداروں نے آنند نرائن ملاّ کو انعامات اور اعزازات سے نوازا ہے مگر پھر بھی ان کے شعری اور نثری خدمات کا خاطر خواہ اعتراف نہ کیا جا سکا۔ اس کلیات سے ان کی شعری خوبیوں کی بخوبی وضاحت ہو سکے گی۔

مجھے امید ہے کہ کلیات آنند نرائن ملاّ کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔ قارئین سے گزارش ہے کہ کلیات میں انھیں اگر کوئی کوتاہی نظر آئے تو قومی اردو کونسل کو مطلع کریں تاکہ اگلے ایڈیشن میں اسے دور کیا جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

حرفِ آغاز

بیسویں صدی کے اوائل میں اردو شاعری کے اُفق پر جو شعرا نمودار ہوئے، اُن میں ایک نمایاں نام پنڈت آنند نرائن ملا کا بھی ہے۔

پنڈت آنند نرائن ملا کے والد جگت نارائن ملا ماہرِ قانون تھے اور اپنے پیشے میں اُنھوں نے خاص امتیاز حاصل کیا تھا بلکہ اتنا امتیاز حاصل کیا تھا کہ وہ عرصے تک لکھنؤ کے بار کونسل کے چیرمین کے عہدے پر فائز رہے۔

ملا صاحب لکھنؤ کے ایک محلے رانی کٹرہ میں 29/اکتوبر 1901 کو پیدا ہوئے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے مشہور تعلیمی ادارے فرنگی محل سے شروع ہوئی تھی، جس میں برکت اللہ رضا فرنگی محل سے تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ فرنگی محل میں ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد ملا صاحب گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہو گئے اور 1917 میں اس اسکول سے اُنھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد کنگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے، جہاں سے اُنھوں نے انٹرمیڈیٹ، بی۔اے اور ایم۔اے کے امتحانات پاس کیے۔ اُنھوں نے ایم۔اے انگریزی میں پاس کیا۔ ملا صاحب نے 1925 میں قانون کے امتحانات پاس کیے اور پھر لکھنؤ ہی میں وکالت شروع کر دی۔ وہاں ایک بار ICS کے امتحان میں بھی شریک ہوئے لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔

ملا صاحب نے فارسی اور اردو کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی اور اردو تو اُن کی مادری زبان تھی۔ وکالت کی وجہ سے انگریزی زبان پر بھی اُنھیں بہت اچھی قدرت حاصل تھی اور اپنے شوق کی وجہ سے اُنھوں

نے انگریزی ادب کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔لکھنؤ کے ماحول میں رہ کر ابتدائی عمر ہی سے ملا صاحب کوشعروادب سے دل چسپی ہوگئی۔وہ لکھنؤ کے ایک مشہور شاعر سراج لکھنوی کی شاعری سے متاثر ہوگئے اور شعروشاعری کا آغاز کردیا۔

ملا صاحب ایک بہت کامیاب وکیل رہے ہیں اور ایک مقام وہ آگیا جب وہ ہائی کورٹ کے جج کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اُنھیں پنڈت جواہر لال نہرو کے خاندان سے بہت دل چسپی تھی، اس لیے شاید اُنھوں نے نہرو کے مضامین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ ملا صاحب کو سیاست سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اس میدان میں بھی اُنھوں نے ممتاز حیثیت حاصل کی۔ یہاں تک کہ راجیہ سبھا کے انتخاب میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے ۔جب پارلیمنٹ کی رُکنیت ختم ہوگئی تو گورنمنٹ کے مختلف عہدوں پر فائز ہوئے اور گورنمنٹ کی کئی اہم کمیٹیوں کے ممبر رہے۔

شاعری ملا صاحب کی سرشت میں داخل تھی جس کی جانب اُن کا ایک انتہائی سوچا سمجھا اور سنجیدہ رویہ تھا۔ملا صاحب کی شاعری کے موضوعات دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ملا صاحب تفریحِ طبع کے لیے نہیں تسکینِ طبع کے لیے شعر کہتے تھے۔وہ انتہائی وسیع المطالعہ شخص تھے اور ایک دانشورانہ ذہن رکھتے تھے۔اس کے ساتھ ہی فارسی ، اردو کے کلاسیکی ادب اور مغرب کے جدید ادب پر اُن کی گہری نظر تھی۔ قانون کے ساتھ اُن کا پیشہ ورانہ لگاؤ تھا اور سیاسی اور سماجی مصروفیات اُن کا شعارِ زندگی۔ شاعری اُن کے لیے ایک ذوقی چیز تھی۔ وہ ایک عدیم الفرصت انسان تھے لیکن شعر گوئی سے اُن کا لگاؤ اتنا زیادہ تھا کہ وہ اپنی تمام مصروفیات کے باوجود شاعری کی فرصت نکال لیا کرتے تھے۔ادب اُن کے لیے شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں تھا۔ وہ عام طور پر تمام ادبی سرگرمیوں سے بھی اس لیے الگ تھلگ رہتے تھے کہ اُنھوں نے شعروشاعری کے میدان میں شہرت کے لیے قدم نہیں رکھا تھا۔شہرت اور ناموری کے لیے تو اُن کے پاس اور بہت سے دوسرے طریقے تھے۔ زمانے کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر آپ اس سے کچھ طلب نہیں کرتے تو پھر وہ بھی یہ نہیں سمجھتا کہ اس پر آپ کا کچھ قرض ہے۔ چناں چہ ہماری تنقید بھی کسی حد تک ملا صاحب کو اس لیے نظرانداز کرتی رہی کہ وہ بھی اپنی طرف سے اس کی نظرِ کرم کے خواہاں نہیں تھے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اردو تنقید ملا صاحب کی شعری اور

علمی فتوحات کے ذکر سے یکسر خالی ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور، علی جواد زیدی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور خلیق انجم نے اُن کی کتابوں پر پیش لفظ لکھ کر اُن کے فن اور شخصیت کا بہت اچھا جائزہ لیا ہے۔

ملا صاحب ایک بے لاگ قسم کے انسان تھے۔ مزاجاً وہ خوشامد پسند تھے اور نہ خوشامدی۔ یوں سمجھیے کہ دنیا داری کی کوئی ادا ان میں نہیں تھی۔ وہ ایک کھرے اور سچے انسان تھے۔ سماجی زندگی میں انھیں اتنی شہرت حاصل تھی کہ اُنھیں مزید شہرت حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ بیسویں صدی کے منظرنامے پر ملا صاحب کا عکس نظر ہی نہ آتا ہو۔

اُنھیں ادبی خدمات کے سلسلے میں انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ وہ بہت سی باوقار ادبی انجمنوں سے بھی وابستہ رہے۔ دراصل ان کی سماجی شخصیت اتنی بڑی تھی کہ اُس نے ان کی شخصیت کے بعض دوسرے امتیازات کو نمایاں ہونے کا پورا موقع ہی نہیں دیا۔ ان امتیازات میں ان کا شاعر ہونا بھی شامل ہے۔

ملا صاحب کا نام صفِ اوّل کے شاعروں میں ہوتا ہے لیکن ملا صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف اس طرح نہیں کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔ اُن کے عہد کے نقادوں میں چند حضرات نے اُن کی شاعری پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ اُنھیں مختلف اداروں نے انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا ہے لیکن پھر بھی اُن کی خدمات کے صلے کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ جس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ وہ کبھی کسی کی خوشامد نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے پیشے یعنی وکالت، سیاسی اور سماجی خدمات میں ایسے اُلجھے رہتے تھے کہ اُنھیں اردو کے نقادوں سے تعلقات وسیع کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی خدمات پر نقادوں نے بہت زیادہ توجہ نہیں کی۔

ملا صاحب کی شخصیت اور فن دونوں میں لکھنوی شرافت، شائستگی، لطافت، اعلاترین اخلاقی قدریں اور انسان دوستی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

ملا صاحب کی شاعری کے ابتدائی عہد میں لکھنؤ میں صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی اور ثاقب لکھنوی جیسے کلاسیکل انداز کی شاعری کرنے والے ممتاز شاعروں کا طوطی بولتا تھا۔ ملا صاحب نظم اور غزل کے شاعر تھے۔ اُنھوں نے مغربی ادب کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا، اسی لیے اُن کی شاعری صرف حسن و عشق اور عاشقی کے مضامین تک محدود نہیں تھی۔ ملا صاحب سے کچھ عرصے پہلے لکھنؤ میں چکبست ہی ایسے

شاعر نظر آتے ہیں جن کی شاعری میں ہمیں اُس عہد کے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی عکاسی نظر آتی ہے لیکن چکبستؔ کے موضوعات کا دائرہ بہت محدود تھا۔ چکبستؔ کے بعد دوسرا نام ملا صاحب ہی کا نظر آتا ہے۔ ملا صاحب نے اپنی شاعری کے ذریعے چالیس پچاس سال تک ہندوستان کی سیکولر اور انسانی قدروں کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

میں نے کچھ عرصے پہلے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ملا صاحب کی شاعری کا اُفق بہت وسیع ہے اور متنوع موضوعات کا اِحاطہ کرتا ہے۔ ملا صاحب کی شاعری محض چٹخارے کی چیز نہیں ہے۔ ان کا کلام عصری زندگی کے مسائل اور تقاضوں کا ترجمان ہے۔ ملا صاحب نے اپنے طویل تخلیقی سفر کے دوران غزل کو اُبھرتے ڈوبتے، ڈوبتے اُبھرتے دیکھا ہے۔ غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا جاتا ہے۔ جب غزل معتوب ہوئی اور پھر ایک وقت وہ آیا جب غزل ایک بار پھر فنی سج دھج کے ساتھ زندہ ہو کر ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ آج کے دور میں غزل گائیکی کو جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور غزل گائیکی کو جتنے عظیم گلوکاروں نے گلے لگایا ہے ایسا کسی دور میں دیکھنے کو نہیں ملا۔ اسے ''وحشی صنفِ سخن' بھی کہا گیا اور وہ وقت بھی آیا جب اردو غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا گیا تھا۔ ملا صاحب کی شاعری کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے غزل اور نظم دونوں میں اپنا ایک مقام پیدا کیا ہے۔

ملا صاحب نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود شاعری اور نثر دونوں میں کئی اہم کتابیں تصنیف کیں۔ اُن کی کتابوں میں (1) جادۂ ملا، (2) جوئے شیر (3) کچھ ذرّے کچھ تارے اور (4) کربِ آگہی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کی دو کتابیں نثر میں بھی ہیں۔ ایک تو 'میری حدیثِ عمرِ گریزاں' کچھ نثر میں بھی' اور دوسری پنڈت نہرو کے مضامین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ 'مضامینِ نہرو'۔

اردو شاعری کے موضوعات میں جس میں غزل کے موضوعات بھی شامل ہیں، ایک اہم موضوع انسان دوستی بھی رہا ہے۔ یوں تو رسماً ہر شاعر نے انسان دوستی پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن بعض شعرا نے انسان دوستی کے موضوع کو بطور خاص برتا ہے اور ایسے لوگ وہ ہیں جو غزل کے ساتھ ساتھ نظم کے بھی شاعر رہے ہیں۔

تغزل سے ملا صاحب کے مزاج کو کوئی خاص علاقہ نہیں ہے۔ ان کے رنگِ سخن پر ان کا فکری رویہ

حاوی ہے۔ مغربی ادب سے بھی ملاّ صاحب کے مزاج کو خاص لگاؤ یوں رہا ہے کہ اس میں انسان دوستی کی بات کہی جاتی ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان دوستی کے جذبات ملاّ صاحب کی شاعری میں ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے بے شمار نظموں میں طرح طرح سے انسان دوستی کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

ملاّ صاحب دوسروں کے غم اور درد کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ وہ چوں کہ انتہائی غیر متعصب اور سیکولر قسم کے انسان تھے اس لیے انسانی رشتوں کی پاس داری ان کے کردار کا ایک اعلا جوہر تھا جو ان کے کلام میں نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ بقول کمال احمد صدیقی:

> ''ملاّ صاحب کے ہاں سارے جہاں کا درد مختلف نظموں میں طرح طرح سے ظاہر ہوا ہے۔ وہ دوسروں کے دلوں کے درد و کرب کو سمجھتے ہیں اور اسی طرح اپنے ماحول اور اس دنیا سے اور اس میں رہنے والوں سے دردِ مشترک کا رشتہ قائم رکھتے ہیں جو اُن کو بہت عزیز ہے۔ ملاّ صاحب کو انسانیت اور انسانیت کی فلاح عزیز ہے۔''

ملاّ صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر تھے اور انجمن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مجھے اُن کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ میں اُن کی انسان دوستی کی بے شمار مثالیں پیش کرسکتا ہوں۔ یہاں صرف ایک دو واقعات بیان کرتا ہوں۔

ایک دفعہ عید کا موقع تھا۔ ہمارے اسٹاف کو عید کے موقعے پر تہوار الاؤنس کے طور پر کچھ رقم ملتی ہے۔ ایک دفعہ عید آئی اور انجمن کے حالات ایسے نہیں تھے کہ اسٹاف کو عید کا الاؤنس دیا جاسکتا۔ میں نے ملا صاحب سے اپنی پریشانی بیان کی۔ کہنے لگے کہ پھر یہ ''غریب لوگ عید کیسے منائیں گے۔'' میں نے کہا کہ ملاّ صاحب! میں یہی تو آپ سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔ ملاّ صاحب نے کہا کہ کل پورا حساب لکھوا کر بھیجیے، میں چیک بھیج دوں گا اور میرے حساب بھیجنے پر لگ بھگ بارہ ہزار روپے کا چیک ملاّ صاحب نے بھیج دیا۔ جب انجمن میں کچھ رقم آگئی تو میں نے ملاّ صاحب کو وہ رقم واپس کرنی چاہی۔ ناراض ہوکر کہنے لگے۔ ''خلیق انجم صاحب! مجھے لگتا ہے آپ کا واسطہ کاروباری لوگوں سے رہا ہے۔ میں نے انجمن کو یہ رقم سود پر نہیں دی تھی۔ کارکنوں کی مدد کے طور پر جو کچھ میرے پاس تھا حاضر

کردیا۔ آئندہ کبھی ایسا نہ کیجیے۔" میں ملا صاحب کی باتوں سے شرمندہ ہوگیا۔

ایک دفعہ ہمارے اسٹاف میں ایک چپڑاسی کی بیٹی کی شادی تھی۔ اُس نے مجھے قرض کے لیے درخواست دی لیکن انجمن کے حالات اس قابل نہیں تھے کہ میں قرض دے سکتا۔ جب اُس نے بہت اِصرار کیا تو میں نے اُس سے کہا کہ تم ملا صاحب کے پاس چلے جاؤ وہ شاید کوئی راستہ نکال دیں۔ اُس نے میرا کہنا مانا، ملا صاحب کے پاس چلا گیا اور کچھ دیر بعد خوش خوش واپس آیا۔ کہنے لگا میں نے صرف چار ہزار روپے قرض مانگے تھے۔ ملا صاحب نے پانچ ہزار روپے میری بیٹی کی شادی کے لیے دے دیے۔ یہ تھی ملا صاحب کی انسان دوستی۔

ملا صاحب کے ہاں دنیا کی ہر چیز پر حدتو یہ ہے کہ مذہب پر بھی انسانیت کو فوقیت حاصل تھی۔ اُنھوں نے خدا کو مخاطب کرتے ہوئے ایک شعر کہا تھا:

تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے
ترے ہاتھوں، بہت توہینِ آدم ہوتی جاتی ہے

انسانیت کے موضوع پر ملا صاحب کا ایک اور شعر ہے:

مجھے اے خالقِ کون و مکاں خاموش کردینا
مرے لب پر نہ جس دن دردِ انساں کی پکار آئے

دس بارہ سال قبل میں نے ملا صاحب کی شاعری پر "اردو شاعری کی منفرد آواز" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا۔ میں نے مقالے میں لکھا تھا:

> جب انسان کی کمر سیدھی ہوئی، اس نے سماجی زندگی کا آغاز کیا اور اس کے شعور میں وسعت پیدا ہوئی تو سچائی اور حقیقت کی کھوج اور حق و باطل یا تیرگی اور نور کی جنگ نے اس کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ لاکھوں برس گزرنے کے باوجود ابھی تک یہ جنگ جاری ہے۔ ملا صاحب کی شاعری میں انسان کی شکست و فتح، خوشی و غم اور مسلسل جدوجہد کی عکاسی ان الفاظ میں ہوئی ہے:

خستگی و تشنگی و رہزن و ریگ و سراب
کتنی صدیاں ہوگئیں، انسان چلتا جائے ہے

مشعلِ دل بھی تو سینے میں فروزاں چاہیے
راہِ منزل میں چراغِ رہ گزر کافی نہیں
ہونٹوں پہ رہا پیغامِ سحر، مٹی پہ قدم، تاروں پہ نظر
راتوں میں کئی، راتوں میں مگر خوابوں کے اُجالے جوڑ دیے

یہ عقل کی مادہ پرستی، مزاجِ دنیا بدل رہی ہے
یہ روحِ انساں کو رکھ کے اپنے قدم کے نیچے کچل رہی ہے

کبھی شاید یہ محفل بھی ستاروں سے چمک اُٹھے
ابھی تو اشکِ بے کس سے چراغاں ہے جہاں میں ہوں

جہادِ زیست کے تپتے ہوئے بیاباں میں
اُٹھائے سر، شجرِ سایہ دار ہیں کیا کیا

ملا صاحب انسانی زندگی کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ارتقا کی منزلوں میں انسان نے کبھی کبھی تاریکیوں سے شکست کھائی ہے تو اکثر تاریکیوں کو پسپا بھی کیا ہے:

یاس کی آندھیوں میں بھی دل سے کبھی مٹی نہ آس
کم ہوئی لو ہزار بار شمع کبھی بجھی نہیں

تیرگی بڑھ بڑھ کے تاروں کو بجھاتی ہی رہی
تیرگی کو چیر کر تارے نکلتے ہی رہے

جب بھی گھری ہے موجوں میں کشتی حیات کی
ابھرے ہیں موج ہی سے کنارے نئے نئے

کرب میں پھر ہے مادرِ عالم
اک نیا دور لے رہا ہے جنم

کیسے عزم اور حوصلے کے ساتھ ملّا صاحب ابھرتے ہوئے نئے سورج کی نشان دہی کرتے ہیں:

فضا کی تیرگیٔ نیم شب سے کر نہ قیاس
افق کی گود میں ننھا سا آفتاب بھی دیکھ

وہ پیشِ نظر ہے وادیٔ گل، ہمت سے ذرا اک اور قدم
اب کوہ تو تو سر کر ہی چکا، تھوڑی سی ترائی باقی ہے

اس موضوع پر ملّا صاحب کی ایک نظم "میری دنیا" کے کچھ شعر سنیے:

شعلوں میں تیرے تپ کر انساں پگھل گئے ہیں
بازارِ زندگی کے سکّے بدل گئے ہیں

طاقت کی ہے پرستش اب تیرے معبدوں میں
سونے کے دیوتا ہیں، تیرے صنم کدوں میں

دل کانپتا ہے میرا انساں کی طاقتوں سے
لگتا ہے خوف مجھ کو اونچی عمارتوں سے

انساں اتر رہا ہے رہِ درندگی پر
تہذیب آگئی ہے حدِ برہنگی پر

کیا جہدِ زندگی میں طبعِ بشر یہی ہے
سو بار موت بہتر، جینا اگر یہی ہے

ملاّ صاحب کی شاعری کا بڑا حصہ محض جذبے اور احساس کی ترجمانی نہیں بلکہ ایک دردمند دل رکھنے والے دانشور کا فکری اظہار بھی ہے۔ وہ ایسی دنیا اور ایک ایسے سماجی نظام کے متلاشی ہیں، جس میں انسان سکون اور آرام کی زندگی گزار سکے جہاں اس کا جسم اور دماغ کسی طاقت، ظلم، جبر اور استبداد کا شکار نہ ہو اور جہاں اس کے فکر، احساس اور اس کے اظہار کے پیروں میں بیڑیاں نہ ڈالی جائیں۔ ملاّ صاحب نے ایک خطبے میں اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا: تاریخ عالم ہم کو بتاتی ہے کہ روز آفرینش سے لے کر آج تک طفلِ انساں نے ہمیشہ ایک ایسے نظامِ ہستی کے خواب دیکھے ہیں، جس میں وہ اپنے شوق کی زندگی آزادی کے ساتھ بسر کر سکے۔ اس کا اپنا گھر ہو جب کارِ دنیا سے فرصت پائے تو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ کچھ لمحات سکون اور آرام کے ساتھ گزارے۔ اس کے جسم کو کسی جبر کے شکار بننے کا اندیشہ نہ ہو اور اس کے ذہن کو غلام بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اُسے امن اور محبت کی کھلی اور بے خوف فضا میں سانس لے کر اپنے پورے انسانی قد تک پہنچنے کا موقع ملے۔ جہاں افسروں کی نہیں قانون کی حکومت ہو جہاں اسے الزامات کے خلاف اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بے روک ٹوک پورا پورا اختیار دیا جائے اور جہاں آزادی، مساوات اور اخوت کے نعروں میں نہیں بلکہ نغمات کی لے میں مذہب و ملت، رنگ و نسل اور جنس و ذات کے سارے امتیازات، اختلافات اور تفرقے ایک نالۂ بے آواز بن کر فنا ہو جائیں۔

(میری حدیث عمر گریزاں، کچھ نثر میں بھی، ص ص ۱۷، ۱۸)

ملاّ صاحب نے اپنی نظم "گمراہ مسافر" میں انسان کے اسی کرب کو بڑے بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔

دنیا کے اندھیرے زنداں سے انساں نے بہت چاہا نہ ملا
اس غم کی بھول بھلیاں سے باہر کا کوئی رستا نہ ملا

اہلِ طاقت اٹھتے ہی رہے بھاری بھاری تیشے لے کر
دیوار پسِ دیوار ملی دیوار میں دروازا نہ ملا
ایماں کا فسوں گر بھی آیا جادو کا عصا ہاتھوں میں لیے
اک لکڑی تو اندھے کو ملی آنکھوں کو مگر جلوا نہ ملا
ساقیِ سیاست محفل کے جام و مینا بدلا ہی کیا
جس میں اک تہہ تلخی کی نہ ہو کوئی شیریں جرعا نہ ملا
دولت کا مغنی بھی آیا مضرابِ فراموشی لے کر
ہر ساز سے اک نغمہ پھوٹا لیکن دل کا پردا نہ ملا
رقاصۂ عشرت نے آکر پھر دل سے نکالیں کچھ پھانسیں
لیکن اس کی چٹکی کو بھی جو روح میں کانٹا تھا نہ ملا
تقسیمِ مساوی کے حامی پھر لے کے بڑھے میزان اپنا
جو سب کو یکساں تول کے دے میزان میں وہ پلّا نہ ملا
کچھ کیمیاگر پھر ذرّوں کا دل چیر کے لائے آگ نئی
شعلوں کی خدائی ہاتھ آئی شبنم کا مگر قطرا نہ ملا
بے چارگیِ الفت کی مشعل کونے میں پڑی جل جل کے بجھی
لیکن اسے ہاتھوں میں لے کر کوئی بڑھنے والا نہ ملا
اِرپھر کے وہیں پر آتا ہے انساں ہے رہِ باطل پہ ابھی
صدیاں گزریں چلتے چلتے لیکن ہے اسی منزل پہ ابھی

انساں کے دکھ درد کا بھرپور احساس اور انتہائی موثر انداز میں اس کا اظہار ملاّ صاحب کی آواز کو انفرادیت بخشتا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین مرحوم نے ملاّ صاحب کی شاعری کے اس منفرد انداز پر گفتگو کرتے ہوئے بہت صحیح لکھا تھا کہ ''اُن کے صاف، شفاف اور ذکی الحس ذہن اور انسانی دکھ درد کے تصور سے خون ہوجانے والے دل، دونوں نے مل کر ایک مخصوص شاعرانہ انداز سے زندگی کو فن کی گرفت میں لیا ہے۔'' یہ ان کا ایسا انفرادی رنگ ہے جسے اُنھوں نے شاعرانہ، مترنّم اور دل کش زبان میں پیش کیا ہے۔ اس رنگ میں ان کے حریف مشکل ہی سے نکلیں:

ابھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں
ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے، جہاں میں ہوں

طالب امن ہیں سب بزم میں لیکن ہر رند
لے کے اک ہاتھ میں تیغ، ایک میں جام آتا ہے

معبد انساں بنے کیسے یہ ضد ہر دل میں ہے
اس کی پیشانی پہ ہو، میرے ہی بت خانے کا نام

بشر کو مشعلِ ایماں سے آگہی نہ ملی
دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی

دیر و حرم کے معاملے میں ملاّ صاحب کا ذہن بالکل صاف ہے۔ وہ تفریق کرنے والے مذاہب پر "حبّ بشر" کے مذہب کو ترجیح دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

کیوں کسی ایماں سے مانگوں شمعِ راہِ زندگی
کیا بشر کے واسطے حبّ بشر کافی نہیں

ایک اور شعر ملاحظہ ہو، جس میں ملاّ صاحب نے شاعرانہ تعلّی سے کام نہیں لیا بلکہ انسانیت کے پیغام کو عام کرنے کے لیے اپنی جدوجہد کا ذکر کیا ہے۔ وہ شعر ہے:

اب آگے تیری قسمت ہے اے قافلۂ گمراہِ بشر
میں نے تو اندھیری راہوں میں کچھ دیپ جلا کے چھوڑ دیے

اشعار کے مطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان دوستی ملاّ صاحب کے لیے کوئی شاعرانہ موضوع نہیں بلکہ اس کی حیثیت ان کے ہاں ایک ایسے عقیدے کی ہے جس کے معاملے میں ان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ممکن نہیں۔ اردو میں یہ روایت رہی کہ اگر شاعر نظم گو ہے بھی تو اس کی شعر گوئی کا آغاز غزل ہی سے ہوا ہے۔ علامہ اقبالؔ اور جوشؔ کی شاعری میں نظم کا پلّہ بھاری ہے۔ یہ دونوں نظم کے

شاعر ہیں لیکن ان دونوں نے ابتدا میں غزلیں ہی کہی تھیں۔ عام طور سے اردو شاعروں نے غزل ہی سے شاعری کی ابتدا کی ہے، لیکن ملاّ صاحب نے شعرگوئی کی ابتدا نظم سے کی تھی۔ میرے ذہن میں اردو کا اور کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس نے نظم گوئی سے اپنی شاعری کی ابتدا کی ہو۔

اس سے یہ تو پتا چلتا ہے کہ ملاّ صاحب عام ڈگر سے بچ کر خود اپنا راستہ بناتے ہیں، لیکن یہ اس حقیقت کا بھی ثبوت ہے کہ ملاّ صاحب کی شاعری میں فکر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اگر وہ روایتی شاعری کرتے یا صرف جذبے پر زور دیتے یا صرف زبان و اظہار کو اہمیت دیتے تو غزل ہی سے ابتدا کرتے۔ ان کی پہلی نظم ''پرستارِ حسن'' ہے جس میں معنویت بھی ہے اور فکری عنصر بھی اس نظم میں اظہار کی جو پختگی، لہجے کی متانت اور بیان کی جو تازہ کاری ہے وہ بے شمار شاعروں کو مدتوں مشقِ سخن کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی۔

نظم میں ملاّ صاحب کے موضوعات متنوع ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مشاہدہ اور تجربہ بہت وسیع ہے۔ اُنھوں نے زندگی کو ایک ہمدرد انسان کی حیثیت سے بہت قریب سے دیکھا ہے۔

ملاّ صاحب نے شملے کے دیودار..........اور ایک دن انسان جیتے گا، بمبئی، اندھیر نگر میں دیپ جلیں، بڈھا، عصمتِ افلاس، گرونانک، عقل و دل کا تضاد، بیسواں محبانِ وطن کا نعرہ، جوے شیر، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی کا قتل اردو کے نام، قحطِ کلکتہ، لال قلعہ، آخری سلام وغیرہ جیسے موضوعات پر نظمیں کہیں ہیں۔ بہت کم نظم گو شعرا کے یہاں موضوعات کا اتنا تنوع ملتا ہے۔

غالبؔ کا یہ مصرع ''ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم'' ملاّ صاحب کے لیے محض شاعرانہ خیال نہیں بلکہ عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی فکر اور بصیرت کائناتی ہے۔ ان کا ایک فلسفہ اور ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی نظریہ ہے اور وہ ہے انسان دوستی۔ وہ انسانیت کو کُل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اسے مذہبی یا جغرافیائی خانوں میں تقسیم نہیں کرتے۔ اُنھوں نے شاعری میں یہ عقیدہ روایتی مضمون کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ یہ عقیدہ ان کی گفتار اور کردار دونوں سے ہم آہنگ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے
ترے ہاتھوں بہت توہینِ آدم ہوتی جاتی ہے

ہر دیر و حرم سے کترا کر ملّاؔ آیا ہے خانے میں
ملّا کے سے لیکن دنیا میں سلجھے ہوئے انسان کتنے ہیں

بشر کے ذوقِ پرستش نے خود کیے تخلیق
خدا و کعبہ کہیں اور کہیں صنم خانے

ملاؔ صاحب کو اردو سے غیر معمولی محبت تھی۔ اگر کوئی شخص اردو کے خلاف کچھ کہتا تو ملا صاحب خلافِ عادت اُس سے سخت ناراض ہو جاتے۔

انجمن ترقی اردو کی ایک کانفرنس ہو رہی تھی، جس کی صدارت ملا صاحب کے ذمّے تھی۔ ملا صاحب نے صدارتی خطبے میں فرمایا کہ ''آج کل اردو پر بہت برا وقت آیا ہوا ہے۔ کچھ لوگ اردو کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں اردو کا مجاہد ہوں اور اردو کی بقا کے لیے جو کچھ بھی ممکن ہے میں کروں گا۔ میں آخر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو میری مادری زبان ہے۔ میں اپنا مذہب بدل سکتا ہوں مادری زبان نہیں۔''

اردو پر ملاؔ صاحب کے یہ دو شعر ملاحظہ ہو۔ دیکھیے اس کے ایک ایک لفظ میں کیسا درد بھرا ہوا ہے۔ ملا صاحب کہتے ہیں:

اک موت کا جشن بھی منا لیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مسکرا لیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اردو
اک آخری گیت اور گا لیں تو چلیں

ایک رباعی اور ملاحظہ ہو۔ دیکھیے ان اشعار کا عنوان کیسا معنی خیز ہے۔ عنوان ہے ''آئندہ تاریخ کا ایک صفحہ''

یہ سانحہ سالِ چہل و نو میں ہوا
ہندی کی چھری تھی اور اردو کا گلا

اردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے
ملا نامی سنا ہے شاعر بھی تھا

اردو سے ملاؔ صاحب کی محبت کا بس ایک واقعہ اور بیان کروں گا۔

ملا صاحب انجمن ترقی اردو کے صدر تھے۔اس حیثیت سے وہ گجرال کمیٹی کے سامنے انجمن کا ایک میمورنڈم لے کر گئے۔ میں اُس وقت گجرال کمیٹی کا رکن تھا۔ملاؔ صاحب ہمیشہ بہت ہی نرم اور دھیمی آواز میں بات کرتے تھے لیکن اُس دن اپنے میمورنڈم کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ملاؔ صاحب غصّے میں لال ہوگئے اور اُنھوں نے گجرال صاحب سے کہا کہ ''اگر آپ جیسے اردو دوست ہوتے ہوئے بھی اردو کے ساتھ یہ ظلم ہو رہا ہے تو پھر ہم اپنی فریاد لے کر کہاں جائیں؟'' اُس دن اردو کی بقا اور اُس کے مستقبل کے بارے میں بہت تفصیل سے گفتگو ہوئی۔ ملا صاحب کا کہنا تھا کہ ''اردو ہندوستان کی زبان ہے اور اُسے اسی طرح زندہ رہنے کا حق ہے جیسے ہندی یا ہندوستان کی کسی اور زبان کو ہے۔''

جب انجمن میں، میں جنرل سکریٹری کی حیثیت سے آیا تو ملا صاحب اس کے صدر تھے ۔ مجھے ملاؔ صاحب کے ساتھ میمورنڈم لے کر بہت سے وزیروں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ملاؔ صاحب کے لہجے میں بہت ہی نرمی اور دھیما پن ہوتا تھا لیکن آہستہ آہستہ اُن کا اردو دوست شاعر باہر نکل آتا تھا اور وہ غصّے میں منسٹروں سے بات کرتے اور دلیلیں پیش کرتے کہ ''اردو کو ختم کیا جا رہا ہے اور حکومت خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔''

ملاؔ صاحب کا سب سے بڑا تعلق ہندوستان کے سب سے بڑے ادارے انجمن ترقی اردو (ہند) سے رہا۔ وہ 1969 میں پانچ سال کے لیے انجمن کے صدر منتخب ہوئے 1974 میں اُنھیں پھر صدر منتخب کیا گیا۔ یہ مدت ختم ہونے کے بعد بھی انجمن کے تمام اراکین چاہتے تھے کہ ملاؔ صاحب صدر کی

حیثیت سے انجمن سے اگلے پانچ سال کے لیے وابستہ رہیں لیکن ایک ممتاز ترین وکیل کی حیثیت سے ملا صاحب کی معروفیات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ وہ یہ عہدہ قبول کرنے سے قاصر رہے۔

1963 میں ملاؔ صاحب ساہتیہ اکیڈمی کی مشاورتی کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1968 میں وہ دوبارہ اُسی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ 1983 میں ملاؔ صاحب ترقی اردو بورڈ کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ 1989 میں وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مجلس عاملہ کے رُکن منتخب ہوئے۔

ملاؔ صاحب پر انجمن نے ایک سمینار منعقد کیا تھا۔ اس میں ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، رفعت سروش، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، احمد سعید، خلیق انجم، ایم۔ حبیب خاں اور شمیم جہاں نے مضامین پڑھے تھے۔

1995 میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے ملاؔ صاحب کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب شائع کی، جس کا پیش لفظ پروفیسر نذیر احمد نے لکھا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر مسعود حسین، پروفیسر سید امیر حسین عابدی، عمر انصاری، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر ولی الحق انصاری، ڈاکٹر آصفہ زمانی، ایم۔ حبیب خاں کے اس کتاب میں مضامین شامل تھے۔

بہت سی تنظیموں نے ملاؔ صاحب کی ادبی اور لسانی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُنھیں انعامات سے نوازا تھا۔ 1959 میں اتر پردیش گورنمنٹ نے ملا صاحب کی خدمت میں غالب ایوارڈ پیش کیا۔ یہ ایوارڈ ملاؔ صاحب اور فراقؔ گورکھپوری کو مشترکہ طور پر دیا گیا تھا۔

1964 میں ملاؔ صاحب کی کتاب 'میری حدیثِ عمر گریزاں' شائع ہوئی جس کی رسم اجرا اس عہد کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی جی نے کی۔ 1980 میں ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے ملاؔ صاحب کی خدمت میں ذوق اکیڈمی انعام پیش کیا۔ 1986 میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے ملاؔ صاحب کی خدمات

پر انعام پیش کیا۔

1989 میں ملا صاحب کو فخرالدین علی احمد ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ملا صاحب کا سیاست سے ہمیشہ گہرا تعلق رہا لیکن یہ تعلق محض ذہنی رشتے کا تھا عملی نہیں۔ ملا صاحب جب سولہ برس کے تھے تو لکھنؤ میں کانگریس کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ ملا صاحب کے والد اس جلسے میں ریسپشن کمیٹی کے چیئر مین تھے۔ ملا صاحب اس جلسے میں شریک ہوئے لیکن عملی طور پر جلسے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

لوگ ملا صاحب کو بہت پسند کرتے تھے اور ملا صاحب پر اُنھیں بہت زیادہ بھروسہ تھا۔ بقول ملا صاحب اس وقت میری انسانی قدروں کی وجہ سے لوگوں کو مجھ پر بہت اعتماد تھا۔ کیوں کہ میں نے انسانی قدروں پر عمل کیا ہے۔ نیز میں پیشے میں، ادب میں، قانون میں، اردو تحریک میں صرف زبانی ہی نہیں گفتگو کی ہے، عملی طور پر بھی کچھ کر کے دکھایا ہے۔"

1967 سے 1970 کے دوران پارلیمنٹ کے رکن رہے۔ 1972 میں کانگریس نے انھیں راجیہ سبھا کے ممبر کی حیثیت سے نامزد کیا اور 1978 تک وہ راجیہ سبھا کے رکن رہے۔

ملا صاحب نے انجمن ترقی اردو کے صدر کی حیثیت سے بہت سے وزیروں،

صوبائی حکومتوں اور مرکزی حکومتوں کو میمورنڈم پیش کر کے اردو کے موجودہ مسائل کی طرف ذمے داروں کی توجہ مبذول کرائی تھی۔

مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) نے گجرال کمیٹی کو ایک بہت بڑا میمورنڈم پیش کیا تھا۔ اس میمورنڈم کا ایک ایک لفظ ملا صاحب کا لکھا ہوا تھا، جس پر بعد میں انجمن کی مجلسِ عاملہ نے نظر ڈالی تھی۔ یہ میمورنڈم گجرال کمیٹی کی رپورٹ میں شامل ہے۔

ملا صاحب نے بطور ایک جج، ایک ایڈوکیٹ، ایک شاعر اور دانش ور انسان کے بڑی باوقار زندگی گزاری۔ سپریم کورٹ کے وکیل کی حیثیت سے وہ ایک مانے ہوئے ایڈوکیٹ تھے اور پھر ایسی ہی ان

کی فیس بھی تھی۔ اُنھوں نے اپنی اَکلِ حلال سے ایک نہایت ہی باوقار اور ٹھاٹھ دار زندگی گزاری۔ انجمن کے صدر کی حیثیت سے وہ جب بھی کبھی کسی میٹنگ، کسی جلسے یا کسی اور کام سے دفتر تشریف لاتے تھے تو صرف اپنے خرچ پر۔ اُنھوں نے کبھی بھی انجمن سے آمدورفت کی مد میں ایک پیسہ بھی لینا گوارا نہیں کیا۔ اپنے علمی اور شاعرانہ مرتبے کے اعتبار سے وہ انجمن کا وقار تھے۔ ان کی باتیں بہت دن تک یاد رہیں گی۔

ملا صاحب نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ دہلی ہائی کورٹ میں وکالت کرتے رہے۔ 13 رجون 1997ء کو 23۔ بلونت رائے مہتہ روڈ (فیروز شاہ روڈ) کی اس کوٹھی میں ان کا انتقال ہوا جو پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے اُنھیں گورنمنٹ سے ملی ہوئی تھی۔

خلیق انجم

☆☆☆

فہرست

-1	پیش لفظ	iii
-2	حرفِ آغاز	v
-3	جوئے شیر	1
-4	دیباچہ -- آل احمد سرور	7
-5	بہ قلم خود --- آنند نارائن ملا	23
-6	1926	27
-7	پرستارِ حسن	29
-8	گنگا کے چراغ	31
-9	شمع	33
-10	1927 تا 1935	35
-11	غزلیات	37
-12	صیاد کے ستم سے اتنا تو فرق ہاں ہے	37
-13	بچ کے جائے گا کہاں تو دیدۂ بیباک سے	37
-14	خیالِ جام رہا عادتِ شراب کے ساتھ	38
-15	ذوقِ ستم کشی سے وہ لاچار ہو گئے	39
-16	دل میں ارماں کی وہی جلوہ گری باقی ہے	39
-17	دور ہی سے دل ہی دل میں ہم تمھیں چاہا کیے	40
-18	تری ہستی سے منکر ہوتے جاتے ہیں جہاں والے	40
-19	میں فقط انسان ہوں ہندو مسلماں کچھ نہیں	41

-20	پیریِ انساں کا منظر سخت درد انگیز ہے	42
-21	فرق جو کچھ ہے وہ مطرب میں ہے اور ساز میں ہے	42
-22	نظر ہوگی تو ہم تیشہ میں جوئے شیر دیکھیں گے	43
-23	کسی کی یاد آ آ کر مجھے تڑپا ہی جاتی ہے	43
-24	امید و شوق کا مسکن تمناؤں کی منزل تھا	44
-25	رمزِ الفت مثل میرے کوئی سمجھا ہی نہیں	45
-26	یاد ہمدم نہ دلا عشق کے افسانوں کی	45
-27	پھر ہوسِ نظارہ کر بزمِ جمال یار میں	46
-28	غمخواریِ سائل بھی تو انگر کو سکھا دے	46
-29	کبھی تو اے شاہدِ نہانی پردہ رنگ و بو اُٹھا دے	47
-30	مجھ کو غمِ انساں کی حقیقت نظر آئی	48
-31	دل ہے دیوانہ تو ناصح اس کو سمجھانے سے کیا	49
-32	پہلے دھوکے سے دیے کچھ مری بینائی نے	49
-33	میں ہوں دلِ پُر شوق ہے اور کوئی حسیں ہے	50
-34	پیہم رہ طلب میں مشکل کا سامنا ہے	51
-35	رنگینِ شیب، غرورِ شباب دیکھ لیا	51
-36	کوئی نامہرباں اب مہرباں ہے	52
-37	یا یہی کہہ دے کہ راحت تری قسمت میں نہیں	53
-38	اور کوئی امتحانِ عشق کی صورت نہ تھی	53
-39	آثارِ دورِ حاضر اتنا بتا رہے ہیں	54
-40	اضطرابِ روح	55
-41	انسان	57
-42	ترانۂ گنہگار	59
-43	شاعر	61
-44	جامِ حیات	65

-45	تم مجھے بھول جاؤ گے	69
-46	دوشیزہ کا راز	71
-47	اقبال سے شکوہ	74
-48	محبانِ وطن کا نعرہ	76
-49	بیسوا	78
-50	انقلاب زندہ باد	82
-51	بہار کی رات	84
-52	مہاتما گاندھی کا خیر مقدم	87
-53	موتی لال نہرو	91
-54	1936	95
-55	غزلیات	97
-56	تو خفا اور بہار کے دن ہیں	97
-57	جل بجھی جب شمع دل پیغامِ شام آیا تو کیا	98
-58	یہی اک حبِ قومی کا اصولِ مختصر جانا	99
-59	ہر شورشِ حیات سے بدظن بنا دیا	99
-60	فرقت میں دل کو ہم یونہی بہلائے جاتے ہیں	100
-61	عمر کے ذریاکے دریا بہہ گئے	101
-62	ظالم مری حیات کا دور شباب ہے	102
-63	کون سی تصویرِ ماضی سامنے آئی نہیں	102
-64	چلتی ہے بادِ حسرت یوں دل کی سرزمیں پر	103
-65	دل ہے اک دولت مگر درد آشنا ہونے کے بعد	103
-66	جواہر لال نہرو	105
-67	فطرتِ آزادی	107
-68	1937	109
-69	غزلیات	111

-70	وہ غمِ جاں فزا دیا تو نے	111
-71	ہم نے بھی کی تھیں کوششیں ہم نہ تمھیں بھلا سکے	112
-72	چھپ کے دنیا سے سوادِ دلِ خاموش میں آ	113
-73	مٹا بھی میں تو رہے گا غمِ وطن باقی	114
-74	یوں ہی اُٹھ جانے کا میں اے ساقیِ محفل نہیں	115
-75	بس شرط ہے اتنی کہ ہم آواز کوئی ہو	116
-76	جتنا کہ نگاہوں سے عیاں رازِ جگر ہے	116
-77	دل بجھا شمع کائنات گئی	117
-78	بے رنج کے خوشی کا بھی ساماں نہ ہو سکا	118
-79	قہر کی کیوں نگاہ ہے پیارے	118
-80	پیری کا ترنم بھی اک مرثیہ خوانی ہے	120
-81	جفا صیاد کی اہلِ وفا نے رائگاں کر دی	121
-82	کب تک کسی سے مانگ کے ہم اختیار لیں	122
-83	بھولے سے بھی لب پر سخن اپنا نہیں آتا	122
-84	گنگا کی لہر ہے یہ مری چشم نم نہیں	123
-85	شبِ ہجراں	124
-86	ہم لوگ	126
-87	لوری	128
-88	مسلم لیگ (1937)	130
-89	1938	133
-90	غزلیات	135
-91	آ غم کہ اب تجھی پہ ہے دار و مدارِ دل	135
-92	سرِ محشر یہی پوچھوں گا خدا سے پہلے	136
-93	کام عشق بے سوال آ ہی گیا	137
-94	یہ عشق کل تجھے حسنِ جواں ملے نہ ملے	138

-95	مری بات کا جو یقیں نہیں مجھے آزما کے بھی دیکھ لے	139
-96	تری نگاہ مرے حسن رائگاں پہ نہیں	140
-97	میرے جگر کی تاب دیکھ، رُخ کی شگفتگی نہ دیکھ	140
-98	جوشِ غم بھی دل کے کام آجائے ہے	141
-99	زندگی گو کشتۂ آلام ہے	142
-100	سنہرے خرمنوں کا رنگِ پنہاں دیکھ لیتا ہوں	143
-101	اسے عقل والے نہیں جانتے ہیں	143
-102	دل کا چراغ جب تلک تجھ سے جلے جلائے جا	144
-103	دو حقیقتیں	146
-104	1939	149
-105	غزلیات	151
-106	غیر کے درد پہ بھی اشک بداماں ہونا	151
-107	آئینۂ رنگینِ جگر کچھ بھی نہیں کیا	152
-108	مری باتوں پہ دنیا کی ہنسی کم ہوتی جاتی ہے	153
-109	گزری حیات وہ نہ ہوئے مہرباں کبھی	154
-110	خود اپنے دل کی روش پر نہ کیوں ہراس آئے	155
-111	جب دل میں ذرا بھی آس نہ ہو اظہارِ تمنا کون کرے	156
-112	نہیں میں پیار کے قابل تو مجھ کو پیار نہ کر	157
-113	ہر اک دل نہیں بہرہ یابِ محبت	158
-114	یہی ہیں ترا نام کر جانے والے	159
-115	اسی کو جس نے نہ کی بھول کر بھی بات کبھی	159
-116	جھجک اظہارِ ارماں کی بآسانی نہیں جاتی	160
-117	افقِ دہر پہ اک مہرِ درخشاں نکلا	161
-118	نوروز	163
-119	جہاں میں ہوں	166

120-	میری دنیا	168
121-	زمین وطن	171
122-	1940	177
123-	غزلیات	179
124-	ہجر کی شب گھڑی گھڑی دل سے یہی سوال ہے	179
125-	دیکھا کچھ آج یوں کسی غفلت شعار نے	180
126-	تجھی کو آنکھ اُٹھانے کی ارے مُلا نہ تاب آئی	180
127-	امیدوں ہی پہ کاٹی ہے ابھی تک زندگی اپنی	182
128-	دنیا خوشی میں غم کو بھلاتی چلی گئی	183
129-	رُخ اپنا آئینہ مجھ کو بنا کے دیکھ لیا	184
130-	تم	185
131-	مسز حامد علی	187
132-	توہین دوستی	190
133-	آثار وقت	191
134-	دو پھول	195
135-	انتظار	197
136-	بلی اور چوہا	198
137-	1941	199
138-	غزلیات	201
139-	یہ ربط عشق خود اک حد فاصل ہوتا جاتا ہے	201
140-	ارماں کو چھپانے سے مصیبت میں ہے جاں اور	202
141-	خندہ بے اختیار چھوٹے ہے	203
142-	ہوا ناساز گار گلستاں معلوم ہوتی ہے	203
143-	ارمانوں پہ ہے غم کی گھٹا چھائی ہوئی سی	205
144-	اس کے کرم پہ شک تجھے زاہد ضرور ہے	205

-145	سماج کا شکار	207
-146	اندھی لڑائی	210
-147	نذرِ ٹیگور	214
-148	قطعِ محبت	217
-149	ایک البم میں	220
-150	1942	221
-151	غزلیات	223
-152	شمع وگل وسرود وے بزم یوں تو کیا نہیں	223
-153	آتا ہے تو آ دن جاتے ہیں پھر عشق کا یہ پیغام کہاں	224
-154	محبت سے بھی کارِ زندگی آساں نہیں ہوتا	225
-155	صبح کا ہنگام ہے ہنگام کی باتیں کریں	226
-156	ترکِ محفل	228
-157	امن کے سپاہی	230
-158	1943	233
-159	غزلیات	235
-160	ساتھ ہو کوئی تو کچھ تسکین سی پاتا ہوں میں	235
-161	نہ عقل کے کو ہِ نور پر ہے نہ دیں کی وادیِ راز میں ہے	236
-162	اجنبیت سی نگاہِ دوست میں پاتے ہوئے	238
-163	برکھا رُت ہے ابر ہے پیارے	239
-164	دنیا کے وہی قصّے ہیں مگر عنوان بدلتے جاتے ہیں	240
-165	ٹھنڈی کافی	242
-166	قحطِ کلکتہ	255
-167	1944	259
-168	غزلیات	261
-169	صفِ حیات سے جب کوئی تشنہ کام آیا	261

-170	دل کو خلشِ شوق سے بیگانہ بنا دے	262
-171	رازِ ہستی تشنۂ تعبیر ہے تیرے بغیر	263
-172	صبح ہے بے نور، سونی شام ہے تیرے بغیر	264
-173	زندگی سلسلۂ کرب و بلا ہے تو سہی	264
-174	کچھ بھی جفائے دوست ہو سامنے جا کے بھول جا	266
-175	جہاں کو ابھی تابِ الفت نہیں ہے	267
-176	ہاں جفا پر بھی تری دل مرا بے آس نہیں	267
-177	رخصت اے دوست	269
-178	دو یاتری	271
-179	میں	273
-180	روٹھنا	275
-181	اعترافِ محبت	275
-182	گل کردو قمر کو	276
-183	1945	279
-184	غزلیات	281
-185	آرزو کو دل ہی دل میں گھٹ کے رہنا آگیا	281
-186	حیات اک سازِ بے صدا تھی سرودِ عمرِ رواں سے پہلے	282
-187	گمراہ مسافر	284
-188	یومِ انتقام	285
-189	1946	287
-190	غزلیات	289
-191	جب کبھی امن کی انساں نے قسم کھائی ہے	289
-192	خبر آئی ہے چمن میں نہیں دور وہ زمانا	290
-193	زیست ہے اک معصیت سوزِ دلی تیرے بغیر	291
-194	ہر جلوہ پر نگاہ کیے جا رہا ہوں میں	292

-195	دل میں ناکامی کی جب تک خستگی ہوتی نہیں	293
-196	وہ کرم ہو یا ہو ستم ترا جو ہو مجھ پہ یوں تو برا نہ ہو	294
-197	لال قلعہ	295
-198	نذر بجنور	298
-199	آخری سلام	300
-200	شیوۂ حسن	303
-201	1947	305
-202	غزلیات	307
-203	کچھ اس ادا سے آج وہ جلوہ دکھا گئے	307
-204	بھٹکے ہوئے انساں کو پھر سے آگاہ رہِ منزل کر دے	308
-205	کسی کی زندگی کا رنج ہی حاصل نہ بن جائے	309
-206	شکستِ غم کو دل کامیاب کیا جانے	310
-207	اب اپنے دیدہ و دل کا بھی اعتبار نہیں	311
-208	بشر کو مشعلِ ایماں سے آگہی نہ ملی	312
-209	آ ہی گیا	314
-210	صبح آزادی	315
-211	سجدۂ عقیدت	317
-212	انسانی درندے	319
-213	مشاعرہ	320
-214	1948	325
-215	غزلیات	327
-216	ترا لطف آتشِ شوق کو حدِ زندگی سے بڑھا نہ دے	327
-217	زہرِ غم ہنس ہنس کے پینا آگیا	328
-218	مرے دل میں ہے تو وہ روشنی کہ جو ظلمتوں کو سنوار دے	329
-219	دوسرا رُخ	330

-220	مہاتما گاندھی کا قتل	331
-221	میری شاعری	335
-222	1949	337
-223	غزلیات	339
-224	نگاہ و دل کا افسانہ قریب اختتام آیا	339
-225	غموں کا بھی آتا ہے اکثر زمانا	340
-226	فقط اپنی صدا ہی کو نہ آوازِ جہاں سمجھو	341
-227	جو سطحِ خاک سے اونچی نگاہ کر نہ سکے	343
-228	اب بے نیاز ہیں ترے جور و جفا سے ہم	344
-229	سروجنی نائیڈو	345
-230	ارتقا	348
-231	جادۂ امن	350
-232	رباعیات	355
-233	سوزِ ناتمام	364
-234	کچھ ذرّے کچھ تارے	371
-235	غزل محل میں تیری پینے والوں کی کمی کب تھی	375
-236	غزلیات	377
-237	فائدہ کچھ گلۂ جور سے ہوتا بھی نہیں	379
-238	یہ جفائیں تو حقیقت میں عطائیں ہو گئیں	381
-239	انساں کے لیے اس دنیا میں دشنام سے بچنا مشکل ہے	382
-240	دلوں کا دل نہ بننے دے گا آزارِ جہاں کب تک	383
-241	دردِ آہنگِ جاں نہ ہو جائے	385
-242	خود اپنی چشمِ تر ہی کو بنا لیتے ہیں جام اکثر	387

-243	نگاہوں سے کسی کی پھر مری ملا پکار آئی	389
-244	ستم اکثر بہ عنوانِ کرم ایجاد ہوتا ہے	391
-245	مدّت سے لب پہ کوئی سرود و فغاں نہیں	393
-246	جفائے دوست پر آزردگی آزردگی کب تھی	394
-247	غرورِ فتح میں جتنی جفائیں ہوتی جاتی ہیں	395
-248	اعلانِ زندگی ہے بغاوت کبھی کبھی	396
-249	ہر لب پر شعلہ نوائی ہے لیکن دل سوزاں کتنے ہیں	398
-250	خموشی ساز ہوتی جا رہی ہے	400
-251	ملے گی سب کو مے، سنتے ہیں محفل میں خبر آئی	402
-252	روشنی صبح کی ڈوبے ہوئے تاروں میں نہیں	404
-253	فلک کے نہ ان ماہ پاروں کو دیکھو	406
-254	کیوں زیست کا ہر ایک فسانہ بدل گیا	408
-255	نرمی دلوں سے لب سے حلاوت بھی چھین لی	409
-256	نگاہیں پھیر لینے کا اگر دل کو شعار آئے	411
-257	دل کو شاید اب محبت کا سلیقہ آ گیا	413
-258	دل! حرفِ ستائش ہے یہ دشنام نہیں ہے	415
-259	رفتہ رفتہ ایک آہنگِ فغاں بنتا گیا	417
-260	کیوں نہ ہو ذکر محبت کا مرے نام کے ساتھ	419
-261	دل کی دل کو خبر نہیں ملتی	421
-262	وہ چارہ ستمِ روزگار کر نہ سکے	423
-263	نظمیات	425
-264	اشارے	427
-265	بھول	428
-266	سردار پٹیل	430
-267	قطعہ	432

-268	عجزِ اظہار	432
-269	شرنارتھی	433
-270	سوغات	434
-271	مجبوری	436
-272	دوبارہ پائمالی	438
-273	گھنا برگد	440
-274	ضبط	441
-275	مریم ثانی	442
-276	دوستانہ مشورہ	456
-277	خاتمہ	456
-278	شکایت	457
-279	ایک دوست کے نام	458
-280	قانون کی تعریف	458
-281	شہیدِ دارا	459
-282	آہٹ	460
-283	نقادوں سے	461
-284	تازہ غزلیں	463
-285	ساحل نہ صدا دے مجھ کو کہ میں آسودۂ طوفاں ہو بھی چکا	465
-286	لیے خوشبو ہر میخانہ آیا	467
-287	یہ دل آویزیِ حیات نہ ہو	469
-288	جنوں کا دور ہے کس کس کو جائیں سمجھانے	471
-289	ترکِ ہر رسم کرو وجہ یہ کافی تو نہ تھی	472
-290	پھر ان گردوں نشینوں کو زمیں کی بات کہنے دے	474
-291	جانِ افسانہ یہی کچھ بھی ہو افسانے کا نام	476

-292	میری حدیثِ عمرِ گریزاں	479
-293	کچھ اپنے پڑھنے والوں سے!-- آنند نرائن ملاّ	483
-294	قطعہ	503
-295	غزلیات	504
-296	جن پاک نفس انسانوں میں کردار کی عظمت ہوتی ہے	504
-297	دنیا ہے یہ، کسی کا نہ اس میں قصور تھا	506
-298	یوں بھی ہو، اے کارسازِ بزمِ ہستی ایک دن	507
-299	وہ گفتگو میں بہ ظاہر تو سرگراں سے نہ تھے	508
-300	ابرِ بہار ہے مگر میرے چمن سے دور دور	509
-301	چھائی سی دلوں کی دنیا پر اس صبحِ خرد میں شام بھی ہے	510
-302	نہ تیرے لیے ہے نہ میرے لیے ہے	512
-303	وہ نبض کی رفتار کہ چھٹتے ہیں پسینے	513
-304	چپ ہوں، لیکن ہے خموشی بھی کلام آلودہ	515
-305	سیاہی کی ایک بوند	517
-306	اعتراف -- علی جواد زیدی	521
-307	غزلیات	531
-308	گل کام نہ دے گی تری ناکردہ گناہی	531
-309	آثارِ زیست پھر سے نمایاں ہوئے تو ہیں	533
-310	تاشقند	535
-311	جو شبِ سیاہ سے ڈر گئے کسی شام ہی میں بھٹک گئے	536
-312	مقامات	538
-313	پستی حوصلۂ عام سے آگے نہ بڑھی	540
-314	کنوکیشن	542

-315	مجاہد	548
-316	شیطان کے غم	549
-317	دل نغمہ ہائے شوق کسی کو سنائے تو	550
-318	جاتا ہے فردوسِ بشر تک	551
-319	سج بولتی ہے رات ابھی اپنے نام کی	554
-320	گلشن ہے اسی کا نام اگر حیراں ہوں بیاباں کیا ہوگا	556
-321	نقاد	558
-322	وہ دورِ گل رہا نہ رہی وہ ہوائے گل	561
-323	شملہ کے دیودار	563
-324	بجھاؤ مہر کو تاروں کی پھر برات چلے	566
-325	بزمِ دوں	568
-326	اپنے نہ رہو ہر بات میں تم غیروں کے سہارے ہو جاؤ	569
-327	وہی اک سوزِ جگر جانِ ہر افسانہ بنا	570
-328	کسی دانا کو کہا بزم نے دیوانہ سنا	571
-329	ہپّی	572
-330	گرونانک	575
-331	فطرت	575
-332	سینوں کے کھنڈر آنکھوں کے ویرانے ملیں گے	576
-333	اِتمامِ حُجت	578
-334	دم کیوں نہ لگے چرخ نشینوں کا نکلنے	581
-335	منفرد اشعار	583
-336	سنسکرت ادب سے ماخوذ نظمیں	587
-337	پاپی بدرا	589
-338	ناممکن	590
-339	چار پائے	590

340-	ساہوکار کی دعوت	591
341-	بیلوں کی جوڑی	592
342-	اتراشحنہ	593
343-	حسین مالن	593
344-	عیارہ	594
345-	دوشیزہ	595
346-	پتی ورتا	596
347-	تمھیں بتلاؤ کیا کہہ کر پدا تم کو کروں ساجن	597
348-	بادل اور بجلی	599
349-	عورت ''پستک'' اور ادھار	600
350-	عافیتِ نادانی	601
351-	چور	602
352-	شکست عشق	603
353-	ٹکڑوں کوں	604
354-	انتہائی تفحیک	606
355-	داستانِ شب	609
356-	بوڑھا مانجھی	611
357-	جل اٹھتی ہے زباں، رہبر نہ فرزانہ ہی کہتا ہے	616
358-	کربِ آگہی	619
359-	اک الگ ہٹ کے نشانِ کفِ پا --- گوپی چند نارنگ	621
360-	غزل سے	637
361-	کون دل ہے نہیں جو شعلہ بہ جاں	638
362-	غم کے بادل پھر بھی چھائے رہ گئے	640

-363	چھپے بوروں کے دانے بھی اگر خرمن میں آجائیں	642
-364	بہکی بہکی چال کو شائستگی گام دو	643
-365	فتنہ پھر آج اُٹھانے کو ہے سر، لگتا ہے	645
-366	ظلمتِ غم نہ گئی خواب بہت چمکائے	646
-367	غمِ انساں سے جو دل شعلہ بہ جاں ہوتا ہے	648
-368	کبھی تو ختم پر صحرا کی شامِ انتظام آئے	649
-369	چیز دل ہے، رخِ گلفام میں کیا رکھا ہے	651
-370	نظر خموش ہوئی عرضِ ناتمام کے بعد	652
-371	سب خضر مگر رستہ دو گام نہیں ملتا	654
-372	رفتہ رفتہ ایک آہنگِ فغاں بنتا گیا	655
-373	اس نظر پہ پلکوں کے چھار ہے ہیں یوں سائے	656
-374	زیست بدلا ہی کی محاذ نبرد	657
-375	پتھر بھی پگھلتا ہے اپنا تو یہ ایماں ہے	658
-376	ستم اکثر بہ عنوانِ کرم ایجاد ہوتا ہے	659
-377	مل پائے ہیں اب تک نہ یہ فرزانے ملیں گے	660
-378	صبح نو آگئی تیرگی مٹ گئی شور ہے ہر طرف انقلاب آگیا	661
-379	سینہ کی حرارت سے خالی گرمیِ چراغِ شام نہ لے	662
-380	بات بھی کہہ کے کھوؤں کیوں جب کوئی آسرا نہیں	663
-381	جب کبھی امن کی انساں نے قسم کھائی ہے	664
-382	نہیں میں پیار کے قابل تو مجھ کو پیار نہ کر	665
-383	رُت جوانی کی نگاہوں میں پیام آنے کا نام	666
-384	خسرو خاک یہ لگتا ہے وہ دن دور نہیں	667
-385	ہموار کیا یوں، گلشن بھی ویرانے بنا کر چھوڑ دیے	669
-386	شب کی تاریکی تو ہاں کم ہے مگر کافی نہیں	670
-387	دشتِ ظلمت میں ہے، وہیں پہ ابھی	671

-388	خورشید کہن سے چھوٹ چکا بدلی سے رہائی باقی ہے	672
-389	صدائے دل ہی کو آوازۂ جہاں نہ کہو	673
-390	علم و جاہ زور و زر کچھ بھی نہ دیکھا جائے ہے	674
-391	شب دنیا کا نیا جب بھی نظام آیا ہے	675
-392	کرب میں پھر ہے مادر عالم	676
-393	رہروی ہے نہ رہ نمائی ہے	677
-394	فقط اپنی صدا ہی کو نہ آواز جہاں سمجھو	679
-395	نگاہ و دل کا افسانہ قریب اختتام آیا	680
-396	آثار زیست پھر سے نمایاں ہوئے تو ہیں	681
-397	گل کام نہ دے گی تری نا کردہ گناہی	682
-398	جینے کی یہی رُت ہے شاید، ہر سانس میں ایک پیغام بھی ہے	683
-399	ابرِ بہار ہے مگر میری چمن سے دور دور	684
-400	جن پاک نفس انسانوں میں کردار کی عظمت ہوتی ہے	685
-401	تنظیم چمن کے عزم وہ سب، وہ قول وہ پیاں بھول گئے	686
-402	پردے کو جو لَو دے وہ جھلک اور ہی کچھ ہے	688
-403	وہ دورِ گل رہا نہ رہی وہ ہوائے گل	689
-404	سمجھے تھے آشیانہ ہے زنداں میں آ گئے	690
-405	گلشن ہے اسی کا نام اگر، حیراں ہوں بیاباں کیا ہوگا	691
-406	زیست تاروں کی رہ گزر بھی نہیں	692
-407	جن کی نظروں میں مے کے پیالے ہیں	693
-408	ہر انقلاب کی سرخی انھیں کے افسانے	694
-409	وہ نبض کی رفتار کہ چھٹتے ہیں پسینے	695
-410	طوفانِ دل ہے اب آرمیدہ	696

411-	جادۂ ملّا	697
412-	پیش لفظ -- خلیق انجم	701
413-	غزلیات	717
414-	اور اک دن انساں جیتے گا	717
415-	لہو کا ٹیکا	721
416-	شعر کا جنم	725
417-	ایوانِ عدالت سے رخصت ہوتے ہوئے	728
418-	نظر ہشیار	729
419-	چڑیوں کا گیت	730
420-	علمِ ناداں	733
421-	شاعر کے ترانے	734
422-	عصمتِ افلاس	735
423-	دنیا ہے یہ کتنی بڑی چھوٹا ہے کتنا یہ جہاں	737
424-	منزل	738
425-	بڈھا	739
426-	معاہدۂ شملہ	741
427-	بوئے گم شدہ	742
428-	سحر و شب	744
429-	سپنے	747
430-	جیون کا کیسا تری کون	750
431-	انساں کو ملاؤ انساں سے	752
432-	شہیدِ امن	755
433-	اندھیر نگر میں دیپ جلیں	758
434-	رشوت	765

-435	نقابیں	766
-436	**قطعات**	767
-437	دردِ زیست	767
-438	نور و ظلمت	767
-439	کانٹوں کی بہار	768
-440	اضطرابِ دنیا	768
-441	انتقام	768
-442	حسن کی پوشاک	769
-443	جبرِ پشیماں	769
-444	انفرادیت	769
-445	بڑھاپا	770

OO

جوئے شیر

(1949)

جوئے شیر

گرتوں کو تھامے جو وہ کفِ دستگیر لا
تقدیرِ شب میں صبح کی روشن لکیر لا
مرہم نہیں نظر میں تو نشترزنی نہ کر
یا تیشہ لے نہ ہاتھ میں یا "جوئے شیر" لا

شعر

کھینچتی ہے زندگی احساس شاعر پر نقوش
پھوٹتی ہیں جن سے کرنیں ذہن و دل میں پے بہ پے
نطق اُڑا لیتا ہے ان کرنوں کا اک دُھندلا سا عکس
اور انھیں پرچھائیوں کا نام مُلّا شعر ہے

انتساب

مٹتی ہوئی اردو کے نام

اِک موت کا جشن بھی منالیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مسکرالیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اردو
اک آخری گیت اور گالیں تو چلیں

آئندہ تاریخ کا ایک صفحہ

یہ سانحہ سالِ چہل و نو میں ہوا
ہندی کی چھری تھی اور اردو کا گلا
اردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے
مُلّا نامی سنا ہے شاعر بھی تھا

دیباچہ

(آل احمد سرور)

آنند نرائن ملا کی شاعری نئے لکھنؤ کی آواز ہے۔ یہ نیا لکھنؤ پرانے لکھنؤ سے بھی متاثر ہوا ہے، مگر بیسویں صدی کی روح کا اثر اس نے زیادہ قبول کیا ہے۔ لکھنؤ کی پرانی شاعری فن کی پرستار تھی، یہ نئی شاعری جذبات کے اظہار پر زور دیتی ہے مگر فن کی روایات کو نظر انداز نہیں کرتی لکھنؤ کی پرانی شاعری وزن و وقار رکھتی ہے مگر اس میں جذبہ کی تھرتھراہٹ اور احساس کی تازگی کم ہے، اس نئی شاعری نے بیسویں صدی کی زندگی سے نیا احساس لیا ہے اور فن کو ایک نئی زندگی عطا کی ہے۔

لکھنؤ جس تہذیب کا گہوارہ ہے وہ بعض لوگوں کے نزدیک مٹ چکی۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف بدلی ہے۔ لکھنؤ کے تمدن کے نقش و نگار جاگیردارانہ تہذیب سے بنے تھے۔ سرمایہ داری کے اس دور میں بھی جاگیردارانہ تہذیب غزل اور رندی میں چھپ چھپ کر ظاہر ہوتی رہی، مگر انیس سے لے کر چکبست تک مسدس کی مقبولیت کچھ اور بھی کہتی ہے۔ انیس کے نیم مذہبی، نیم تہذیبی مرثیے، چکبست کے نیم قومی اور نیم سیاسی مرقعے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ لکھنؤ میں رندی اور رنگینی کے علاوہ کچھ انسانی اور اخلاقی قدریں بھی مقبول رہیں۔ لکھنؤ کی شاعری میں لاکھ خرابیاں سہی، مگر لکھنؤ میں اردو زبان و ادب کو تقریباً دو سو سال کی مسلسل زندگی ملی ہے، اس نے یہاں کے رہنے والوں کے مزاج میں ایک لطافت و شائستگی پیدا کر دی ہے۔ اس لطافت و شائستگی کا ہم کتنا ہی مذاق اُڑائیں مگر ہماری

سیاست کے ''دورِ جنوں'' میں بھی لکھنؤ تہذیب اور انسانیت کا علمبردار رہا ہے۔ رواداری، بے تعصبی، امن و اخوت کو لکھنؤ نے محض زبان سے نہیں سراہا، اسے دل میں بھی جگہ دی، اردو زبان یہاں محض بولی ہی نہیں گئی، دلوں کی آواز اور روحوں کی ترجمان بھی رہی۔ لکھنؤ میں اسے زبانِ شیخ ولب برہمن دونوں ملے اور دوسرے مقامات سے بہت زیادہ ملے۔ اس تہذیبی خصوصیت کو تنگ نظری اور رجعت پرستی کی ہوائیں جلد فنا نہیں کرسکتیں۔

آنند نرائن ملا کشمیری ہیں، کشمیریوں کی ذہانت اور جمالیاتی احساس کو دنیا جانتی ہے۔ اردو زبان وادب کی ترقی میں ان کا جتنا حصہ ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ آنند نرائن ملا کے والد پنڈت جگت نرائن ملاؔ۔ لکھنؤ کی مشہور شخصیتوں میں سے تھے۔ ملا 1901 میں یعنی بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ پیدا ہوئے۔ جوبلی اسکول اور کیننگ کالج کی انگریزی تعلیم کے علاوہ اردو فارسی گھر پر پڑھی۔ انگریزی میں ایم۔اے کرنے کی وجہ سے انھیں عالمی ادب کے رجحانات ومیلانات سے بھی واقفیت کا موقع ملا۔ وکالت اس لیے اختیار کی کہ آبائی پیشہ تھا اور اس میں امتیاز بھی حاصل کیا۔ مگر ملا کی سلامتِ طبع کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ وکالت کے ہوکر نہ رہ سکے اور نہ کلب اور جدید سوسائٹی کی تفریحات ان کے دل کی خلش اور دردمندی کو مٹا سکیں۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی ملا لکھنؤ کے کسی شاعر سے زیادہ متاثر نہیں ہیں۔ لے دے کر چکبست کا کچھ رنگ ہے۔ ورنہ وہ غالب اور اقبال سے زیادہ متاثر ہیں۔ انھوں نے کسی سے باقاعدہ اصلاح بھی نہیں لی اور صرف اپنی انفرادیت کو سہارا بنایا۔ ملا کے یہاں اس طرح لکھنؤ کے عام ماحول سے بغاوت ملتی ہے، لکھنؤ کی تہذیب کے اثرات ان کی شخصیت اور مزاج میں ایک نکھرے اور ستھرے رنگ سے ملتے ہیں۔ دنیا نے ان سے اچھا سلوک کیا، انھیں ''خالی جیب اور ٹوٹے ہوئے دل'' پر ہی قناعت نہ کرنی پڑی، جو ایک نقاد کے الفاظ میں شاعروں کو خوب راس آتی ہے۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں انیس، غالب اور اقبال کے اشعار کے ترجمے کیے اور انگریزی میں کچھ نظمیں کہیں بھی۔ مگر پنڈت منوہر لال زتشی کے اشارے سے اس ذہنی آوارگی کو ایک فطری راستہ مل گیا اور انھوں نے اردو میں شعر کہنے شروع کیے۔ ملا کی شاعری میں وطن، حسن، انسان دوستی اور نئی دنیا کے محور ملتے ہیں، ان کی شاعری ہمارے ادب کے تمام صالح میلانات کی آئینہ دار ہے اور ان کی شخصیت ہماری تہذیب کی وسیع المشربی اور ہمہ گیری کی ایک زندہ اور تابندہ تصویر ہے۔

اردو شاعری میں ایسے ناکام عاشقوں کی کمی نہیں ہے جو زندگی کی محرومیوں اور تلخیوں کو عشق کا المیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اردو کا عام شاعر دراصل حسن کا بھی پرستار نہیں۔ وہ اپنے حسنِ تخئیل کا عاشق ہے۔ نظارے سے زیادہ وہ نظر کا قائل ہے۔ اس کے مزاج کی یہ نرگسیت (Narcissusism) غزل کی دھندلی چاندنی میں بڑے لطیف سائے پیدا کرتی ہے۔ ان کی وجہ سے ہماری غزل کا بڑا حصہ ایسی پرچھائی بن گیا ہے جو تنقید کی روشنی کی تاب مشکل سے لاسکتا ہے، غزل کی تاریخ اور اس کے ارتقا پر تبصرے کا نہ یہ موقع ہے نہ اس کی گنجائش ہے مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اردو کے اچھے اچھے شاعروں کا حسن کا تصور یا تو محدود ہے یا ناقص۔ زندگی اور اس کے نظریوں کا حسن تو درکنار، یہ حسنِ نسوانی کا بھی بہت رومانی، بہت سطحی اور بہت مبالغہ آمیز تصور ہے۔ سماجی شعور کی کمی اس کی رندی اور رومانیت کو اور بھی عبرت انگیز بنا دیتی ہے۔ حالی، چکبست اور اقبال کی غزلوں کو چھوڑ کر جنگ عظیم تک اردو کا غزل گو شاعر مریض انفرادیت اور بیمار تخئیل کا شکار رہا ہے۔ یہ تینوں شاعر چوں کہ صرف غزل گو نہ تھے اور شاعری کا زیادہ بلند اور وسیع تصور رکھتے تھے، اس لیے ان کے یہاں عشق میں سچائی اور سپردگی ہے، اگر چہ یہ عشق بڑے اور قومی تقاضوں کا عشق ہے۔ لکھنؤ نے چوں کہ اس نئے حسن و عشق کا راز ذرا دیر میں سمجھا اس لیے چکبست سے پہلے یہ ہمیں غزل میں نہیں ملتا۔ ہاں نظموں میں صفی نے اس کا اظہار کیا ہے۔ چکبست اور ملا دونوں لکھنؤ کے ہیں مگر دونوں کو ایک قومی تصور نے روایت کے اس سخت حصار سے باہر نکلنے کا بھی موقع دیا جو دوسرے شعرا کو گرفتار رکھنے میں کامیاب ہوا۔ ملا نے جب ہوش سنبھالا اور ان کے خون نے جب شباب کی گرمی محسوس کی تو ہندوستان کافی بدل چکا تھا۔ پہلی جنگ عظیم نے ہندوستان کو اتنا بدل دیا جتنا کہ دوسو سال میں نہیں بدلا تھا اور دوسری جنگ عظیم نے تبدیلی اور تغیر کی اس رفتار کو اور بھی تیز کر دیا چنانچہ 1925 میں ایک جوان اور حساس شاعر، حسن کی رنگینی اور دنیا کے بدلتے ہوئے چہرے دونوں کا بیک وقت احساس کر لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ملا کی نظموں اور غزلوں میں شروع سے ایک جدید ذہن ملتا ہے۔ اس جدید ذہن کی تربیت انگریزی ادب اور ملک کی سیاسی لہروں سے مل کر ہوئی ہے۔ یہ حسن کا فدائی ہے۔ وفا کے رسمی تصور سے بے نیاز ہے اور وطن کا عاشق بھی ہے یعنی شاعر یہاں ایک ایسا فرد ہے جو بعض اجتماعی ذمے داریاں اور جذبات رکھتا ہے۔ ملا کو غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت ہے اور نیاز نے موجودہ شعرا کا جو اپنا انتخاب شائع کیا تھا۔ اس میں اس خصوصیت کا بجا اعتراف کیا تھا، مگر 1935 تک ملا کی غزلوں اور نظموں میں انفرادیت نہیں آئی ان میں تازگی، شگفتگی اور لطافت ہے مگر کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ہمیں

چونکادے۔ 1935 کے بعد ملا کے فکر وفن میں انسان دوستی کا جذبہ ایسی گہرائی اور گیرائی اور ایک ایسی قوت شفا پیدا کردیتا ہے کہ اس کی طرف نگاہیں فوراً اٹھ جاتی ہیں۔

نظموں میں ''میری دنیا'' زمینِ وطن، ہم لوگ، نوروز، موتی لال نہرو، اور گاندھی، حبِ وطن، سیاسی جدوجہد، قومیت کی تحریک اور آزادی کی خلش کو ظاہر کرتے ہیں۔ وطن پر اردو میں اچھی اچھی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ خصوصاً چکبست، ساغر، افسر، روش، حفیظ، جوش کی وطنی شاعری بڑی قابل قدر ہے مگر اس کے باوجود ملا کی زمینِ وطن، اپنی غنائیت، شیرینی اور نکھری ہوئی کیفیت کی وجہ سے ممتاز ہے۔ چکبستا اور جوش کی ایسی نظموں میں عظمت ہے مگر ملا کے یہاں وارفتگی اور سپردگی، نغمگی اور دل نشینی زیادہ ہے۔ چکبست کا اثر موتی لال نہرو اور گاندھی میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مگر اس کے بعد ملا اس سے آگے نکل جاتے ہیں۔ چکبست کی سیرت نگاری کے بجائے ملا کی نظموں میں تفکر اور ایک بڑے نصب العین کی گرمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی شاعر کی حیثیت سے ملا کا درجہ چکبست سے بڑھ جاتا ہے۔

بیسوا، روحِ اضطراب، شاعر، انقلاب زندہ باد، جامِ حیات، اقبال کے اثر کی یادگار ہیں ملا پر اقبال کے فکر وفن دونوں کا گہرا اثر ہے۔ لکھنؤ کے شعرا میں اقبال کے رنگ کو صرف ملا نے جذب کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملا لکھنوی ہوتے ہوئے مقامی شاعر نہیں ہیں۔ اقبال کی شاعری فن کے بجائے زندگی کے حسن اور روحِ انسانی کے سربستہ رازوں کی پرستار ہے۔ اقبال کے یہاں شاعری قوم کی سیاسی، مضطرب، غیر مطمئن اور بیدار روح ہے جو انسانیت کے بلند مینار کی طرح نگراں ہے اور خوب سے خوب تر کی جستجو کرتی رہتی ہے اور اسی وجہ سے ہماری موت کی سی بے حسی، غلامی اور رسم و رواج کی اسیری سے بیزار ہے۔ ملا نے یہاں مذہب، وطن اور قومیت کے محدود اور جارحانہ تصور پر بے دھڑک وار کیے ہیں۔ ان کی انسان پرستی، قوم و مذہب کے محدود تصور سے اتنی بیزار ہے کہ اقبال سے بھی مایوس ہوجاتی ہے اس اجمال کی کچھ تفصیل ضروری ہے۔

اقبال کے یہاں وطنیت سے مذہب کی طرف جو میلان ملتا ہے وہ قومی نقطۂ نظر سے بڑا مایوس کن ہے۔ اقبال کی وطنی شاعری میں بڑی دل کشی تھی۔ بڑا جوش اور جذبہ تھا، مگر یورپ کے قیام نے انھیں قومیت کے تصور سے نکلنا سکھایا، انھیں بین الاقوامیت اور انسانیت کا پرستار بنایا۔ اقبال کے نزدیک آفاقیت سب سے بڑا نصب العین بن گئی، مگر اس آفاقیت کے لیے انھوں نے جو خط و خال لیے وہ مذہب سے لیے۔ اقبال کے لیے مذہب کے ظاہری رسوم سے زیادہ اس کی اخلاقی تعلیم اہم ہے مگر

اس میں شک نہیں کہ اقبال کی مذہبی اصطلاحوں، ان کی مذہبی زبان اور ایک مذہبی تہذیب وتمدن سے وابستگی اس آفاقیت کو مجروح کرتی ہے۔ ہندوستان کی قومی تحریک کے دوش بدوش یہاں ایک تحریک مسلمانوں کے مذہبی احیا کی بھی چل رہی تھی، ملا جیسے انسانیت پرست جو مندر مسجد دونوں سے بیزار ہیں اور انسان کی خدائی پر ایمان رکھتے ہیں اقبال کی اس آفاقیت کو جب مذہبیت اور مذہبی تحریکوں میں گھرا ہوا دیکھتے ہیں تو وہ اقبال سے ہی بیزار ہوجاتے ہیں، حالاں کہ اقبال اور ملا دونوں میں انسان دوستی، جدید ذہن اور سماجی شعور ملتا ہے۔ ملا جو شروع میں اقبال کی طرح وطن کے پجاری تھے جب موجودہ دور میں وطنیت کے نام پر ہنگامے اور کشت وخون دیکھتے ہیں تو آزادی کی دیوی جس کے جلوؤں کے لیے انھوں نے کتنی ہی راتیں تارے گن گن کر گزاری تھیں، اپنی معصومیت کھو بیٹھتی ہے۔ وہ اس آزادی کا خیر مقدم کرتے ہیں مگر خوش نہیں ہیں۔

آہ! نادان پتنگوں کی تباہی کے لیے کتنی ہنستی ہوئی شمعوں کے پیام آئے ہیں
کتنے ظلمات کے پالے ہوئے سایے شب رنگ بن کے اک طور سرِ منظرِ عام آئے ہیں
ابنِ آدم کے لیے جبر کے کتنے نئے دور لے کے انساں کی مساوات کا نام آئے ہیں

ہاں سمجھتا ہوں بلندی میں نہاں ہے جو نشیب
پھر بھی کھاتا ہوں میں آج اپنی تمنا کا فریب
ایک سجدے کو شناسائے جبیں اور کروں
دل کا اصرار ہے اک بار یقیں اور کروں

1947 اور 1948 میں ہندستان کی تقسیم کے بعد ملک میں نفرت اور خوف کی جو آندھی چل رہی تھی اور جس نے لاکھوں مردوں اور عورتوں کے جسم اور روح سے زندگی اور شادابی چھین لی تھی۔ اُس نے ہندوستان کے ہر مہذب اور سچے انسان کی روح کو صدمہ پہنچایا، اس نے تھوڑی دیر کے لیے انسانیت پر ہمارے یقین کو متزلزل کر دیا۔ آدمی اس طرح جانوروں کو شرما سکتا ہے؟ لوگ اس طرح عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں سے بے رحمی اور بربریت برت سکتے ہیں؟ ملا کے دردمند دل نے بھی ہمارے اس داغ کو محسوس کیا اور وہ پکار اُٹھے:

غارت و قتل کے ہے گرمیٔ بازار وہی — ابھی انسان کی ہے فطرتِ خونخوار وہی
سب سے قانون بڑا آج بھی قانونِ قصاص — سب میں مضبوط دلیل آج بھی تلوار وہی
ایک سے ایک سوا، کون کہے کس کو کہے — اہلِ تسبیح وہی، صاحبِ زنار وہی
کس کو مظلوم کہیں، کس کو ستمگار کہیں — آج مظلوم وہی، کل ہے ستمگار وہی

وطن اے میرے وطن! یوں مجھے مایوس نہ کر
شبھ گھڑی آئی ہے تیری اسے منحوس نہ کر

1947 کے فسادات سے جب تعصب اور نفرت کا پیٹ نہ بھرا تو اس نے اس دور کے سب سے بڑے انسان اور آزادی کے رہنما کا خون بہانے میں بھی پس و پیش نہ کیا۔ مہاتما گاندھی کا قتل ایک شرمناک حادثہ ہے جس پر ہمارے وطن کی روح ہمیشہ ہمیشہ محجوب رہے گی۔ جو قوم و ملک کے لیے سب کچھ لٹا سکتا ہے اور ہمیں اتنا کچھ دے سکتا ہے، اس کے ساتھ یہ سلوک بھی روا ہو سکتا ہے؟ اردو کے کئی شاعروں نے گاندھی جی کے قتل پر نظمیں لکھیں۔ ان میں روش، وامق، اقبال سہیل نشور واحدی اور مظہر جمیل کی نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں وامق اور ملا کی نظمیں صرف مہاتما گاندھی کی شخصیت کی عکاسی نہیں کرتیں، بلکہ ان کے پیام کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ وامق کی نظم کی عوامی اپیل زیادہ ہے مگر ملا کی نظم ایک ادب پارہ ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ گاندھی جی کے چیلے نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی اخلاقی تعلیم اور انسانی دوستی کے بہت بڑے فدائی ہیں دو بند ملاحظہ ہوں۔

سینے میں جو دے کانٹوں کو بھی جا اس گل کی لطافت کیا کہیے
جو زہر پیے امرت کر کے اس لب کی حلاوت کیا کہیے
جس سانس سے دنیا جان پائے اس سانس کی نکہت کیا کہیے
جس موت پہ ہستی ناز کرے، اس موت کی عظمت کیا کہیے

یہ موت نہ تھی قدرت نے ترے سر پر رکھا اک تاجِ حیات
تھی زیست تری معراجِ وفا اور موت تری معراجِ نجات
پستیِ سیاست کو تو نے اپنے قامت سے رفعت دی
ایماں کی تنگ خیالی کو انساں کے غم کی وسعت دی
ہر سانس سے درسِ امن دیا، ہر جبر پہ دادِ اُلفت دی
قاتل کو بھی گو لب ہل نہ سکے آنکھوں سے دعائے رحمت دی
''ہنسا'' کو ''اہنسا'' کا اپنی پیغام سنانے آیا تھا
نفرت کی ماری دنیا میں اک ''پریم سندیسہ'' لایا تھا

ملا چوں کہ ہماری تہذیب کی تمام اچھی قدروں کی نمائندگی کرتے ہیں اس لیے ان شخصیتوں کی انھوں نے خاص طور پر تصویر کشی کی ہے جو ہندوستان کی ساری تاریخ اور جدید رجحانات کا سارا رنگ اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں۔ مسز سروجنی نائڈو ہماری محفل کی ایک روشن شمع اور ہمارے گلستان کا ایک سدا بہار پھول تھیں۔ ہماری سیاست اور ادب پر ان کے گہرے نقوش ہیں مگر ہماری تہذیب پر ان کی شخصیت کا لازوال اثر ہے۔ آنند نرائن ملا نے سروجنی نائڈو پر اپنی نظم میں ان کی ساری تہذیبی صفات کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔

خزاں کی فصل میں بھی نکہتِ بہار رہی
وطن کے دورِ جنوں میں بھی ہوشیار رہی
خروشِ بزم میں بھی تو ترانہ بار رہی
جہنموں میں نسیمِ عدن سلام تجھے
غرورِ قومیت و دیں کے کوہساروں میں
نفاقِ نسل و تمدن کے ریگزاروں میں

الگ الگ سے حیاتِ جہاں کے دھاروں میں

ترانۂ دل گنگ و جمن سلام تجھے

ملا اگرچہ اپنے وطن اور قوم سے محبت کرتے ہیں مگر وہ وطن کو قدرِ اعلیٰ نہیں مانتے، نہ وہ قومیت کے بت کے اندھے پجاری ہیں، ان کی نظموں اور غزلوں میں انسان کی پرستش کا ترانہ ہے۔ اس لحاظ سے ان کا کلام صحیفۂ انسانیت کہا جاسکتا ہے۔ وہ اگرچہ خیر و شر، نور و ظلمت، تہذیب و جہالت کی کشمکش کو معمولی نہیں جانتے اور نہ انسان کے اندر خوابیدہ حیوانیت سے چشم پوشی کررہے ہیں، مگر ارتقا اور انسانیت پر ان کا ایمان مستحکم ہے۔ ارتقا میں فرماتے ہیں۔

دیر تک رہتی نہیں اک جام میں صہبائے زیست

اس میں وہ تندی ہے پیمانے پگھلتے ہی رہے

تیرگی بڑھ بڑھ کے تاروں کو بجھاتی ہی رہی

تیرگی کو چیر کر تارے نکلتے ہی رہے

ارتقا کی راہ میں رُکنا ہی ہے انساں کی موت

ہیں وہی زندہ جو اس رستے پہ چلتے ہی رہے

یعنی ملا کا دل اپنی جگہ پر ہے اور ان کے ذہن نے انھیں دھوکا دیا۔ بیسویں صدی کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ حیات کی پیچیدگی کا دور ہے۔ یہ آزادی کی جدوجہد اور اس کے حقیقی مفہوم کی تلاش کا نام ہے۔ یہ شک اور یقین کی دھوپ چھاؤں ہے۔ یہ مشین کی حکومت اور انسان کے بدلتے ہوئے ذہن کی داستان ہے۔ یہ امن کے خوابوں اور جنگ کے بادلوں کی کہانی ہے، یہ اژدہے کے دانت بونے اور خونریزی کی فصل کاٹنے کی بھول بھلیاں ہے۔ ان سب باتوں میں حقیقت کی جھلک ہے مگر یہ ساری حقیقت نہیں ہے۔ سائنس دانوں نے حقیقت کے راز تک پہنچنے کی بڑی کوشش کی ہے۔ وہ عالمِ فطرت، حیات اور انسانی شخصیت کے متعلق بہت کچھ علم حاصل کرچکے ہیں مگر یہ علم ابھی مکمل نہیں ہے، ابھی انسان نیم حکیم ہے اور نیم حکیم خطرہ بھی ہوتا ہے۔ موجودہ پیچیدگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ

انسان نے طبیعاتی علوم میں بڑی ترقی کی ہے مگر اجتماعی علوم میں ترقی نہیں کی۔ اجتماعی علوم کی ترقی کے بغیر انسان جوہری بم تو گرا سکتا ہے، مگر اسے امن انسانی کے لیے استعمال نہیں کرتا۔ وہ بجلی کی اتھاہ طاقت پیدا کرسکتا ہے، اسے انسانیت کے چراغاں کے لیے کام میں نہیں لاسکتا۔ سائنس ترقی کی طرف مائل کرتی ہے مگر ادب ترقی کے لیے جذبہ پیدا کرتا ہے اور ترقی کے نصب العین کو ''نوائے سینہ تاب'' بناتا ہے اس لیے جدید شاعر کا فرض اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس کے لیے ضرورت ہے کہ وہ نور ونغمہ کی دنیا کو چھوڑ کر اس سرزمین اور اس کے مسائل سے اپنا رشتہ مضبوط کرے اور یہاں نور ونغمہ کی جنت بنائے۔ ترقی پسند شاعری کا یہی نصب العین ہے اور اس نے پچھلے پندرہ سال میں اس طرف اردو ادب کی رہنمائی بھی کی ہے۔

کیا ملا کو ترقی پسند کہا جاسکتا ہے؟ میرا جواب اثبات میں ہے۔ ترقی پسندی، سماجی شعور زندگی کی اہم اور زندہ قدروں کے احساس، انسانیت کے پرچار، تہذیب اور علم کی دولت کو عام کرنے، ہر فرد کو آزاد کرنے اور آزاد افراد کا ایک ایسا سماجی نظام قائم کرنے کا نام ہے جو طبقات کی تفریق کو مٹادے اور ذہنی اور مادی وسائل سے سب کو فائدہ اُٹھانے کا موقع دے۔ ملا نے میری شاعری، جادۂ امن اور دوسری نظموں میں ترقی، آزادی، انسانیت کی جنت کے گیت گائے ہیں۔ اُن کی آخری نظم جادۂ امن میں ہندوستان کو امن کی دعوت دی گئی ہے۔ امن کی پکار انسانیت کی رُوح کی پُکار ہے، اس میں ملا چند خطرات کا ذکر کرتے ہیں:

بدل بدل کے رنگ اُبھر رہا ہے فتنۂ جہاں
فن و ادب کو بھی پہنائی جارہی ہیں وردیاں
گرج رہی ہیں بدلیاں، کڑک رہی ہیں بجلیاں
اِدھر سیاہ آندھیاں، اُدھر ہیں سرخ آندھیاں
ان آندھیوں کے درمیاں ہی درمیاں بڑھے چلو
علم کیے شہیدِ قوم کا نشاں بڑھے چلو

ملا یہاں ایک بین بین راستے پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں، ان کی امن پسندی تو مسلّم ہے مگر انھوں نے

اس پر غور نہیں کیا جن سرخ آندھیوں کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ دراصل امریکہ کے اعصابی سرمایہ داروں کے ذہن کی پیداوار ہیں جس ملک نے ابھی پچھلی جنگ عظیم میں اتنے گہرے زخم کھائے ہوں کہ اس کا بچ نکلنا تاریخ عالم کے ایک معجزے سے کم نہ ہو، وہاں کے عوام کسی طرح بھی ایک اور مہلک اور انسانیت سوز جنگ کے لیے تیار نہیں ہوسکتے پچھلی لڑائی میں سب سے زیادہ محفوظ امریکہ رہا اور آج وہیں سے ''سرخ آندھیوں'' کا یہ غبار اُڑایا جارہا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جھگڑوں سے الگ رہنا تو بہت اچھا ہے مگر موجودہ زمانے میں جب ساری دنیا ایک ہوگئی ہے یہ ممکن بھی ہے؟ اس لیے میرے نزدیک تمام مخلص اور دردمند انسانوں کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ جنگ کو ہر حال میں روکنے کی کوشش کریں اور امن پسند قوتوں کو وہ جہاں بھی ہوں مدد پہنچائیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ روس ایک امن پسند طاقت ہے وہ جنگ نہیں چاہتا، یہ دوسری بات ہے کہ مصیبت کے وقت حفاظت کے لیے ہر کوئی تیار ہوجاتا ہے۔

ملا کی شاعری کا کوئی تذکرہ اس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک ان کی طویل نظم ''ٹھنڈی کافی'' کا نام نہ لیا جائے۔ اس نظم میں ہمیں محبت کی وہ فضا ملتی ہے جو اس دنیا کی ہوتے ہوئے بھی آسمانوں کی ہمراز ہے۔ اس کا فطری بہاؤ اور ارتقا اس کی موزوں و متناسب تصویریں، اس کے نفسیاتی لمحے اور شوخ اشارے، اسے کامیاب محبت کا ایک دلکش ڈراما بنا دیتے ہیں۔ اس نظم کی فضا میں دو کردار اُبھرتے ہیں اور دونوں جادو کے کرشمے نہیں اسی دنیا کے انسان ہیں جو مل بیٹھتے ہیں تو دنیا کچھ اور حسین اور خوش گوار ہوجاتی ہے جو ذہنی پرچھائیاں نہیں گوشت پوست کے انسان ہیں یہ نظم جدید بھی ہے اور لذیذ بھی۔

ملا ان شاعروں میں سے ہیں جو نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، اُن کے دل کی دولت نذرِ خوباں بھی ہے اور نذرِ دوراں بھی۔ ان کی غزلوں میں ایک تازگی، تفکر اور مہذب لطافت ملتی ہے۔ اس کا نشہ بعض شعرا کی رندی، زندہ دلی اور رومانیت کے مقابلے میں کچھ مدھم معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت اس کی نرمی، دل آسائی، قوتِ شفا، بڑی خاصے کی چیز ہے۔ لکھنؤ کے اکثر شعرا کی غزلیں اپنے رچے ہوئے اندازِ بیان اور چُست و دُرست زبان کے باوجود پرانی معلوم ہوتی ہیں، ان کی فضا پرانی ہے ان کی دنیا ہماری آج کل کی دنیا سے خاصی مختلف ہے، ان کی زبان میں انوکھا پن نہیں ہے جو ارسطو کے نزدیک اعلیٰ شاعری میں ضروری ہے جو انوکھے، منفرد یا تازہ احساس سے آتا ہے، پھر یہ غزلیں ایک ایسا کیف و اثر پیدا کرتی ہیں جو الفاظ کا عشق سکھاتا ہے انسانوں کا عشق نہیں۔ جن کو سیکھنے

کے لیے لکھنؤ اسکول کی غزلیں سب سے زیادہ مفید ہیں مگر زندگی کو سمجھنے کے لیے نہیں، حسرت، فانی، اصغر، جگر، فراق کی غزلوں میں تازگی ملتی ہے۔ حسرت کی دنیا ہماری مانوس دنیا کے لیے ایسے حسن کو پیش کرتی ہے جس سے ہم اب تک بے خبر تھے۔ فانی قدیم غزلوں سے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنی یاسیت کے اعتبار سے بالکل مختلف اور منفرد ہیں۔ ایسی بھرپور اور گہری یاسیت بیسویں صدی کے احساسِ شکست سے ہی پیدا ہوسکتی تھی۔ اصغر کا تصوف اگر غالب اور مومن کے تغزل سے رموز نہ لیتا تو اس میں یہ لطافت اور تاثیر نہ آتی، جگر کی سرمستی اور رندی، عشق کو عبادت بناتی ہے اور عشق کی عظمت کی یادگار ہے۔ فراق کی دنیا میں نفسیات کی گہرائیاں ہماری غزل کے لیے نئی ہیں۔ ملا اس برادری میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ غزل کو بہت سے عاشق ملے مگر ملا انسانیت کے عاشق ہیں۔ انھیں بشر اپنی ساری پستیوں اور عظمتوں کے ساتھ عزیز ہے۔ ایک معنی میں ملا بھی رومانی ہیں۔ وہ ایک خواب سے محبت رکھتے ہیں۔ مگر غزل خوابوں کی داستان نہیں تو کیا ہے۔ ملا کا کمال یہ ہے کہ خوابوں سے اس قدر عشق کے باوجود وہ حقایق کا احساس رکھتے ہیں اور اپنے گرد و پیش کی فضا کو نظر انداز نہیں کر سکتے:

ملا یہ اپنا مسلکِ فن ہے کہ رنگِ فکر
کچھ دیں فضائے دہر کو کچھ لیں فضا سے ہم

غزل بڑی کافر صنفِ سخن ہے۔ یہ پیمبروں اور مصلحوں کے لیے نہیں عاشقوں کے لیے ہے۔ اور اس میں اگر آدمی زخم خوردہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ غزل پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ سب بجا اور درست مگر کتابِ دل کی تفسیر اور خواب جوانی کی تعبیر کی حیثیت سے اس کا جواز ہمیشہ رہے گا۔ ملا کی جوانی دیوانی تو نہیں، مگر رنگین ضرور ہے، ان کے عشق میں وہ چمک دمک اور سپردگی تو نہیں جو جوش اور جگر کی یاد دلاتی ہے مگر گداز اور تاثیر قدم قدم پر ہے۔ ملا کا عشق ذرا سنبھلا ہوا اور مہذب عشق ہے مگر اس کی صداقت اور دل گدازی میں کلام نہیں۔ ملا کو جدید عاشق کی بے باکی نہیں آتی، وہ نگاہوں کی زبان کو سمجھتے ہیں اور اس کے ترجمان بھی ہیں۔ ملا کے یہاں نفسیاتِ انسانی کا علم بھی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا اثر دیر میں ہوتا ہے مگر دیرپا رہتا ہے۔ ملا کی شخصیت کے گرد چوں کہ اس قسم کا کوئی ہالہ نہیں ہے جو آج کل بہت سے شاعروں نے رندی یا نعروں سے پیدا کرلیا ہے۔ اور نہ انھوں نے کسی سستے نشے کی دوکان لگائی ہے، چوں کہ کسی حلقہ یا برادری سے بھی وابستہ نہیں ہیں، اس لیے عام طور پر لوگوں نے ان سے بے اعتنائی کی ہے۔ حالی کی طرح اگر چہ ان کا مال نایاب ہے مگر

گاہک اکثر بے خبر ہیں۔ انھوں نے کسی مشہور لیبل کی آڑ نہیں لی۔ وہ شاعری کی محفل میں کوئی پیترا یا ڈھول لے کر نہیں آئے۔ میں اس بات کو ان کی سلامتی طبع کی بہت بڑی دلیل سمجھتا ہوں۔ ان کی ایک نمائندہ غزل اور چند منتخب اشعار سے میرے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جائے گی۔:

بشر کو مشعلِ ایماں سے آگہی نہ ملی — دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی

خوشی کی معرفت اور غم کی آگہی نہ ملی — جسے جہاں میں محبت کی زندگی نہ ملی

یہ کہہ کے آخرِ شب شمع ہو گئی خاموش — کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی

لبوں پہ پھیل گئی آکے موجِ غم اکثر — بچھڑ کے تجھ سے ہنسی کی طرح ہنسی نہ ملی

ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظامِ چمن — فسردہ غنچوں کو جس میں شگفتگی نہ ملی

فلک کے تاروں سے کیا دور ہوگی ظلمتِ شب — جب اپنے گھر کے چراغوں سے روشنی نہ ملی

ابھی شباب ہے کرلوں خطائیں جی بھر کے — پھر اس مقام پہ عمرِ رواں ملی نہ ملی

وہ قافلے کہ فلک جن کے پاؤں کا تھا غبار — رہِ حیات سے بھٹکے تو گرد بھی نہ ملی

وہ تیرہ بخت حقیقت میں ہے جسے ملا
کسی نگاہ کے سائے کی چاندنی نہ ملی

مہر وہ ہے خاک کے ذرّے جو کردے زرنگار
اونچی اونچی چوٹیوں پر نور برسانے سے کیا

سختیِ زیست عشق سے دور نہ ہو سکی مگر — پھول تو کچھ کھلا دیے دامنِ کوہسار میں

ساقیا جب ہے ہر اک میکش کی قسمت میں نہیں — سب کو اس محفل میں پیمانے عطا کیوں ہو گئے

شبِ غم میں بھی اے تصورِ دوست زندگی کا مزا دیا تو نے

آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار
گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی

نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہو
قیامت تک پھر اس دل کی پریشانی نہیں جاتی

بس تو یہ بھی نہیں اک پھول قفس میں رکھ لیں
اور نگاہوں میں گلستاں کا گلستاں ہوتا

مے کشوں نے پی کے توڑے جامِ مے ہائے وہ ساغر جو رکھے رہ گئے

کسی کی زندگی کا رنج ہی حاصل نہ بن جائے
غم اچھا ہے مگر جب تک مزاجِ دل نہ بن جائے

تیرے دل پہ حق ہے جہاں کا بھی یہ فرارِ عشق روا نہیں
غمِ دوست خوب ہے جب تلک غمِ زندگی کو بھلا نہ دے

یہ خزاں بدوشِ سموم تو ہے گلوں کے ظرف کا امتحان
وہی گل ہے گل جو فسردہ ہو تو فسردگی بھی بہار دے

نہ جانے کتنی شمعیں گل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب اک خورشید اِتراتا ہوا بالائے بام آیا

خروشِ بزم میں بھی سازِ دل چھیڑے ہی جاتا ہوں
اکیلا ہوں ابھی لیکن مجھی کو کارواں سمجھو
کبھی تیغ و قلم سے بھی مٹے ہیں تفرقے دل کے
مٹاتا ہیں تو پہلے رکھ کے ساغر درمیاں سمجھو

اظہارِ درد دل کا تھا اک نام شاعری　　یارانِ بے خبر نے اسے فن بنادیا

خونِ دل ضائع نہ ہو مجھ کو بس اتنی فکر ہے　　اپنے کام آیا تو کیا غیروں کے کام آیا تو کیا

بس ایک پھول نمایاں ہے دل کے داغوں میں　　یہاں رُکی تھی تری چشمِ التفات کبھی

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت　　ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

جمالِ حسن میں تھا اک جلالِ عفت بھی   گناہ گار خیالِ گناہ کر نہ سکے

ہاں تم نے اعتراف محبت نہیں کیا   نیچی کیے ہوئے ہیں نظر کیا حیا سے ہم

اردو شاعری نے ہمارے تہذیب و تمدّن کو جس طرح نکھارا اور سنوارا ہے اور اس میں جو انسانی اور عالمی قدریں پیدا کی ہیں اس کا اعتراف آج کل کی ہیجانی فضا میں مشکل ہے، ہندوستان کی تقسیم کے بعد ملک میں تنگ نظری اور ماضی پرستی کی اتنی گرم بازاری ہے کہ ہندوستان کو امن و اُخوت کی ایک جنت بنانے میں اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی کوششیں اتنی مقبول نہیں ہیں جتنی ہونی چاہیے لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان مساعی کا کھلے دل سے اعتراف کیا جائے۔ اردو کے افسانہ نگاروں، شاعروں اور نقادوں نے سخت آندھیوں میں تہذیب کی شمع روشن رکھی ہے۔ اس اجالے میں ملا کی اپنی روشنی بھی کم نہیں اور اس لیے ان کا یہ فخر بالکل بجا ہے:

خزاں کے تند جھونکوں میں بھی خواب رنگ و بو دیکھا

جہنم میں بھی جس نے گل کھلائے ہیں وہ جنت ہوں

ملا کی پاکیزہ اور مہذب شخصیت، ان کی وضعداری اور ہماری تہذیبی روایات کی صحیح آئینہ داری ان کا وطنیت کا وہ تصور جو بین الاقوامیت کے لیے پہلی اینٹ کا کام دیتا ہے اور آراگوں کے نزدیک صحیح بین الاقوامیت ہے، ان کا عوام کے دکھ درد کو اپنانا اور تسبیح و زنّار سے بلند ہوکر دیکھنا، ان کا تازہ ہواؤں اور نئی فضاؤں کے لیے دل و دماغ کے دریچوں کو کھلا رکھنا، انسانیت سے یہ شدید، گہرا اور پُر جوش عشق، موجودہ دور میں جب کہ زندگی کی سختیوں اور تلخیوں نے اچھے اچھوں کے حواس باختہ کردیے ہیں ہمارے لیے ایک روشنی کا مینار ہے، ان کے مزاج کی نرمی، ان کے واضح نصب العین اور پختہ شعور کے ساتھ مل کر ہمارے ادب کا ایک نشان راہ بن جاتی ہے۔ ان کے کلام میں ہمیں بیسویں صدی کی زندگی کے سارے موڑ نظر آتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کے تمام صالح عناصر بھی۔ نیاز نے ان کی نظموں میں تغزل کی تعریف کی ہے۔ ان کی نظر ان کی نظموں کے تعمیری حسن تناسب اور گہرے سماجی شعور پر نہیں گئی۔ غزل کی صف میں جب عشاق کا ذکر آئے گا تو انسانیت کے اس عاشق کو کوئی فراموش نہ کرسکے گا، اور آج جب بعض حلقوں میں اردو کو اس کے

دیس میں بدیسی کہا جارہا ہے ملا کا یہ شعر ایک خاموش تازیانہ بن کر زندہ رہے گا:

لب مادر نے ملا لوریاں جس میں سنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

3 نومبر 1949
7 بیر و روڈ، لکھنؤ

آل احمد سرور

بہ قلمِ خود

میری کوئی نیت نہ تھی کہ میں بہ طور تمہید کے کچھ لکھوں لیکن اس مجموعہ کی ترتیب کے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ چار صفحے خالی رہے جاتے ہیں اور انھیں کسی طرح بھرنا ہے تو میں نے یہ موقع اپنی انشا پردازی دکھانے کے لیے ڈھونڈ لیا اور چند صفحات کو اپنے خیال میں رنگین (اور دوسروں کی رائے میں غالباً سیاہ) کرنے کی صورت نکال لی۔

مجھے معلوم نہیں کہ یہ مجموعہ شائع کر کے میں اردو ادب کے دامن کو کچھ نئے پھول دے رہا ہوں یا کانٹے۔ اگر یہ پھول ہیں تو کسی معذرت کی ضرورت نہیں لیکن اگر یہ کانٹے ہیں تو اس جرم کی ذمہ داری تنہا میری ہے۔ ''احباب کے اصرار'' کا رسمی بہانہ پیش کر کے عذرِ تقصیر کرنا میرے نزدیک نہ تو صحیح ہے اور نہ مناسب۔

اس کا تو میں اندازہ نہیں کر سکتا کہ پڑھنے والوں کے ذہن میں نقش کس صورت سے ابھرے گا لیکن اس مجموعہ کو دیکھ کر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بونے کو تین پہلوان اپنے شانوں پر اٹھائے ہوں۔ مجھے اپنی ادبی کم قامتی کا احساس ہے اور جو ادبی تنقیدیں بالغ اور نابالغ دونوں قسم کے نقادوں کی اکثر رسالوں میں برابر نکلتی رہتی ہیں انھیں پڑھ کر یہ احساس اور زیادہ شدید ہو گیا ہے۔

مجھے اس اخلاقی کمزوری کا اعتراف ہے کہ اپنے بارے میں کسی کی اچھی رائے سن کر دل کو خوشی ہوتی ہے، شاید اس سے میرے پندار کو تسکین ملتی ہے۔ میں محترمی نیاز فتح پوری کا خاص طور پر ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے کلام کو قابلِ توجہ سمجھا اور میری حیثیت سے زیادہ مجھے مرتبہ دیا۔ یہ اُن کا حسنِ نظر ہے کہ ''بازوئے کبوتر'' میں بھی انھوں نے ''پروبالِ شاہیں'' دیکھ لیے۔ سرور اور احتشام میرے دوست ہیں، میں نے انھیں دوست کہہ کر سب کچھ کہہ دیا اور دوست بھی کیسے شاید انھیں کے لیے میں نے یہ

شعر کہا تھا:

نگاہِ دوست کو اُس کی بھی ہے خبر ملا
وہ راز جس کا ابھی دل بھی راز دار نہیں

ایسے دوستوں کا زبان سے شکریہ ادا نہیں کیا جاتا۔

مجھے یہ پڑھ کر یقیناً بڑی حیرت ہوئی کہ احتشام نے اِشارۃً اور سرور نے صریحاً میرا شمار ترقی پسند شعرا میں کیا ہے۔ آخر میں ترقی پسند کس طرف سے ہوگیا؟ نہ تو میں مزدور کو فرشتۂ رحمت سمجھتا ہوں اور نہ مزدور راج قائم کرنے کے لیے کشت و خون کی ترغیب دینے ہی کو شاعری کا اصل مقصد قرار دیتا ہوں۔ رہ گئی انسان دوستی تو اب یہ بھی اُس مخصوص حلقۂ ادب میں جس پر ممبئی کی مہر لگی ہے مشکوک نگاہوں سے دیکھی جانے لگی ہے۔ مستند ترقی پسند نظریہ اب اسے بھی ایک فریب سمجھتا ہے جیسے کسی بچے کو چاند دکھا کر اُس کے سامنے سے مٹھائی کی طشتری غائب کر دینا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میری وجہ سے ان دونوں کے ادبی وقار پر حرف نہ آئے اور یہ ندامت مجھے اور اٹھانی پڑے۔

اس مجموعہ کا نام ''جوے شیر'' رکھنے میں یقیناً شاعرانہ تعلّی سے کام لیا گیا ہے۔ کچھ اس میں دُکانداروں کا وہ اصول بھی شامل ہے جو اپنے مال کو دس گنے دام لگا کر گاہک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ گاہک اور دُکاندار کے درمیان قیمت کے بارے میں ایک طویل تبادلۂ خیالات ہونے کے بعد سودا طے ہو جاتا ہے۔ گاہک اپنے دل میں خوش ہوتا ہے کہ میں دُکاندار کے بھرّے میں نہیں آیا اور میں نے مناسب دام پر مال پایا۔ دُکاندار ادھر مطمئن ہوتا ہے کہ اُس نے پھر بھی اچھا خاصا نفع حاصل کیا۔ میں نے بھی اپنے کھارے پانی کو ''جوے شیر'' کہہ کر پیش کیا ہے کہ شاید اسی طرح پڑھنے والوں کا اور میرا ''جوے آب'' پر توڑ ہو جائے۔ وہ اسے کھاری نہ کہیں اور میں تسلیم کر لوں کہ یہ غذا نہیں ہے بلکہ میٹھا پانی ہے۔

اس مجموعہ میں عروض و زبان کے اعتبار سے غالباً متعدد غلطیاں ملیں گی۔ ان میں سے کچھ تو ایسی ہوں گی جو میرے علم میں بھی نہ ہوں گی لیکن بہت سی ایسی ہیں جن سے میں واقف ہوں۔ میں نے یہ

جانتے ہوئے بھی انھیں دور کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی کیوں کہ میں نے اپنے ذوق کو مروجہ اصولِ شاعری پر ہمیشہ ترجیح دی۔ میں اس سے زیادہ اس وقت کچھ اور کہنا نہیں چاہتا کیوں کہ یہ بحث تفصیل طلب ہے اور یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

''جوئے شیر'' کی ترتیب اور کتابت کے بعد میں نے دسمبر 1949 میں ایک غزل کہی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر میں اسے یہاں شامل کردوں۔

غزل

سینہ کی حرارت سے خالی گرمیِ چراغِ شام نہ لے
یہ دل ہے امانت دنیا کی اپنا ہی بس اس سے کام نہ لے
ہستی ہے نام تسلسل کا ماضی سے مفر ممکن ہی نہیں
وہ صبح نہ ہوگی صبح کبھی جو جائزہ ہر شام نہ لے
مے سب کو نہ ہو تقسیم اگر اپنا بھی اُلٹ دے پیمانہ
یہ کفر ہے کیشِ رندی میں ساقی سے اکیلے جام نہ لے
قدرت نے کیا انساں کو عطا امید بھرا دل یہ کہہ کر
رنگ اس سے ترے ہر قصہ کا آغاز تو لے انجام نہ لے
پینے والے انداز سے پی یہ زہر بھی ہے اور امرت بھی
کیفِ ایّام کے دھوکے میں دیوانگیِ ایّام نہ لے
یا دل میں نہ دے نفرت کو جگہ یا حرفِ محبت لب پہ نہ لا
یہ نام نہ لے لیتا ہے تو پھر یہ نام برائے نام نہ لے
اس جہدِ خرد کے میداں میں کچھ بھی نہ ملے لاشوں کے سوا
گرتے ہوئے مضروبوں کو اگر آغوشِ محبت تھام نہ لے
یہ بخیہ گری ہے نیش زنی یوں غم کا مداوا کیا ہوگا
پھولوں کے کلیجے چاک ہوں جب کانٹوں سے رفو کا کام نہ لے
خاموشی بھی ہے ضبط کوئی، ہے کیشِ وفائے عشق تو یہ

نظروں کو بھی پی جا آنکھوں میں اشکوں سے بھی اس کا نام نہ لے
کب تک ترتیب یونہیں ہوگا ہر ایک فسانہ ہستی کا
اللہ کو نیند آتی ہی رہے شیطان کبھی آرام نہ لے
اس مے کو نہ پی قطرہ قطرہ گن گن کے نہ لے سانسیں اپنی
جینا ہے تو جی جینے کی طرح جینے کا فقط الزام نہ لے
محفل کے سبو و جام سے لے ملا نہ کبھی اپنی صہبا
لے کیفِ مذاق عام مگر بر سطحِ مذاقِ عام نہ لے

''جوئے شیر'' شائع کرتے ہوئے میرے دل کا وہی عالم ہے جو والدین کا لڑکی کو سسرال رخصت کرتے وقت ہوتا ہے۔ یا کسی مسافر کا اجلے کپڑے پہنے ہوئے ہولی کی صبح کسی اجنبی شہر کے بازار میں پہنچ کر ہوتا ہے جہاں رنگ کھیلنے والوں کے غول کے غول پچکاریوں سے مسلح موجود ہوں اور نئے شکار کے منتظر ہوں۔ خیر کیا مضائقہ ہے دیکھا جائے گا۔

اب میں اس بکری کو دعائے زندگی دے کر قصائی باڑے کی طرف ہانکے دیتا ہوں۔ خدا حافظ!

آنند نرائن ملا

15؍دسمبر 1949

1926

پرستارِ حُسن

اپنے سوزِ غم کی شرح داستاں کیوں کر کروں　　دل کی جو باتیں ہیں وہ نذرِ زباں کیوں کر کروں
بات جو مجھ سے بھی پنہاں ہے بیاں کیوں کر کروں　　اپنی ہستی کو زمانہ پر عیاں کیوں کر کروں

درد دل کو غم کہوں، اُلفت کہوں، سودا کہوں
میں بھی حیران ہوں کس سے کہوں اور کیا کہوں

اے شعاعِ برق زائے خاورِ پہنائے حسن　　اے شرابِ دلگدازِ ساغرِ مینائے حسن
اے شرارِ عقل سوزِ شعلۂ سینائے حسن　　اے نگاہِ فتنہ خیز دیدۂ بینائے حسن

تو نے سینہ میں یہ کیسا درد پیدا کر دیا
میری ہستی کو مرے دل سے شنا سا کر دیا

آرزوئیں دل کی ساری بیخبر تھیں مستِ خواب　　جانتا تھا کون کہتے ہیں کسے جوشِ شباب
یک بیک تو نے رُخِ پُر نور سے اُلٹی نقاب　　اک نظر میں ہاتھ سے جاتی رہی تسکین و تاب

غنچۂ دل اک اشارے سے ترے کھلنے لگا
مجھ کو رازِ آفرینش کا پتہ ملنے لگا

سامنے تھا جلوہ گر حسنِ ازل مستانہ وار　　دل فریب و دل گداز و دل رُبا و دل شکار
آفتِ صبر و تحمل، دشمنِ صبر و قرار　　اور کیا کرتا اگر کرتا نہ دل اپنا نثار

دل تھا یوسف اور اُدھر تھی دولتِ بیدارِ حُسن
کھینچ ہی لائی اُسے آخر سرِ بازارِ حُسن

تو امنگوں میں مری مجھ کو نظر آنے لگا　　تو تصوّر میں مجھے رہ رہ کے تڑپانے لگا
میں نے جب دیکھا مرے قابو سے دل جانے لگا　　نقشۂ عبرت دکھا کر اس کو سمجھانے لگا

کچھ نہ کچھ میرے ارادوں میں مگر خامی رہی
لاکھ کوشش کی مگر افسوس ناکامی رہی

میں نے پہلے تجھ سے بچنے کی بہت تدبیر کی　　دل کے بہلانے کو دنیا اک نئی تعمیر کی
جب نہ یوں مانا تو پھر دھمکی بھی دی تعزیر کی　　بیڑیاں اس کو پنھائیں عقل کی زنجیر کی

تو مگر میرے خیالوں میں بھٹکتا ہی رہا
آرزو بن کر کلیجے میں کھٹکتا ہی رہا

جستجو ہی میں تری میں نے بسر کی صبح و شام   ہو گیا مجبور ہو کر میں ترا آخر غلام
آنکھ میں تھی شکل تیری اور لب پر تیرا نام   عقل و دانش کو کیا بس دور سے میں نے سلام

جب سے دل کے بتکدے میں تیری مورت دیکھ لی
میں نے جس صورت میں چاہا تیری صورت دیکھ لی

رنگ بن کر صورت آرائے چمن مجھ کو ملا   تو ہر اک ذرہ کے دل میں ضوفگن مجھ کو ملا
بزم دنیا میں تو ہی ہنگامہ زن مجھ کو ملا   تو ہر اک محفل میں شمعِ انجمن مجھ کو ملا

جلوہ زن آنکھوں میں کچھ ایسی تری تنویر تھی
میرے ہر آنسو کے قطرے میں تری تصویر تھی

اِک نئی صورت کا یہ ہر روز جو یا ہو گیا   اس تلاش حسن میں یہ دل کچھ ایسا ہو گیا
جس حسیں کو اِس نے دیکھا بس اُسی کا ہو گیا   آج شیریں پر تو کل لیلےٰ پہ شیدا ہو گیا

میں نے اس نکتہ میں خامی آج تک پائی نہیں
حسن کا شیدا نہیں جو دل کہ ہر جائی نہیں

جز پرستش کے مرے دل کی کوئی حاجت نہیں   حُسن سے میری غرض جز خوبیٔ صورت نہیں
حُسن کے بندے جو ہیں وہ بندۂ الفت نہیں   گرمیٔ شوق و تمنا سے مجھے رغبت نہیں

پاک نیت ہو تو جھگڑے عشق میں پڑتے نہیں
شمع کی اُلفت میں پروانے کبھی لڑتے نہیں

جو نہ ہو محوِ طلب انساں کی فطرت ہی نہیں   حُسن جس پر ختم ہو ایسی تو صورت ہی نہیں
ایک کی ہو کر رہے جو وہ طبیعت ہی نہیں   ہو نہ گلشن میں جو آوارہ وہ نکہت ہی نہیں

دل ہے شیدائے چمن اس کی محبت عام ہے
شہد کی مکھی ہے یہ ہر گُل سے اس کو کام ہے

گنگا کے چراغ

آبِ گنگا کیا ہی مستانہ ترا انداز ہے جھوم کر چلنے پہ تیرے مجھ کو کیا کیا ناز ہے
کیا مرے جذبات کی دنیا کا تو ہمراز ہے تیری لہروں میں مری تخئیل کی پرواز ہے
اپنی موجوں کا تلاطم آمرے سینہ میں دیکھ
عکس اپنی بے کلی کا دل کے آئینہ میں دیکھ

آج تک آنکھوں میں ہے تیرا سماں اے ہردوار وہ ہجوم مہوشاں محو تماشا برکنار
وہ صفائے آبِ اخضر میں چراغوں کی بہار دیکھ کر جن کو یہی کہتا تھا دل بے اختیار
تابہ سطحِ آب ہر گوہر اُبھر آیا ہے کیا؟
آسماں لے کر ستاروں کو اُتر آیا ہے کیا؟

کیا شعاعِ مہر کے ذرّے پریشاں ہو گئے فیض سے خورشید کے یہ خود درخشاں ہو گئے
تیرے آبِ پاک کے جو ہر نمایاں ہو گئے کیا کسی کے داغِ عصیاں نورِ ایماں ہو گئے
رقص کرنے کے لیے جگنو نکل آئے ہیں کیا
پھول جنت کے فلک والوں نے برسائے ہیں کیا

یہ مسافر کون ہیں کیسا ہے ان کا کارواں کیا اسی کا عکس ہے کہتے ہیں جس کو کہکشاں
کس قدر پیاری ہیں ان کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں یہ کہاں سے آئے ہیں بہر تماشائے جہاں
اہلِ دنیا کو تری عظمت دکھانے کے لیے
سورگ سے اُتری ہیں کیا پریاں نہانے کے لیے

گھورنے والوں کی نظروں سے یہ گھبراتی نہیں پیکرِ نوری کی عریانی سے شرماتی نہیں
ہاں یقیں انسان کی باتوں کا یہ لاتی نہیں موج دریا چھوڑ کر ساحل تلک آتی نہیں
حُسن دکھلاتی تو ہیں لیکن کچھ اس انداز سے
اپنا جلوہ خود چھپا لیتی ہیں اپنے ناز سے

اے چراغِ آبِ گنگا تجھ میں کیسا نور ہے؟ تو کسی عاشق کا دل ہے یا جبینِ حور ہے؟
اک جھلک دکھلا کے پھر موجوں میں تو مستور ہے حُسن کا چشمِ تمنّا سے یہی دستور ہے

تیرا جلوہ کیا کسی مظلوم کی تقدیر ہے
ایک ہستی کے امید وبیم کی تصویر ہے

کیا تری تقدیر میں انساں کی رنجوری بھی ہے؟ کیا ترے دل میں تمناؤں کی مجبوری بھی ہے؟
سینۂ نوری میں تیرے ذوقِ مہجوری بھی ہے؟ کیا ترے جامِ گلی میں آبِ انگوری بھی ہے؟

کس کی امیدوں کی گلکاری ترے دامن میں ہے؟
آرزو کس کی فروزاں تیرے پیراہن میں ہے؟

تو کسی کے سوز دل کا شعلۂ مستور ہے تو کسی کی دیدۂ گریاں کا سارا نور ہے
تجھ میں ساری التجائے خاطر مجبور ہے تو کسی بیکس کی نظروں میں چراغ طور ہے

اک خلوصِ دل کی تجھ میں انتہائی شان ہے
جلوۂ خورشید تیرے نور پر قربان ہے

شمع

شب کو محفل میں عجب ہنگامۂ پُر شور تھا　　بادۂ شوق و تمنا سے ہر اک دل چور تھا
حسنِ یوسف، عشقِ مجنوں، نعرۂ منصور تھا　　ہر چراغِ انجمن رشکِ چراغِ طور تھا
چشمِ ساقی کا ہر اک میکش سے وہ اصرار تھا
ہوش کا دعویٰ ہی کرنا بزم میں بے کار تھا

مست سب تھے اور کسی کو فکرِ رسوائی نہ تھی　　بے حجابی تھی مگر چشمِ تماشائی نہ تھی
کون دل تھا آرزو لے کر جسے آئی نہ تھی　　کون صورت تھی کہ جو محوِ خود آرائی نہ تھی
بے خودیِ شوق سے کل انجمن سرشار تھی
ہاں فقط اک شمع محفل تھی کہ جو ہشیار تھی

شمع سے میں نے کہا تو کس لیے خاموش ہے　　ہر طرف جوشِ طرب ہے شور نا و نوش ہے
آرزو امید سے محفل میں ہم آغوش ہے　　تجھ کو لیکن فکرِ فردا ہے کہ رنجِ دوش ہے
تجھ پہ عریاں کون سا رازِ نہانی ہو گیا
تلخ کیوں جامِ شرابِ زندگانی ہو گیا

کیا تجھے معلوم ہے اصل و مجازِ زندگی　　ایک مدت سے ہوں میں جویائے رازِ زندگی
کچھ سنا مجھ کو حدیثِ دل گدازِ زندگی　　میں بھی کچھ سمجھوں کہ کیا ہے سوز و سازِ زندگی
نور جو تجھ میں نہاں ہے کچھ تو بتلا کیا ہے یہ
حسن کی تنویر ہے یا عشق کا جلوا ہے یہ

کچھ بتا کیا لذتِ سوزِ نہانی دیکھ لی　　اک ذرا لب کھول تیری بے زبانی دیکھ لی
حالِ دل کہہ تیرے اشکوں کی روانی دیکھ لی　　گل فشانی کر تری گوہر فشانی دیکھ لی
کام کا کس کے یہ تیرا نورِ بزم افروز ہے
آگ محفل میں لگا دل میں اگر کچھ سوز ہے

شمع نے سن کر کہا دل سوز ہے تیرا خطاب　　بڑھ گیا باتوں سے تیری اور میرا اضطراب

آج تک چھوٹا نہ تھا مجھ سے کبھی یارائے تاب　　لیکن اب دینا ہی پڑتا ہے مجھے تیرا جواب
تا بہ لب افسانۂ دل میں کبھی لائی نہ تھی
مے جو شیشہ میں تھی پیمانے تلک آئی نہ تھی

میں نے اس دنیا کی تصویر نہانی دیکھ لی　　ایک شب میں سب بہارِ زندگانی دیکھ لی
راحتِ موہوم کی دنیائے فانی دیکھ لی　　درد ہی میں بس حیاتِ جاودانی دیکھ لی
تو مگر اب تک اسیرِ دامِ ہست و نیست ہے
تو فنا ہونا جسے کہتا ہے میری زیست ہے

داغِ دل ہی سے فروغِ لالہ رازِ عشق ہے　　اشکِ رنگیں ہی سے یہ نقش و نگارِ عشق ہے
نورِ ہستی جلوہ سوزِ شرارِ عشق ہے　　خون میں ڈوبی ہوئی ساری بہارِ عشق ہے
عشق میں یہ حالِ دل ہے کون سمجھائے اسے
یہ اُسی پر جان دیتا ہے جو تڑپائے اسے

جان دے اور پھر بہارِ باغِ دنیا دیکھ لے　　اشکِ خوں میں اضطرابِ موجِ دریا دیکھ لے
دل جلا کر حسنِ فطرت کا نظارا دیکھ لے　　خود تڑپ پھر سوزِ ہستی کا تماشا دیکھ لے
دردِ الفت گر نہیں ہے حُسن پیدا ہی نہیں
چشمِ موسیٰ ہو نہ جب تک نورِ سینا ہی نہیں

1927 تا 1935

غزلیات

صیاد کے ستم سے اتنا تو فرق ہاں ہے
پہلے اک آشیاں تھا اب یادِ آشیاں ہے

کہنے کو لفظ دو ہیں امید اور حسرت
ان میں نہاں مگر اک دنیا کی داستاں ہے

اے مشتِ خاک شمع دل کو بجھا نہ ہرگز
یہ ہی تو اک شرارِ ہستی جاوداں ہے

ہے حسن بھی اک آفت باغِ جہاں میں اے گل
کس کس سے تو بچے گا گلچیں ہے باغباں یہ

جینے کا لطف سارا اُلفت کی یاد سے ہے
پہلے جو دردِ دل تھا اب وہ سکونِ جاں ہے

~~~~~~

بچ کے جائے گا کہاں تو دیدۂ بیباک سے
منہ چھپالے لاکھ اپنا پردۂ افلاک سے

خوب دیکھا تو نے اے مے دہر کا پست و بلند
چڑھ گئی رندوں کے سر اُتری جو شاخِ تاک سے

کھو دیا سارا فریب رنگ و بوئے باغِ حسن
ہم تو عاجز آگئے ہیں دیدۂ ادراک سے

تنکے تنکے آشیاں میرا کیا تو نے تو کیا
میں نشیمن پھر بنا لوں گا اسی خاشاک سے
~~~~~~

سینکڑوں میں میں تجھے پہچان لوں گا پردہ پوش
چال سے، انداز سے، گفتار سے، پوشاک سے
منعِ مے نوشی کی خاطر میکدے جاتے ہیں شیخ
آدمی معلوم ہوتے ہیں مجھے چالاک سے
نالہ گر رُکتا نہیں پیدا نہیں ہوتا سرود
نغمۂ غم کیا سناؤں سینۂ صد چاک سے
اک نظر پہلے اِدھر پھر زلف میں کرنا اسیر
صید اگر زخمی نہیں چھٹ جائے گا فتراک سے
دخترِ رز کو لباسِ جام و مینا ہے عبث
اس کی عریانی نہیں چھپتی کسی پوشاک سے

~~~~~~

خیالِ جام رہا عادتِ شراب کے ساتھ
میں بادہ کش ہوں مگر حسنِ انتخاب کے ساتھ
زبانِ خلق سے مٹ جائے لذّتِ عصیاں
مزا ذرا سا ملا دے اگر ثواب کے ساتھ
وہ دیکھنے تو لگے ہیں مجھے چرا کے نظر
حجاب ٹوٹ رہے ہیں مگر حجاب کے ساتھ
فقط فریب خد و خالِ حسن باقی ہے
جو چیز صبر شکن تھی گئی شباب کے ساتھ
غریقِ یاس ہوا دل یہ آرزو تو نہیں
اُبھر رہی ہے جو رہ رہ کے ہر حباب کے ساتھ
دلِ غریب سے ان آنسوؤں کی لذت پوچھ
نکل رہے ہیں جو فریادِ مستجاب کے ساتھ
~~~~~~

غمِ حیات شریکِ غمِ محبت ہے
ملا دیئے ہیں کچھ آنسو مری شراب کے ساتھ
بس اب تو حضرتِ دل کیجیے کرم مجھ پر
جہاں میں خوار ہوا ہوں بہت جناب کے ساتھ

~~~~~~

ذوقِ ستم کشی سے وہ لاچار ہو گئے
عاجز مری وفا سے ستم گار ہو گئے
پی ہے یہ کس کی چشم سے صہبائے آرزو
کیوں آج ارغواں ترے رخسار ہو گئے
اِک بار کی تھی عرضِ تمنّا میں کچھ کمی
اور حُسن کی نظر میں گنہگار ہو گئے
اک شمعِ دل کے بجھتے ہی زنداں ہوئی حیات
وہ جتنے سامنے تھے وہ دیوار ہو گئے
تنقید اب یہ ہے کہ مٹا کر کمالِ غیر
اپنے سخن کے آپ پر ستار ہو گئے

~~~~~~

دل میں ارماں کی وہی جلوہ گری باقی ہے
شام کے وقت بھی نورِ سحری باقی ہے
تو نہ چھوڑے گی اُسے بھی مگر اے دیدۂ تر
وہ جو اک قطرۂ خونِ جگری باقی ہے
دل ہے جب تک مرے پہلو میں غمِ دہر ہو کیوں
ایک مینا ابھی صہبا سے بھری باقی ہے

پھر بہار آئے گی لے کر گل و جام و مے و مہر
چند دن اور یہ دورِ قمری باقی ہے
میری اُلفت نے انھیں کر تو لیا ہے اپنا
اب فقط شرم کی سینہ سپری باقی ہے

~~~~~

دُور ہی سے دل ہی دل میں ہم تمھیں چاہا کیے
بند کر لی آنکھ اور پہروں تمھیں دیکھا کیے
کب تلک امید پر کوئی جیے اے بے وفا
عمر گزری اعتبارِ وعدۂ فردا کیے
ظلمتِ دنیا میں جلوے تھے ترے مستور کچھ
ہم چراغِ زندگی لے کر جنھیں ڈھونڈا کیے
مختصر اپنی حدیثِ زیست یہ ہے عشق میں
پہلے تھوڑا سا ہنسے پھر عمر بھر رویا کیے
اپنا دردِ دل سمجھنے کی یہاں فرصت کسے
ہم تو اوروں کا تڑپنا دیکھ کو تڑپا کیے
وہ ہمارے عشق کو سمجھے کرشمہ حسن کا
حُسن کو ہم اک فریبِ آرزو سمجھا کیے

~~~~~

تری ہستی سے منکر ہوتے جاتے ہیں جہاں والے
سنبھال اپنی خدائی کو ارے او آسماں والے
اک احساسِ فضیلت، برتری کی دل میں اک خواہش
قفس کو تیلیاں دیتے ہیں شاخِ آشیاں والے

نہ ڈھونڈو اپنے شیداؤں میں تم فرہاد و مجنوں کو
زمانے میں نہیں ملتے یہ عاشق داستاں والے
رہِ ہستی ملقینِ بے بصر کو اک مہم ہوگی
سفر کا لطف لوٹیں گے تو وہ وہم و گماں والے
ترے کوچہ میں سب مشتاق اِک جلوے کے بیٹھے ہیں
نظر والے، جگر والے قلم والے، زباں والے
وہی ذوقِ تجسس ہے، وہی جوشِ تقاضا ہے
ابھی آدم کے تیور ہیں وہی باغِ جناں والے
انھیں نادانیِ رہبر سے میں نے کیوں کیا واقف
خفا اس بات پر مجھ سے ہیں میرے کارواں والے

میں فقط انساں ہوں ہندو مسلماں کچھ نہیں
میرے دل کے درد میں تفریقِ ایماں کچھ نہیں
دو دلوں کو اک نظر نے کر دیا تا زیست ایک
اور الفت کی زباں میں عہد و پیماں کچھ نہیں
چند موجیں بحرِ غم کی آگئیں ساحل تلک
میری آنکھوں تک جو آیا ہے یہ طوفاں کچھ نہیں
کہہ گئی کیا آکے اس کے کان میں بادِ بہار
گل کی یہ حالت ہے فکرِ جیب و داماں کچھ نہیں
خوں کا ہر قطرہ متاعِ آفرینش سے ہے پُر
میرے دل میں قیمتِ لعلِ بدخشاں کچھ نہیں
وسعتِ صحرا لیے پھرتا ہے اپنے ساتھ ساتھ
دل وہ دیوانہ ہے جس کو خوفِ زنداں کچھ نہیں

چھیڑتے ہو کیوں مجھے کیوں پوچھتے ہو حالِ دل
کیا مرے رنگِ تبسّم سے نمایاں کچھ نہیں

~~~~~~

پیریِ انساں کا منظر سخت درد انگیز ہے
یہ کھنڈر سب سے سوا دنیا میں عبرت خیز ہے
تو فریبِ چشمِ ساقی میں دلِ ناداں نہ آ
ظاہرا یہ جم ہے باطن میں مگر چنگیز ہے
کامرانی عشق میں فرہاد ہمت سے نہیں
خندہ زن تیشہ پہ تیرے حیلۂ پرویز ہے
عرصۂ ہستی میں سارا دل پہ ہے دارومدار
ہے یہی راکب، یہی مرکب یہی مہمیز ہے
آہنِ قسمت نہیں کاٹے سے کٹتا عقل کے
یہ چھری بس خونِ دل کرنے میں بیشک تیز ہے
زندگی کا کون سا جلوہ نگاہِ گل میں ہے
دل تو ہے صد چاک لیکن لب تبسّم ریز ہے

~~~~~~

فرق جو کچھ ہے وہ مطرب میں ہے اور ساز میں ہے
ورنہ نغمہ، وہی ہر پردۂ آواز میں ہے
ترجمانِ غمِ دل کون ہے اشکوں کے سوا
اک یہی تارِ شکستہ تو مرے ساز میں ہے
مرغِ آزاد اسیروں کو حقارت سے نہ دیکھ
ان کی طاقت بھی ترے بازوے پرواز میں ہے

ایک لے دے کے تمنا ہے سو وہ بھی ناکام
دل میں کیا ہے جو تری جلوہ گہِ ناز میں ہے
دل کو دیوانہ سمجھ کر نہ بہت چھیڑو تم
کہیں کچھ کہہ نہ اُٹھے یہ حرمِ راز میں ہے

ــــــ

نظر ہوگی تو ہم تیشہ میں جوئے شیر دیکھیں گے
کفِ معمار میں بام و درِ تعمیر دیکھیں گے
محبت فرق کھو دیتی ہے اعلیٰ اور ادنیٰ کا
رُخِ خورشید میں ذرّہ کی ہم تنویر دیکھیں گے
بڑھے گا سلسلہ جب ارتباطِ ملک و مِلّت کا
تو اس زنجیر کو اک روز عالمگیر دیکھیں گے
کریں گے تابہ امکاں پردہ پوشی رازِ اُلفت کی
رہیں گی بند آنکھیں اور تری تصویر دیکھیں گے
کسی کو ہم نہ روندیں گے اگر راہِ ترقی میں
تو ہر اک خاک کے ذرّے کو دامنگیر دیکھیں گے
تری تقدیر میں لکھی ہے اے فرہاد ناکامی
دلائے گی تجھے کیا چیز جوئے شیر دیکھیں گے
پھریں گے تان کر سینہ اسی دم تک عدو اپنے
نہ جب تک ایک جا باہم کمان و تیر دیکھیں گے

ــــــ

کسی کی یاد آ آکر مجھے تڑپا ہی جاتی ہے
شرارِ زندگانی کو مرے بھڑکا ہی جاتی ہے
کہاں سے طاقتِ دیدار لاتے حضرتِ موسیٰ

جب اُلفت دل میں ہوتی ہے نظر شرما ہی جاتی ہے
نہیں چھپتا چھپانے سے ہنر ذرکا ہنر اے گل
تری بُو سارے گلشن میں صبا پھیلا ہی جاتی ہے
اگر کچھ سوز ہے دل میں تو خوبیِ حسنِ پنہاں کی
نگاہِ شوق کو اپنی جھلک دکھلا ہی جاتی ہے
نہیں محتاج ہے حرفِ بیاں کی فطرتِ شاعر
جو دل میں بات آتی ہے زباں تک آ ہی جاتی ہے

امید و شوق کا مسکن تمناؤں کی منزل تھا
کبھی یہ دل بھی اپنا دل کہے جانے کے قابل تھا
دلِ حسرت زدہ کس کو یقیں اس کا دلائیں ہم
کبھی اپنی امنگوں پر مدارِ اہلِ محفل تھا
مقامِ بے خودی تک لے گئے پہلے تمنا کو
قدم پھر جس طرف رکھا نشانِ راہِ منزل تھا
خدا جانے دعا تھی یا شکایت لب پہ بسمل کے
نظر سوئے فلک تھی ہاتھ میں دامانِ قاتل تھا
تری قدرت پہ حرف آتا ہے میں اس کو نہ مانوں گا
کہ یہ سارا جہانِ رنگ و بو اک نقشِ باطل تھا
جوانی جاتے ہی دستورِ سابق پر حیات آئی
بس اک دو روز کا ہنگامۂ بیتابیِ دل تھا
مگر آزادیِ تخئیل دنیا کو نہیں بھاتی
جسے اس بزم میں دیکھا اسیرِ رنگِ محفل تھا

رمزِ اُلفت مشکل میرے کوئی سمجھا ہی نہیں
آج تک میں نے اُسے جی بھر کے دیکھا ہی نہیں
عشق پر موقوف کچھ دل کی تمنّا ہی نہیں
قصّۂ یوسف میں اِک بابِ زلیخا ہی نہیں
ننگ رسوائی ہو جس کو جذبۂ مجنوں نہیں
چھپ سکے جو پردۂ مینا میں صہبا ہی نہیں
اب یہ عصیاں ہے تو ہو میں کیا کروں مجبور ہوں
بات پر دل کی نہیں کرنا تو سیکھا ہی نہیں
دلدہی عاشق کی بھی کرتے تو کیا کچھ عیب تھا
ان سے لیکن کیا گلہ یہ رسمِ دنیا ہی نہیں
تولتے ہیں جنس میزانِ زیاں و سود میں
دہر کے بازار میں الفت کا سودا ہی نہیں
پوچھتے ہیں لوگ بزمِ شعر میں یہ کون ہے
کیا کوئی اہلِ سخن اپنا شناسا ہی نہیں

یاد ہمدم نہ دلا عشق کے افسانوں کی
بات دیوانہ سے کرتے نہیں دیوانوں کی
حسنِ صورت پہ نہ ہوگی ہے رحمت تقسیم
قدرِ گل دیکھ کے کی جائے گی پیمانوں کی
قفل اندر سے لگائے گئے زندانوں میں
اُف تمنّائے اسیری ترے دیوانوں کی
نہ امیروں کو میسّر نہ غریبوں کو نصیب
نیند بے خوف و خطر وہ ترے دیوانوں کی

جذبۂ عشق بھی اک صورتِ خود بینی ہے
ڈھونڈتا جلوۂ دل شکل میں بیگانوں کی

پھر ہوسِ نظارہ کر بزمِ جمالِ یار میں
پہلے نظر کو تاب دے آتشِ انتظار میں
ڈھونڈ رہا ہوں تجھ کو میں حسن کی ہر نمود میں
ہر گلِ تو بہ ہے نظر انجمنِ بہار میں
ایک جگر کا سوز و ساز کشمکشِ امید و یاس
ایک فسانۂ حیات دفن ہے ہر مزار میں
اشک تمام کر چکے نالے زباں تک آگئے
کون تڑپ رہا ہے اب خاطرِ بے قرار میں
یا تو مری نظر میں اب صیقلِ آرزو نہیں
زنگ سا آگیا ہے یا آئینۂ بہار میں
تلخیِ زیست عشق سے دور نہ ہو سکی مگر
پھول تو کچھ کھلا دئے دامنِ کوہسار میں

غمخواریٔ سائل بھی تو اگر کو سکھا دے
دولت جنھیں دیتا ہے انھیں دل بھی خدا دے
صیاد ستم توڑ چکا اب تو رہا کر
بیداد ہوئی ختم تو اب دادِ وفا دے
رحمت تجھے کرنی ہے تو شایانِ کرم کر
دینا ہے تو یوں دے کہ امیدوں سے سوا دے

دردِ دلِ انساں اسے نغمے تو سُنائے
زاہد کو یہ فرصت بھی مگر یاد خدا دے
ساقی کی نگاہوں میں تو مجرم نہ بنوں گا
ٹوٹیں گے تو ٹوٹیں مرے توبہ کے ارادے
کیا مصلحتِ حسن اجازت نہیں دیتی
تو جلوہ گہِ راز کے پردوں کو اُٹھا دے
جلووں کی تمنا ہے تو اشکوں کو پئے جا
کچھ روز ابھی آئینۂ دل پہ جلا دے
روکے گی تجھے آپ تری غیرتِ تعمیر
تو پھر سے بنانے کے لیے چاہے مٹا دے

~~~~~~

کبھی تو اے شاہدِ نہانی یہ پردۂ رنگ و بو اُٹھا دے
میں اپنی آنکھوں کو بند کرلوں تو اپنا جلوہ مجھے دکھا دے
کہاں ہے اے بلبلِ نوا سنج نالۂ درد چھیڑ ایسا
ہر ایک غنچے کو اس چمن کے ترانۂ آرزو سنا دے
بھرا ہوا رنج و غم سے بیٹھا ہوں تو کہاں ہے رفیقِ صادق
یہ چارہ گر سارے ناسمجھ ہیں ذرا مجھے چھیڑ کر رُلا دے
وہ اور ہیں طالبانِ کوثر مرے لیے ساقیا فقط تو
ذرا سی اُلفت کی چاشنی لے کے شربتِ درد میں ملا دے
جگر میں جن کے ہے تابِ عصیاں وہی سمجھتے ہیں رازِ ہستی
رہِ طلب میں جو گامزن ہیں بنیں گے فرزیں وہی پیادے
تبسمِ گل کا منتظر ہے سرودِ جادو نوائے بلبل
کوئی نسیمِ سحر سے کہہ دے کہ جا کے غنچوں کو گدگدا دے
~~~~~~

اصولِ ایماں حصولِ دنیا، فریبِ دانش، خیالِ عزت
یہ سب اگر دل کا پاس کچھ ہے تو آتشِ عشق میں جلا دے
خرد کی آنکھوں کو بند کر اور دیکھ پھر جلوہ ہائے پنہاں
بہار تاروں کی لوٹنی ہے تو شمعِ خورشید کو بجھا دے
بہت میں بیباک ہو گیا ہوں کہیں نہ مستی میں کہہ اٹھوں کچھ
کسی بہانے بھی مناسب ہے بزم سے مجھ کو تو اٹھا دے

مجھ کو غمِ انساں کی حقیقت نظر آئی
دنیا ابھی محتاجِ محبت نظر آئی
آنکھوں میں ہے اک گورِ غریبانِ تمنّا
ہر اشک میں اک شوق کی تربت نظر آئی
تم جس کو سمجھتے ہو کہ ہے حسن تمھارا
مجھ کو تو وہ اپنی ہی محبت نظر آئی
بلبل کے لیے چار طرف دام بچھے ہیں
ہر پھول میں صیّاد کی نیت نظر آئی
آئینۂ ہستی کو بہت غور سے دیکھا
مجھ کو تو کدورت ہی کدورت نظر آئی
تیرے پرِ پرواز میں اے طائرِ آزاد
مرغانِ قفس کی مجھے طاقت نظر آئی
دی وعدۂ فردا کی مجھے اُس نے تسلّی
مجھ کو یہ تسلّی بھی غنیمت نظر آئی
پھر چھیڑنے آئیں اُنھیں خورشید کی کرنیں
ذرّوں کی چمکتی ہوئی قسمت نظر آئی

تمہید کسی حسرتِ تازہ کی نہ ہو یہ
پھر آج اُمنگوں پہ طبیعت نظر آئی

~~~~~

دل ہے دیوانہ تو ناصح اس کو سمجھانے سے کیا
یہ کہاں کی عقل ہے لڑتا ہے دیوانے سے کیا
دو دلوں میں اب ہمیشہ کے لیے اک درد ہے
یا خدا ہوتا ہے دو نظروں کے مل جانے سے کیا
ناتواں کی بے گناہی بھی نہیں آتی ہے کام
پستی ہے آسیا کچھ پونچھ کر دانے سے کیا
حسن کے جلوے نہیں محتاجِ چشمِ آرزو
شمع جلتی ہے اجازت لیکے پروانے سے کیا
اپنے اشکوں کو بچائے جا کام آئیں گے ترے
یہ گہر اک کم نظر دنیا کو دکھلانے سے کیا
وسعتِ بزمِ جہاں میں ایک ساقی تک تو خیر
کام رندوں کا چلے گا ایک پیمانے سے کیا

~~~~~

اختلافِ دین و ملت میں بھی ہے اک ربط سا
کچھ ورق سب پا گئے ہیں ایک افسانے سے کیا
مہر وہ ہے خاک کے ذرّے جو کر دے زر نگار
اونچی اونچی چوٹیوں پر نور برسانے سے کیا

~~~~~

پہلے دھوکے سے دیے کچھ مری بینائی نے
پھر اُسے ڈھونڈ نکالا دلِ ہرجائی نے
~~~~~

نازو انداز نے شوخی نے نہ رعنائی نے
حسن کو حسن کیا چشمِ تماشائی نے
ان کو معلوم مرا جذبۂ نہاں نہ ہوا
ساتھ جب تک کہ دیا طاقتِ گویائی نے
ذرہ ذرہ پہ لکھا ہے مرا افسانۂ دل
پہلے تقصیر نے پھر ذوقِ جبیں سائی نے
حدِ تکمیل کو پہنچی تری رعنائیِ حُسن
جو کسر تھی وہ مِٹا دی تری انگڑائی نے
خلوتِ دل کے لیے بھی کوئی جلوہ رکھا
حسن تیری ہوسِ انجمن آرائی نے

میں ہوں دلِ پُر شوق ہے اور کوئی حسیں ہے
یہ خواب کی باتیں کوئی سنتا تو نہیں ہے
اس ضد کا کسی کی کوئی چارہ بھی کہیں ہے
اک بار زباں پر جو نہیں ہے تو نہیں ہے
مائل بہ ستم چرخ زمیں بر سرِ کیں ہے
آخر مری دنیائے تمنا بھی کہیں ہے
ایک جام شکستہ میں ہیں کچھ قطرۂ رنگیں
اور جی میں ہے گویا کہ جہاں زیرِ نگیں ہے
دل مرکزِ احساس ہے ایذائے جہاں کا
لگ جائے کہیں چوٹ مگر درد یہیں ہے
شک اُس کے کرم پر ہے گناہوں سے جھجکنا
مومن تو وہی ہے جسے رحمت کا یقیں ہے

مایوس نہ ہو عشق، تغافل بھی ہے اک ناز
خود حسن بھی اس کے لیے تیار نہیں ہے
مانا کہ وہ بے درد ہے بے مہر و وفا ہے
سو بات کی اک بات تو یہ ہے کہ حسیں ہے
دم بھر کی نمائش ہے وہ قطرہ جو ہے گل پر
جو خاک میں ملتا ہے وہی رزقِ زمیں ہے
صبر آنے کو آجائے مجھے حسرتِ دل پر
لیکن یہ تقاضائے جوانی تو نہیں ہے
اک نغمۂ خوابیدہ ہے ہر سازِ جگر میں
اس بزم میں مضرابِ محبت بھی کہیں ہے

پیہم رہِ طلب میں مشکل کا سامنا ہے
ہر گام پر فریبِ منزل کا سامنا ہے
بحرِ حیات حسبِ ہمت نہیں ہر اک سو
نظریں ذرا اُٹھیں اور ساحل کا سامنا ہے
تیرے حجاب کی بھی کچھ انتہا ہے آخر
لیلےٰ کے بھیس میں بھی محمل کا سامنا ہے
ہنس ہنس کے تخم بو کر رخصت ہوئی جوانی
پیری ہے اور کشتِ حاصل کا سامنا ہے

رہینِ شیب، غرورِ شباب دیکھ لیا
جہاں کا سب سے بڑا انقلاب دیکھ لیا

نہ کر سکی نظر انداز ایک جلوہ بھی
تجھے بھی اے نگہٗ انتخاب دیکھ لیا
کلیم کچھ تو کہو تم معاف گستاخی
وہی مثل ہے کہ گونگے نے خواب دیکھ لیا
بتا تو دو مجھے طرزِ ادائے سجدۂ شکر
کبھی دعا کو مگر مستجاب دیکھ لیا

کوئی نامہرباں اب مہرباں ہے
کہاں ہے عمرِ رفتہ تو کہاں ہے
ہجومِ یاس میں محصور جاں ہے
فریب آرزو کا امتحاں ہے
محبت ایک رسمِ دوستاں ہے
مگر اس دور میں رائج کہاں ہے
کوئی منزل نہیں راہِ طلب میں
وہی منزل ہے جس جا کارواں ہے
ہوس نکلے مگر پوری نہ نکلے
محبت کا یہی رازِ نہاں ہے
جو دل میں ہے وہی کہتا ہوں لب سے
جو لب پر ہے وہ نظروں سے عیاں ہے
قفس والے نہ گل دیکھیں نہ سبزہ
نظر جتنی ہے صرف آشیاں ہے
گیا اور پھر کیا عرضِ تمنا
محبت ہے تو خودداری کہاں ہے

جو اک نیلا سا دھبّا دور پر ہے
اسیروں کی زباں میں آسماں ہے
گلِ خنداں ابھی غافل ہے شاید
وہی گلچیں بھی ہے جو باغباں ہے
گزرنا دیکھ کر رہ رو ادھر سے
کہیں پر اک مزارِ بے نشاں ہے

~~~~~

یا یہی کہہ دے کہ راحت تری قسمت میں نہیں
مجھ کو دینا ہے تو دے آج قیامت میں نہیں
حرف گیری مری ہر بات پہ کرنے والے
کون سی بات ہے جائز جو محبت میں نہیں
شرح دل خاک کرے رسم کی پابند زباں
ہاں کی اکثر مترادف ہے محبت میں نہیں
دلِ بیتاب کا اندازِ بیاں ہے ورنہ
شکر میں کون سی شے ہے جو شکایت میں نہیں
کون کہتا ہے نظر آئے نہ شکلِ راحت
آئے پھر آئے مگر خواب کی صورت میں نہیں
ایک کوتاہ نظر ایک ذرا دور اندیش
فرق کچھ زاہد و مے نوش کی نیت میں نہیں

~~~~~

اور کوئی امتحانِ عشق کی صورت نہ تھی
حسن کے انکار میں انکار کی نیت نہ تھی

یہ مری قسمت کہ نظروں میں تمھاری ہیچ ہے
ورنہ یہ جنسِ وفا اتنی تو کم قیمت نہ تھی
شیخ مَیں اور ترکِ عصیاں وہ بھی جنّت کے لیے
جب خطا کی تھی مرے قبضہ میں کیا جنّت نہ تھی

~~~~~

آثارِ دورِ حاضر اتنا بتا رہے ہیں
ہم جن کے منتظر ہیں وہ دن بھی آ رہے ہیں
پھر اشک سے نظر میں کچھ ڈبڈبا رہے ہیں
بھولے فسانے شاید دوہرائے جا رہے ہیں
یہ بھی ہے کامیابی اک عرضِ مدّعا کی
اب وہ مری نظر سے آنکھیں چُرا رہے ہیں
خونِ جگر کے قطرے اور اشک بن کے ٹپکیں
کس کام کے لیے تھے، کس کام آ رہے ہیں

~~~~~

اضطرابِ روح

اک زمانہ وہ بھی آتا ہے کہ ہر فردِ بشر
شاہ ہو یا بندۂ بیکس ، غنی ہو یا فقیر
دہر کو اور اس کی چیزوں کو سمجھتا ہے حقیر
جلوۂ موہوم کی مشتاق رہتی ہے نظر
اک زمانہ وہ بھی آتا ہے کہ عزّ وجاہ و مال
سب میسر ہیں مگر تسکینِ جاں ہوتی نہیں
آرزو جو دل میں ہے دل پر عیاں ہوتی نہیں
شوق دکھلاتا ہے اِک دھندلی سی تصویرِ خیال
اک زمانہ وہ بھی آتا ہے کہ انساں کی ہوس
لذّتِ کون ومکاں سے سیر ہوتی ہی نہیں
چاہتی ہے چھوڑ کر دنیا کو اڑ جائے کہیں
طائرِ دل کو جہاں معلوم ہوتا ہے قفس
اِک زمانہ وہ بھی آتا ہے کہ ساماں عیش کے
سب بہم ہیں صحبتِ یاراں مگر بھاتی نہیں
شکلِ راحت بھی جمالِ شوق دکھلاتی نہیں
دل ترستا ہے نہ جانے کس تجلّی کے لیے
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی دلیل اس بات کی
خوابِ ہستی کے لیے بیداریٔ فردا بھی ہے
اپنی دنیا کے علاوہ اور اک دنیا بھی ہے

چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے جھلک جس کی کبھی
دل میں انساں کے جو اک کیفیتِ سیماب ہے
کوئی جلوہ اور دامانِ عدم میں ہے نہاں
ختم دنیا پر نہیں ہے زندگی کی داستاں
روح کیا اپنے وطن کی یاد میں بیتاب ہے

انسان

کون ہے میرے سوا مالکِ افلاک و زمیں　　نورِ فردا ہے نہاں جس میں وہ میری ہے جبیں
قصۂ دہر میں لیکن مجھے معلوم نہیں　　اہرمن ہوں کہ سلیماں ہوں کہ خاتم کا نگیں
طور ہوں جذبۂ موسیٰ ہوں کہ فرعون ہوں میں
لبِ خاموش بتا دے یہ مجھے کون ہوں میں

مجھ پہ کھلتا ہی نہیں کچھ مری قسمت کیا ہے　　پردۂ نقشِ ازل میں مری صورت کیا ہے
عقل کیا چیز ہے ارماں کی حقیقت کیا ہے　　میں ہوں مخلوق کہ خالق مری فطرت کیا ہے
دستِ فرہاد ہوں یا تیشۂ فرہاد ہوں میں
آپ بہزاد ہوں یا خامۂ بہزاد ہوں میں

اپنی تقدیر کا بندہ بھی ہوں مختار بھی ہوں　　طالبِ دید بھی ہوں کشتۂ دیدار بھی ہوں
دردِ الفت کا مسیحا بھی ہوں بیمار بھی ہوں　　محفلِ دہر میں ساقی بھی ہوں میخوار بھی ہوں
بندگی دل میں کبھی ہے تو ہے الحاد کبھی
باغِ فردوس کبھی، گلشنِ شدّاد کبھی

نورِ جاں پیکرِ خاکی میں فروزاں کیوں ہے　　مجھ میں پنہاں ہے تو پھر مجھ سے گریزاں کیوں ہے
جسم اور روح کا آپس میں یہ پیماں کیوں ہے　　عقل سے شوق مرا دست و گریباں کیوں ہے
دوست کس کو کہوں کس کو کہوں دشمن اِن میں
رہنما کون ہے اور کون ہے رہزن اِن میں

میں مدد غیر سے لوں یہ مرا دستور نہیں　　مثلِ پروانہ کے جینا مجھے منظور نہیں
گو شبِ تار ہے اور رہ میں کوئی نور نہیں　　میں جو بھٹکا بھی تو جاؤں گا بہت دور نہیں

میرے سینہ میں ہے عصیاں کی تجلی باقی
دلِ مضطر کو ہے اتنی تو تسلی باقی

وارثِ دہر کہیں یہ دلِ شیدا تو نہیں! خضرِ ظلماتِ جہاں نورِ تمنا تو نہیں!
زندگی نام کہیں ذوقِ طلب کا تو نہیں! رازِ ہستی دلِ عاشق کا تقاضا تو نہیں!
بحر کہتے ہیں جسے ہم کہیں ساحل ہی نہ ہو
راہ اب تک جسے سمجھے ہیں وہ منزل ہی نہ ہو

ترانۂ گنہگار

فطرتِ نا شکیب ہوں خاطرِ بیقرار ہوں   روحِ پُر اضطراب ہوں دیدۂ اشکبار ہوں
کشتۂ آرزو ہوں میں ، محوِ تلاشِ یار ہوں   سینہ ریش ریش ہوں دامن تار تار ہوں
روزِ ازل سے طالبِ جلوۂ آشکار ہوں

میں ہوں شہیدِ جستجو تابِ دوام مجھ سے ہے   خندۂ صبح مجھ سے ہے گریۂ شام مجھ سے ہے
محفلِ روزگار کا حسنِ نظام مجھ سے ہے   لطفِ صراحی و مے وشیشہ و جام مجھ سے ہے
میکدۂ حیات میں کیفیتِ خمار ہوں

اہلِ طرب کے واسطے بزمِ نشاط خیز ہوں   طالبِ زخم کے لیے معرکۂ ستیز ہوں
میں ہوں کبھی شرر فشاں اور کبھی مشک بیز ہوں   گاہ میں فتنہ خیز ہوں ، گاہ میں نغمہ ریز ہوں
سیلِ رواں ہوں دشت میں باغ میں جوئبار ہوں

مجھ کو نہ دیر سے غرض اور نہ کچھ حرم سے کار   میری حیات سے مراد ایک ہے بس تلاشِ یار
میری امید و بیم کا اپنی ہی دل پہ ہے مدار   میں ہوں نہ طالبِ بہشت اور نہ طائفِ مزار
بوجھ ہوں خاک ہی کا میں اور نہ فلک کا بار ہوں

میری نظر وسیع میرا خیال ہے بلند   خاطرِ ناصبور کو خوفِ مآل ناپسند
گوشۂ چشم میں نہاں صورتِ اشک تا بچند   چڑھ کے مژہ پہ ایک بار دیکھ لوں سب کشادو بند
یا تو سپردِ خاک ہوں یا دُرِ شاہوار ہوں

مجھ میں نہاں ترا وجود ، مجھ سے عیاں ترا ظہور   عکسِ سیاہ میں ترا ، تو ہے مرا جمالِ نور
میری نظر پہ کس لیے ہے یہ حجابِ نزد و دور   ایک نہ ایک روز میں اس کو اُٹھاؤں گا ضرور
چشمِ پُر آرزو پسِ پردۂ انتظار ہوں

ختم بس اک اڑان پر ہمتِ بال و پر نہیں   موت مری حیات کا خاتمۂ سفر نہیں
جورِ سحر کو ظلمتِ شام سے کچھ خطر نہیں   میری فنا فنا نہیں ، مجھ کو خزاں کا ڈر نہیں
گلشنِ کائنات میں قافلۂ بہار ہوں

میری شکست ہے ضرور نورِ جمال دیکھ کر　　آپ لرز رہا ہوں میں اپنا مآل دیکھ کر
ابر سیاہ کی مثال برسرِ کوہسار ہوں
مجھ کو نہیں خطا کی شرم سامنے تیرے اے خدا　　میں ہوں تری شبیہ ایک اس کو بگاڑ یا بنا
میرے لیے یہ ننگ ہے ڈھونڈوں کسی کا آسرا　　میں ہوں نہ پیروِ مسیح اور نہ مُریدِ مصطفا
اپنے ہی دوش پر لیے اپنی خطا کا بار ہوں
لذتِ درد کون دے لطفِ وصال کے لیے　　میں نے تو چھوڑ دی بہشت تابِ خیال کے لیے
روح مری ہے مضطرب اپنے جمال کے لیے　　جلوۂ دو جہاں ہے کم چشمِ سوال کے لیے
آرزوئے کلیم کی دہر میں یادگار ہوں
نقش بر آب ہوں مگر عشق کا رازدار ہوں　　ہوں تو ذرا سی مشتِ خاک برق سے ہمکنار ہوں
تو بھی بجھا نہ پائے گا جس کو میں وہ شرار ہوں　　ہستیِ بے ثبات ہوں، جلوۂ پائدار ہوں
جس میں ہے شانِ کردگار میں وہ گناہ گار ہوں

شاعر

جلوہ حسنِ نہانی کا طلب گار ہوں میں
قصر دل جس نے بنایا ہے وہ معمار ہوں میں
آپ شیدا ہے جو اپنا وہ پرستار ہوں میں
اپنی تخئیل کے پھندے میں گرفتار ہوں میں
قسمت انسان کی مضمر مرے جذبات میں ہے
چشمہ آبِ بقا میرے خیالات میں ہے

کب مری فکرِ رسامائل افلاک نہیں
عزم پرواز پہ کب خاطر بیباک نہیں
طبع میری کبھی راغب سوئے خاشاک نہیں
میری تخمیر میں آمیزشِ گل خاک نہیں
عالمِ غیب کی آواز ہے کانوں میں مرے
رقصِ ہستی کی ہے جھنکار ترانوں میں مرے

محرم اسرار حقیقت کا کوئی ہے تو وہ میں
ترجماں دل کی حکایت کا کوئی ہے تو وہ میں
آئینہ حسن کی صورت کا کوئی ہے تو وہ میں
پردہ در خوبیِ فطرت کا کوئی ہے تو وہ میں
جلوہ زن شاہد معنی مرے آہنگ سے ہے
رنگ سب گلشن ہستی کا مرے رنگ سے ہے

شکل تصویر میں لیلےٰ کی عیاں میری ہے
لب فرہاد پہ فریاد و فغاں میری ہے
اس میں بھی خوبیٔ انداز بیاں میری ہے
نام مجنوں کا کیا جس نے زباں میری ہے
زیر و بم نغمۂ ہستی کا ہے تاروں پہ مرے *
ہے نظر ایک زمانہ کی اشاروں پہ مرے

رہروِ شوق کی میرے کوئی منزل ہی نہیں
میں وہ دریا ہوں جو شرمندۂ ساحل ہی نہیں
جس کو کہتے ہیں سکوں وہ کبھی حاصل ہی نہیں
ایک آفت ہے یہ سینہ میں مرے دل ہی نہیں
اس کو جلووں سے فقط کام نگینوں سے نہیں
یہ وفا حسن سے کرتا ہے حسینوں سے نہیں

میرے سینہ میں ہے جب تک دلِ شیدا باقی
دل میں جب تک ہے تب و تابِ تمنا باقی
چشمِ ارماں میں ہے جب تک کوئی جلوا باقی
جستجو کا بھی رہے گا یہی سودا باقی
ساتھ لایا ہوں میں اپنے یہی تقدیر اپنی
ہاں ابھی یاد ہے وہ خلد کی تقصیر اپنی

طالبِ شمع بنوں مجھ کو جو مل جائے شرر
شمع مل جائے تو پیدا ہو خیالِ اختر

٭

ہاتھ لگ جائے جو اختر تو ہو سودائے قمر
ماہ کے بعد رہے مہر کی خوبی پہ نظر
جو شہر جائے کہیں پر وہ مری فکر نہیں
میرے مذہب میں قناعت کا کہیں ذکر نہیں

قیدِ دستور سے آزاد ہے فطرت میری
مانتی ہی نہیں دنیا کی طبیعت میری
ایک عالم سے جدا ہے رہِ الفت میری
میرے سینہ کی امنگوں میں ہے قسمت میری
منحرف مجھ سے زمانہ ہو تو کچھ دور نہیں
بات ٹل جائے مگر دل کی یہ منظور نہیں

داستاں عشق و محبت کی سناؤں کیوں کر
مے الفت نہ پیوں خود تو پلاؤں کیوں کر
چہرۂ حُسن سے پردہ کو اٹھاؤں کیوں کر
جلوہ دیکھوں نہ اگر خود تو دکھاؤں کیوں کر
قیمتِ تازگی فکرِ سخن لیتا ہوں
اس میں کیا عیب ہے کچھ پھول جو چُن لیتا ہوں

خاطرِ جمع بہ ایں راہ پریشاں کردم
نقدِ جاں باختم و صدقہ ایماں کردم
بود ہر آں کہ زہوش و خرد ارزاں کردم
تادلے رابکف آرم ہمہ قرباں کردم

بہ لبِ شوق ہے لذتِ تلخیست مرا
مایۂ زیست ہمیں سینۂ زخمیست مرا

آتشِ طور شرارِ غمِ دیرینۂ من
جامِ جمشید یکے پارۂ آئینۂ من
گر تو خواہی کہ بری فیض زگنجینۂ من
لحظۂ چشم بگرداں طرفِ سینۂ من
"شاعرم حکم بہ پہنائے دو عالم دارم
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم دارم"

جامِ حیات

(کف)

دورِ گردوں کو مری مرضی پہ چلنا چاہیے
اس کو میرے ہر اشارے پر بدلنا چاہیے
آفتابِ زندگی دنیا ہے جس کی منتظر
اُس کو میرے مشرقِ دل سے نکلنا چاہیے
مستحق ہو جائے گی پھر زیست کہلانے کی زیست
پہلے میرے شوق کے سانچے میں ڈھلنا چاہیے
خونِ دل کا جوشِ ارماں میں تقاضا ہے یہی
داستانِ طور کی سُرخی بدلنا چاہیے
پھر خزاں آئے تو آئے لیکن اے بادِ بہار
ایک دن شاخِ تمنا کو بھی پھلنا چاہیے
چاہے پھر بہہ جائے اس کے ساتھ خونِ زندگی
دل میں جو کانٹا چُبھا ہے وہ نکلنا چاہیے
شمع کی صورت اجل آئے تو جوشِ زیست میں
اپنے جلووں کی فراوانی سے جلنا چاہیے
زندگی اُس کی ہے خطروں میں کٹی جس کی حیات
موت کی آغوش میں ہستی کو پلنا چاہیے
بزمِ ہستی آرزوؤں پر مری تنظیم ہو
میرے پیمانے سے ہر میکش کو مے تقسیم ہو

(مے)

دل جلا کر سوزِ دل دنیا کو دکھلانے میں ہے
لطف جینے کا تڑپنے اور تڑپانے میں ہے
کہہ گیا پروانۂ جانباز رازِ زندگی
شعلۂ ہستی میں جل کر خاک ہو جانے میں ہے
جوئے شیرِ آرزو ہر دل میں ہے لطفِ حیات
اپنی جان تک کو ہکن بنکر اُسے لانے میں ہے
سونگھ کر کوئی مسل ڈالے تو یہ ہے گُل کی زیست
موت اس کے واسطے ڈالی پہ کھلانے میں ہے
حیف اس مے پر کہ رات آخر ہوئی اور وہ ابھی
انتظارِ رند میں لبریز پیمانے میں ہے
تو نہ سمجھا ہے نہ سمجھے گا کبھی ساحل نشیں
کیا مزا موجوں میں گھِر کر غرق ہو جانے میں ہے
شاہراہِ عقل و دیں بیشک ہے بے خوف و خطر
ہاں مگر لطفِ سفر اس سے بھٹک جانے میں ہے
اشک پی جانے میں لذّت ہے مگر اتنی کہاں
جو انھیں نوکِ مژہ تک لا کے ٹپکانے میں ہے
اپنے دل کی اپنے ارمانوں سے کر نشوونما
ہاں نہال زندگی پنہاں اسی دانے میں ہے
چاندنی دل کی خرد کی دھوپ میں کھلتی نہیں
نور تاروں کا چراغِ مہر بجھ جانے میں ہے

پیاس شربت سے بُجھانا ہے تو جا دیر و حرم
ہاں مگر جو چیز صہبا ہے وہ میخانے میں ہے
نورِ ہستی سامنے ہے چشمِ دل عُریاں تو کر
ایک بار اور ڈرنے والے جرأتِ عصیاں تو کر

(درد)

وہ ارادے سب ترے جوشِ فراواں کیا ہوئے
اپنی دنیا خود بنا لینے کے ارماں کیا ہوئے
زیست ظالم زیست نے ایک ایک کر کے چُن لیے
میری امیدوں کے وہ گلہائے خنداں کیا ہوئے
گوشۂ داماں تلک آئے فقط دو چار اشک
وہ متاعِ شوق کے لعلِ بدخشاں کیا ہوئے
جگمگاتی تھی کبھی اپنی بھی دنیائے خیال
ہائے وہ چشمِ تصور کے چراغاں کیا ہوئے
درد بڑھتا ہی گیا عمرِ رواں کے ساتھ ساتھ
درد کو درماں بنا لینے کے ساماں کیا ہوئے
جہدِ ہستی نے نہ دی فرصت کہ پڑھ لیں ایک شعر
حفظ تھے جو دل کو وہ دیواں کے دیواں کیا ہوئے
چار ہی دن میں ہوا تبدیل عنوانِ سخن
اے زبانِ عشق تیرے عہد و پیماں کیا ہوئے
کچھ گل پژمردہ باقی ہیں فقط اب یادگار
وہ اُمنگوں کے پھلے پھولے گلستاں کیا ہوئے

ایک صحرا سی نظر آتی ہے ہر سو زندگی
وہ فریب آرزو کے کاخ و ایواں کیا ہوئے
رفتہ رفتہ ہو گئے آلائشِ عصیاں کی نذر
وہ عقیدے وہ اصول پاک ایماں کیا ہوئے
ہمت جوش جوانی بن گئی اب مصلحت
کیا ہوئے دنیا سے وہ لڑنے کے پیماں کیا ہوئے
خون دل کی کیفِ مستی میں روانی اور ہے
زندگی کچھ اور ہے خوابِ جوانی اور ہے

تم مجھے بھول جاؤ گے

(1)

تم مجھے بھول جاؤ گے

رہ نہ سکے گا عمر بھر آج کا جوشِ اضطراب آرزوؤں میں آئے گا کوئی ضرور انقلاب
پھر کوئی دوست ڈھونڈ ہی لے گی نگاہِ انتخاب زیست ہے زیست، دل ہے دل، اور شباب پھر شباب

عہدِ وفا ہے ایک خواب
تم مجھے بھول جاؤ گے

(2)

تم مجھے بھول جاؤ گے

جس کی تجلیوں سے تھی بزمِ امید حشر خیز جس کے تبسموں سے تھا سازِ حیات نغمہ ریز
جس کے نفس نفس سے تھی محفلِ دوش مشک بیز رکھ کے کبھو جگر پہ ہاتھ آج بھی ہے وہی عزیز

وقت ہے کچھ عجیب چیز
تم مجھے بھول جاؤ گے

(3)

تم مجھے بھول جاؤ گے

رسم جہاں ہے انقلاب، دور کا نام کائنات دم کوئی لے سکے کہیں اتنا سکوں بھی دے حیات
آرزوؤں کی دل میں ہے ایک سجی ہوئی برات ایک نگاہ اک اُمنگ، ایک امنگ، ایک رات

ہستی عشق بے ثبات
تم مجھے بھول جاؤ گے

(4)

تم مجھے بھول جاؤ گے

کوئی کسی کی یاد میں حشر تلک جیا نہیں تیرِ نظر کی چوٹ سے کوئی کبھی مرا نہیں
بن کے کھرنڈ کون سا داغِ جگر اُڑا نہیں سنگِ لحد کو توڑ کر سبزہ کہاں اُگا نہیں

غم کوئی لادوا نہیں
تم مجھے بھول جاؤ گے

(5)

تم مجھے بھول جاؤ گے
پھر سے نگار خانۂ شوق کو تم سجاؤ گے پھر کسی بت کے واسطے فرشِ نظر بچھاؤ گے
آج کی بات کو کبھی خواب میں بھی نہ لاؤ گے نام مرا اگر کوئی لے گا* تو مسکراؤ گے
تم مجھے بھول جاؤ گے
تم مجھے بھول جاؤ گے

دوشیزہ کا راز

آج کا دن زندگانی میں ہے میری بہتریں
اس کو میں سب سے الگ دل میں کروں گی جاگزیں
قدر کیوں اتنی ہے اس کی یہ بتاؤں گی نہیں
یہ مگر سچ ہے دلاتی ہوں تمھیں اس کا یقیں
دہر میں جب تک یہ صبحِ خوشگوار آئی نہ تھی
گلشنِ جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

تازگی بادِ صبا میں کل تلک ایسی نہ تھی
آسماں پر یہ چمک میں نے کبھی دیکھی نہ تھی
دل میں یہ ارماں نہ تھے ارماں میں یہ گرمی نہ تھی
ہاں مگر کل تک میں دل کی آرزو سمجھی نہ تھی
اب کھلا مجھ پر مرادوں پر شباب آتا ہے کیوں
آج میں سمجھی کہ غنچہ پھول ہو جاتا ہے کیوں

آج کا دن یہ تو ممکن ہے کہ ہو نازِ بہار
ختم اس پر ہے یہ مانا میں نے موسم کا نکھار
ہے نشاطِ قلب کا کچھ اور لیکن ذمہ دار
راز اپنا میں نہیں کرنے کی ہرگز آشکار
بات یہ جز گل کسی کو میں نے بتلائی نہیں
رازداں ایسا ہے جس میں عیب گویائی نہیں

میں سمجھتی تھی . نہ کل تک مدعاے زندگی
میرے کانوں تک نہ پہونچی تھی نواے زندگی
مجھ سے پنہاں تھی شبیہ جا نفزاے زندگی
عشق نے کھولے نہ تھے بندِ قباے زندگی
دل مرا دنیا کی باتوں میں ذرا لگتا نہ تھا
آئینہ میں حسن تک اپنا بھلا لگتا نہ تھا

بے خبر فطرت سے اپنی خاطرِ معصوم تھی
یہ جو اک دل میں تڑپ ہے کل تلک معدوم تھی
آرزو اپنی مجھے اتنی فقط معلوم تھی
کوئی لذت تھی کہ جس سے زندگی محروم تھی
اب حقیقت زیست کی مجھ پر ہویدا ہو گئی
کل تلک انگور تھی میں آج صہبا ہو گئی

کل بھی دل سینہ میں تھا ہاں یہ دلِ پُر خوں نہ تھا
کل تلک میرے صدف میں گوہرِ مکنوں نہ تھا
کل بھی تھا مجھ کو مذاقِ زیست لیکن یوں نہ تھا
کوئی جادو تھا پیامِ دیدۂ مجنوں نہ تھا
دل میں ہوک اُٹھی لبوں پر مسکراہٹ آ گئی
رُخ پہ رنگ آیا نگاہوں میں لگاوٹ آ گئی

اب اُمنگیں اور ہیں جوشِ طبیعت اور ہے
زندگی کی خوابِ ارماں میں حقیقت اور ہے
گلشنِ ہستی کی اب نظروں میں صورت اور ہے

گُل کی نکہت اور ہے سبزہ کی رنگت اور ہے
کیا بتاؤں کون سا جلوہ مری آنکھوں میں ہے
اک نئی دنیا کا نظارہ مری آنکھوں میں ہے

مجھ سے کہتی ہیں مری ہم جولیاں اکثر یہی
مرد ہیں سارے کے سارے بیوفا، خود مطلبی
آج ہے جس کی خوشامد اُس سے کل ہے بے رُخی
اُن کے بہکانے میں آتی میں مگر ایسی نہ تھی
یا تو اُن کے حسن میں میری سی رعنائی نہ تھی
یا کبھی ان پر کسی کی طبع یوں آئی نہ تھی

خواہشِ محبوب فطرت کا تقاضا ہے اگر
پردہ داری کس لیے جذبات کی ہے اس قدر
اپنے دل کی آرزوئیں کیوں چھپاتا ہے بشر
یا الٰہی کون سا الفت میں ہے ایسا اثر
تابِ خاموشی نہیں اور فکر چُپ رہنے کی ہے
شوق بھی کہنے کا ہے اور شرم بھی کہنے کی ہے

لو نہ جانے کیا کہے جاتی ہوں اپنے جوش میں
میں نہیں ہوں غالبًا اس وقت اپنے ہوش میں
اب نہ آئے گی صدا میری کسی کے گوش میں
راز کو اپنے چھپاؤں گی لبِ خاموش میں
ہاں مگر جب تک یہ صبحِ خوشگوار آئی نہ تھی
گلشنِ جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

اقبال سے شکوہ

تو کعبہ کا دلدادہ تھا تو بت خانہ میں کیوں آیا
مے سے تجھ کو پرہیز اگر تھا مے خانہ میں کیوں آیا
گر تیری چشمِ باطن میں نورِ حسنِ صحرائی تھا
تو گلشن میں آ کر پھر کیوں محوِ نغمہ پیرائی تھا
ہندی ہونے پر ناز جسے کل تک تھا حجازی بن بیٹھا
اپنی محفل کا رند پرانا آج نمازی بن بیٹھا
اے بلبل چھوڑ کے شاخِ گل کیوں خار و خس میں بیٹھا ہے
کیا ذوقِ اسیری ہے تجھ کو جو جا کے قفس میں بیٹھا ہے
محل میں چھپا ہے قیسِ حزیں دیوانہ کوئی صحرا میں نہیں
پیغامِ جنوں جو لایا تھا، اقبال، وہ اب دُنیا میں نہیں

تیرے جامِ دل کی صہبا اب کوثر میں تبدیل ہوئی
مذہب کے ہاتھوں خون تری پاکیزگیِ تخئیل ہوئی
افسوس کہ تیری فکرِ فلک پیما کا یہ انجام ہوا
تُو تو فردوس کا طائر تھا کیوں آ کے اسیرِ دام ہوا
تو وہ قطرہ تھا جو اشکِ اربابِ نظر بن سکتا تھا
تو جا کے صدف میں کیوں بیٹھا یونہی گہر بن سکتا تھا
تیری چشمِ کوتہ بیں میں ایماں کے سوا جلوا ہی نہیں
جو نورِ دلِ انساں میں ہے غافل تو نے دیکھا ہی نہیں
اب ہندو اور مسلماں کی دنیا کو کون ضرورت ہے
مذہب آئندہ نسلوں کا توع انساں کی خدمت ہے

جس کو ایماں کہتا ہے تو پردہ ہے تری نادانی کا
اللہ ترا کیا ہے اک نام فقط جہلِ انسانی کا
اپنی رسوائی کا باعث تعلیم یہ 'میں' اور 'تو' کی ہے
انسان کی ترقی کی دشمن تفریق یہ رنگ و بو کی ہے
میرا بس ہو تو ہر مسجد سے روے زمین کو پاک کروں
ہر مندر کو مسمار کروں ہر ایک کلیسا خاک کروں
مذہب کی مینا کے قابل اے رند تری صہبا ہی نہیں
پوشاک جو تو نے پہنی ہے قامت پہ ترے زیبا ہی نہیں
آ محفل کو اپنا کر لے دیرینہ طرزِ سخن سے پھر
ہر لب پہ دعا آتی ہے یہی چھوٹے خورشید گہن سے پھر

محبّانِ وطن کا نعرہ

شہیدِ جورِ گلچیں ہیں اسیر خستہ تن ہم ہیں
ہمارا جرم اتنا ہے ہوا خواہِ چمن ہم ہیں
ستانے کو ستالے آج ظالم جتنا جی چاہے
مگر اتنا کہے دیتے ہیں فردائے وطن ہم ہیں
ہمارے ہی لہو کی بو صبا لے جائے گی کنعاں
ملے گا جس سے یوسف کا پتہ وہ پیرہن ہم ہیں
ہمیں یہ فخر حاصل ہے پیامِ نور لائے ہیں
زمیں پہلے پہل چومی ہے جس نے وہ کرن ہم ہیں
سلالے گی ہمیں خاک وطن آغوش میں اپنی
نہ فکرِ گور ہے ہم کو نہ محتاجِ کفن ہم ہیں
بنالیں گے ترِے زنداں کو بھی ہم غیرتِ محفل
لیے اپنی نگاہوں میں جمالِ انجمن ہم ہیں
نہیں تیشہ تو سر ٹکرا کے جوئے شیر لائیں گے
بیابانِ جنوں میں جانشینِ کوہکن ہم ہیں
زمانہ کر رہا ہے کوششیں ہم کو مِٹانے کی
ہلا پاتا نہیں جس کو وہ بنیادِ کُہن ہم ہیں
نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ عہدہ ہے نہ طاقت ہے
مگر کچھ بات ہے ہم میں کہ جانِ انجمن ہم ہیں
ترے خنجر سے اپنے دل کی طاقت آزمانا ہے
محبت ایک اپنی ہے ترا سارا زمانا ہے

فدائے ملک ہونا حاصلِ قسمت سمجھتے ہیں
وطن پر جان دینے ہی کو ہم جنت سمجھتے ہیں
کچھ ایسے آ گئے ہیں تنگ ہم کنج اسیری سے
کہ اب اس سے تو بہتر گوشۂ تربت سمجھتے ہیں
ہمارے شوق کی وارفتگی ہے دید کے قابل
پہنچتی ہے اگر ایذا اُسے راحت سمجھتے ہیں
نگاہِ قہر کی مشتاق ہیں دل کی تمنائیں
خطِ چینِ جبیں ہی کو خطِ قسمت سمجھتے ہیں
وطن کا ذرّہ ذرّہ ہم کو اپنی جاں سے پیارا ہے
نہ ہم مذہب سمجھتے ہیں نہ ہم مِلّت سمجھتے ہیں
حیاتِ عارضی صدقے حیاتِ جاودانی پر
فنا ہونا ہی اب ایک زیست کی صورت سمجھتے ہیں
ہمیں معلوم ہے اچھی طرح تابِ جفا تیری
مگر اس سے سوا اپنی حدِ الفت سمجھتے ہیں
غم و غصہ دکھانا اک دلیلِ ناتوانی ہے
جو ہنس کر چوٹ کھاتی ہے اُسے طاقت سمجھتے ہیں
غلامی اور آزادی بس اتنا جانتے ہیں ہم
نہ ہم دوزخ سمجھتے ہیں نہ ہم جنت سمجھتے ہیں
دکھانا ہے کہ لڑتے ہیں جہاں میں باوفا کیوں کر
نکلتی ہے زباں سے زخم کھا کر مرحبا کیوں کر

بیسوا

خوار ہوں بدنام ہوں، رسوا سر بازار ہوں
خاطرِ نازک پہ اہلِ بزم کی اک بار ہوں
کوئی مونس ہی نہیں جس کا میں وہ بیمار ہوں
میں وہ گل ہوں جو زمانہ کی نظر میں خار ہوں
اہلِ دنیا مجھ سے تم اتنے خفا رہتے ہو کیوں ؟
میں تو خود مظلوم ہوں مجھ کو بُرا کہتے ہو کیوں ؟

سچ کہو تم نے کبھی اس بات کی پرسش بھی کی
قصۂ غم میرا سننے کی کبھی خواہش بھی کی
چشم رحمت میں مرے عیبوں کی گنجائش بھی کی
میرا دردِ دل سمجھنے کی کبھی کوشش بھی کی
قابلِ نفریں ہمیشہ مجھ کو سمجھا ہی کیے
مجھ پہ انگشتِ حقارت تم اُٹھایا ہی کیے

مجھ کو دیکھو میں تمھارے عیب کا پردا رہی
آبرو والے رہو تم اس لیے رُسوا رہی
زندگی بھر اک دلِ ہمدرد کی جویا رہی
جائے عبرت ہے کہ میں محفل میں بھی تنہا رہی
جُز ہوس کی جہاں میں اور کچھ دیکھا نہیں
سینکڑوں عشاق کوئی چاہنے والا نہیں

کچھ غلط سمجھی ہے دنیا نے رہِ الفت مری
دیکھتا کوئی نہیں محرومیِ قسمت مری
نورِ ظاہر میں نہاں ہے سوزشِ فطرت مری
زندگی اس بزم میں ہے شمع کی صورت مری
شوق کی نظروں سے آخر تک مجھے دیکھا کیے
میں نے جل کر جان دی جلوا اُسے سمجھا کیے

مجھ سی بد قسمت زمانے میں کوئی لڑکی نہیں
ماں کی الفت باپ کی صورت کبھی دیکھی نہیں
کون شے معصومیت ہے میں یہ سمجھی ہی نہیں
میرے عہدِ زیست میں دیباچۂ طفلی نہیں
خاک و خوں میں گوہرِ فطرت مرا رُلتا رہا
حُسن میرا گاہکوں کی آنکھ میں تلتا رہا

جب مرادوں پر ذرا میرا شباب آنے لگا
اک ذرا نظروں میں میری جب حجاب آنے لگا
کچھ سمجھ میں جب تمنّا کا حساب آنے لگا
جاگتی آنکھوں میں اک اُلفت کا خواب آنے لگا
مجمعِ عشاق میں سرگوشیاں ہونے لگیں
کھل گیا نیلام میرا بولیاں ہونے لگیں

حسن کو تسخیر کرنے عشق بدبیں آگیا
اپنی نظروں میں لیے پیغامِ شیریں آگیا

بو الہوس صیّاد لے کر دام زرّیں آگیا
گُل ابھی کھلنے نہ پایا تھا کہ گلچیں آگیا
آنکھ جب کھولی تو دیکھا آبرو باقی نہ تھی
وقت جب کھلنے کا آیا گل میں بو باقی نہ تھی

جب مرے حسن جوانی سے دل اُن کے بھر گئے
یا جب اپنا نام و مال و زور وزر سب ہر گئے
اپنے اپنے عیب سارے میرے ذمّے دھر گئے
مجھ کو میرے چاہنے والے ہی رسوا کر گئے
بار عصیاں ایک عالم کا مری گردن پہ ہے
داغ یہ میرا نہیں ہے جو مرے دامن پہ ہے

دہر میں سب سے بڑا مجرم جو ہے وہ مرد ہے
بیوفائی میں ہے یکتا دلبری میں فرد ہے
لب پہ ہے اظہار بیتابی مگر دل سرد ہے
بے مروت، خود غرض، پیماں شکن بیدرد ہے
آہ از تیرِ جفاے اُلفتِ بیباکِ اُو
ہم چو ماخچیر صدہا، بستۂ فتراکِ اُو

مجھ سے اے پردہ نشیں حالت تری بہتر نہیں
گھر میں رہ کر بھی ترا مردوں کے دل میں گھر نہیں
آشنا پرواز کی لذت سے تیرے پر نہیں
مے سے پُر ہو کر بھی گردش میں ترا ساغر نہیں

آبرو میں نے تو کھوئی آب و دانے کے لیے
تو نے آزادی بھی کھو دی آشیانے کے لیے

مثل تیرے میں اسیر حلقۂ زنجیر ہوں
عورتوں کی بے کسی کی میں بھی اک تصویر ہوں
رحم کے قابل ہوں میں شرمندۂ تقصیر ہوں
مجھ سے یوں نفرت نہ کر میں بھی تری ہمشیر ہوں
گوہر نسوانیت کے کچھ نشاں مجھ میں بھی ہیں
عیب ہیں مجھ میں جہاں کچھ خوبیاں مجھ میں بھی ہیں

اپنے ہاتھوں اپنی ہستی کو مٹانا مجھ سے سیکھ
ہنستے ہنستے آگ دامن میں لگانا مجھ سے سیکھ
سوزِ خاطر کو زمانے سے چھپانا مجھ سے سیکھ
سینکڑوں غم لیکے دل میں مسکرانا مجھ سے سیکھ
زندگی اپنی مجھے گو اک نظر بھاتی نہیں
میری پیشانی پہ بھولے سے شکن آتی نہیں

اُس کی درگاہِ کرم پر ایک سائل میں بھی ہوں
گو کہ ہوں جامِ شکستہ زیبِ محفل میں بھی ہوں
اپنے ساقی کی نظر میں ظرف قابل میں بھی ہوں
درد سے واقف ہوں میں بھی صاحبِ دل میں بھی ہوں
مجھ میں اور تجھ میں تجلّی ہے وہی مستور ایک
شمعِ محفل اور چراغِ خانہ میں ہے نور ایک

اِنقلاب زندہ باد

شوق ہوا بے حجاب ختم ہوا دورِ خواب
آگیا روزِ حساب قوم کا چمکا شباب
زندہ باد انقلاب
انقلاب زندہ باد

سُرخیِ عنوانِ ما جذبۂ پنہانِ ما
ہم دل و جانِ ما گوہرِ دامانِ ما
آیتِ ایمانِ ما
انقلاب زندہ باد

فتنہ وشر تابہ کے دورِ قہر تابہ کے
طاعتِ زر تابہ کے خونِ ہنر تابہ کے
زیر وزبر تابہ کے
انقلاب زندہ باد

کب تک اسیرِ محن کو ہکنِ خستہ تن
خردِ پُر مکر و فن خندہ زن و کام زن
طرح جہان برفگن
انقلاب زندہ باد

جہلِ وکدورت مِٹا شان و رعونت مِٹا
جوشِ خصومت مِٹا زخمِ حکومت مِٹا
رنج و صعوبت مٹا
انقلاب زندہ باد

دور ہو سب ایک بار تفرقۂ روز گار
مفلس و سرمایہ دار بندہ و بااختیار

کشمکشِ گیرو دار
انقلاب زندہ باد

توڑ پرانا نظام دائرہ خاص و عام
بندشِ قوم و مقام دے یہ جہاں کو پیام
لے کے اخوت کا نام
انقلاب زندہ باد

پھر سے لگا اک چمن سروِ گل و یاسمن
قمریِ شیریں دہن جب ہو وہاں نغمہ زن
گونجے فضائے وطن
انقلاب زندہ باد

صبح ہو جب آشکار از طرفِ کوہسار
گل کو سنائے ہزار یہ خبرِ خوشگوار
وعدۂ فصلِ بہار
انقلاب زندہ باد

سہل کُن مشکلات قوم کی راہِ نجات
دہر کا رازِ حیات فلسفۂ کائنات
لاکھ سخن ایک بات
انقلاب زندہ باد

بہار کی رات

آمری جان جلد آ، بس یہی رُت ہے پیار کی
دل میں کھلی ہے چاندنی رات بھی ہے بہار کی

(1)

چشمہِ عشق بھی اگر　　موج زناں رہے مدام
پہونچے نہ کچھ اسے ضرر　　از گزرِ صباح و شام
پھر تو ضرور ہر بشر　　بن کے رہے غلامِ عشق
اپنی حیات وجاہ وزر　　وقف کرے بہ نامِ عشق
ایک ہی رنگ پر مگر　　سوزشِ اندروں نہیں
تاب و تبِ غمِ جگر　　بے خبرِ سکوں نہیں
اس لیے اے مری حیات
مجھ کو پسند ہے یہ بات
ساتھ رہیں بس ایک رات
ہو وہ مگر بہار کی
آمری جان جلد آ، بس یہی رُت ہے پیار کی

(2)

جب ہوئے یار دو جدا　　نالہ کناں و اشک بار
سمجھے کہ زخم وہ لگا　　اب نہ بچے گی جانِ زار
جب گئے چند دن گزر　　آپ قرار آگیا
جس پہ فدا تھی جاں نظر　　گر وہی یار آگیا
اب نہ وہ دل میں جوش ہے　　اب نہ وہ لب پہ آہ ہے
آتشِ جاں خموش ہے　　شوق بھی کم نگاہ ہے

اس لیے اے مری حیات
مجھ کو پسند ہے یہ بات
ساتھ رہیں بس ایک رات
ہو وہ مگر بہار کی
آمری جان جلد آ، بس یہی رُت ہے پیار کی

(3)

مل گئے دو حبیب جب — پڑھنے لگے وہ بابِ عشق
صبح و مسا و روز و شب — حفظ ہوئی کتابِ عشق
ہو گئی سیر جب ہوس — کرنے لگے وہ خونِ عشق
بن گیا آشیاں قفس — ختم ہوا جنونِ عشق
زیست کے سانحات میں — رہ نہ سکا خمارِ عشق
کشمکشِ حیات میں — خاک ہوئی بہارِ عشق

اس لیے اے مری حیات
مجھ کو پسند ہے یہ بات
ساتھ رہیں بس ایک رات
ہو وہ مگر بہار کی
آمری جان جلد آ، بس یہی رُت ہے پیار کی

(4)

بنتے ہیں جو وفا شعار — کہتا ہوں ان سے صاف صاف
قول کا ان کے اعتبار — مجھ کو نہیں خطا معاف
ایک سے تابہ زندگی — عشق بشر کی خو نہیں
شوق میں جب ہوس نہیں — پھر وہ نہیں عیارِ عشق
تاب کُنِ قفس نہیں — طائرِ بے قرارِ عشق

اس لیے اے مری حیات
مجھ کو پسند ہے یہ بات
ساتھ رہیں بس ایک رات
ہو وہ مگر بہار کی
آ مری جان جلد آ، بس یہی رُت ہے پیار کی
دل میں کھِلی ہے چاندنی رات بھی ہے بہار کی

مہاتما گاندھی کا خیر مقدم

یہ کس کی زیارت کا ہمیں آج شرف ہے؟
تعظیم میں کس ہستیِ اعظم کی یہ صف ہے؟
کیوں آج مری لب پہ صداقت کا حلف ہے؟
کیا روئے سخن حضرتِ گاندھی کی طرف ہے؟
نکلے گی جو دل سے میں وہی بات کہوں گا
آج اپنے تصور سے ذرا کام نہ لوں گا

اے طبعِ تکلف ترا نبھنے کا نہیں آج
اندازِ بیاں تیرا پنپنے کا نہیں آج
جو رنگِ صداقت کوئی جمنے کا نہیں آج
مضموں کوئی الفاظ میں چھپنے کا نہیں آج
سب ساز الگ زینتِ تقریر کے رکھ دے
آج اپنے کلیجے کو فقط چیر کے رکھ دے

آمد ہے تری آج نشیمن میں ہمارے
ہر چار طرف جشن ہے گلشن میں ہمارے
جو داغ تھے اب پھول ہیں دامن میں ہمارے
انداز ترانے کا ہے شیون میں ہمارے

سینوں میں ہمارے ہے کبھی فخر کبھی شرم
گہہ تیری طرف چشم ہے گہہ اپنی طرف چشم

لذت تری باتوں میں ہے صہبائے وطن کی
ہونٹوں پہ ہنسی ہے گلِ رعنائے وطن کی
آنکھوں میں تجلی سی ہے فردائے وطن کی
تو ایک جھلک ہے رخِ زیبائے وطن کی
ہستی پہ تری ناز ہو جتنا ہمیں کم ہے
اس ملک کی قسمت ترے ماتھے پہ رقم ہے

تو معنیٔ انساں ہے حمیّت کی ہے تصویر
تو شرح محبت کی، اخوت کی ہے تفسیر
امید وطن کی تری ہمت پہ ہے تعمیر
تو قوم کی تدبیر ہے تو ملک کی تقدیر
آنکھوں میں نہاں ہیں تری جلوے ابھی کچھ اور
برسے ہوئے بادل میں ہیں قطرے ابھی کچھ اور

اس خاک کو عزت ہے ترے نقشِ قدم سے
صحرائے وطن رشکِ چمن ہے ترے دم سے
بڑھ کر ترا رتبہ ہے کسی قیصروجم سے
تو اپنے لیے کیا ہے یہ پوچھے کوئی ہم سے
از تو ہمہ دیوانگیٔ محفلِ ماہست
تو شیشہ و تو ساغر و تو بادہ و تو مست

یاروں کو ابھی خواہش انعام بہت ہے
کم حبِ وطن ہے ہوسِ نام بہت ہے
دیوانگیِ عشق بد انجام بہت ہے
شوریدگیِ ولولۂ خام بہت ہے
ہر لب پہ فقط اپنی ستائش کا سخن ہے
ہر پھول سمجھتا ہے وہی نازِ چمن ہے

تو نے یہ سبق خدمتِ قومی کا سکھایا
جو لب سے کہا پہلے اُسے کر کے دکھایا
یوں عشقِ زبانی تو بہت سب نے بتایا
ہاں وقت پڑا جب تو توہی سامنے آیا
تیرا سا ہمیں چاہنے والا نہ ملے گا
ہمت کا دھنی قول کا سچا نہ ملے گا

تو مہر برتتا رہا دشمن کی جفا پر
صدمے تجھے کیا کیا ہوئے غیروں کی خطا پر
آیا نہ کبھی حرف ترے صدق و صفا پر
ہستی تری تفسیر ہے آئینِ وفا پر
تو اپنے عدو سے بھی کدورت نہیں رکھتا
یکانہ دل جوئے الفت نہیں رکھتا

اک زیست وطن کے لیے قربان کی ساری
اک زندگی انسان کی خدمت میں گزاری

پلّہ ہے تری ذات سے اس ملک کا بھاری
مغرب سے کوئی جا کے کہے بات ہماری
تہذیب میں تیری ہے بشر بھی کوئی ایسا
ہے تیرے خزانے میں گُہر بھی کوئی ایسا

موتی لال نہرو

موجزن ہونے لگا تھا جب ذرا دریاے قوم
کچھ اثر جب کر چلا تھا نشۂ صہباے قوم
جب نظر آنے لگی تھی منزل فرداے قوم
اُٹھ گیا دنیا سے اپنا رہنما اے واے قوم
پھول جب کھلنے کو تھے صحن چمن ویراں ہوا
مہر اپنا جب سحر ہونے کو تھی پنہاں ہوا

ہم نے تیرے واسطے سجدے کیے زاری بھی کی
دست بستہ التجاے رحمتِ باری بھی کی
دوستوں نے ہو سکی جو ناز برداری بھی کی
موت سے لڑنے کی تو نے آپ تیاری بھی کی
سب مگر بے سود نیت آسماں کی اور تھی
مصلحت اس کار سازِ دو جہاں کی اور تھی

اپنے خوں سے لکھ گیا تو سُرخیِ عنوانِ قوم
دھو گیا اپنے عمل سے دفترِ عصیانِ قوم
آفریں صد آفریں ہمت پہ تیری جانِ قوم
مٹ کے راہِ قوم میں پورا کیا پیمانِ قوم
جان دینی ملک پر مر کر ہمیں سکھلا گیا
موت میں بھی ایک شانِ زندگی دکھلا گیا

جب مرتب ہوگا افسانہ ترا ہندوستاں
نامِ نہرو سُرخ حرفوں میں رقم ہوگا وہاں
عہدِ آزادی کی دو جلدوں میں ہوگی داستاں
یعنی تیری اور 'جواہر' کی سوانح عمریاں
کچھ تری باتیں ہیں کچھ تیرے پسر کا ذکر ہے
قوم کی تاریخ بھی تیرے ہی گھر کا ذکر ہے

ماؤں سے پوچھیں گے جب بچے وطن کے ہونہار
ہندِ نَو کا کون تھا پہلا مُدبّر باوقار
نقش کس کا اپنے سینوں میں بنائیں پایدار
یک زباں ہو کر وہ تیرا نام لیں گی بار بار
مے رہے گی سب کے پیمانوں میں تیرے جام کی
مہر ہوگی سکّہِ قومی پہ تیرے نام کی

مثل تیرے اب رموزِ سلطنت سمجھے گا کون
ہاتھ نبضِ قوم پر تیری طرح رکھے گا کون
نقدِ جوشِ دل عیارِ قوم پر پرکھے گا کون
طاقتِ پر خواہشِ پرواز میں تولے گا کون
تو ہی اک محرم تھا سب کے پردہ ہائے ساز کا
نغمہ سارا تھا تری گونجی ہوئی آواز کا

تیری فطرت میں نہاں تھا کون سا ایسا گہر
ہاتھ جس ذرّہ پہ رکھا وہ ہوا رشکِ قمر

بن گیا کھدّر بھی تیرے جسم پر ملبوسِ زر
عیب خوبی بن کے کھلتے تھے ترے انداز پر
اک ادائے دلبری تھی فتنہ سامانی تری
ایک شانِ خسروی تھی چینِ پیشانی تری

یوں طبیعت میں تری کیا کیا اُبال آتا نہ تھا
بحث میں کیا کیا تجھے غیض و جلال آتا نہ تھا
ہاں مگر دل میں کبھی تیرے ملال آتا نہ تھا
خاطرِ نازک کے آئینہ میں بال آتا نہ تھا
ایک ہی چھینٹے میں سب گردِ کدورت ڈھل گئی
اک گھٹا آئی، گھری، گرجی، برس کر کھل گئی

اپنے زخموں کے لیے تو طالب مرہم نہ تھا
جز خیالِ قوم تیرے دل میں کوئی غم نہ تھا
بے خبر فکر وطن سے تو کبھی اک دم نہ تھا
ہم کو ایک ایک دم ترا اک زندگی سے کم نہ تھا
تیرے خُم میں چار قطروں سے سوا باقی نہ تھا
ہاں مگر اُن کا بدل محفل میں اے ساقی نہ تھا

کون کہتا ہے ہمیں اس سانحہ کا غم نہیں
موت تیری اک بلائے ناگہاں سے کم نہیں
جہدِ آزادی میں لیکن فرصتِ یک دم نہیں
ہاں صفِ میداں کے شایاں محفلِ ماتم نہیں

اپنے سینوں میں ابھی جوشِ تمنا ہے وہی
چشم پر نم ہے مگر تابِ تقاضا ہے وہی

عہد حبِ قوم کا باندھا ہے دل سے استوار
اب تو آزادی مقدر میں ہے یا کنجِ مزار
آرہے ہیں لفظ یہ اپنی زباں پر بار بار
پڑھ کے تیری لاش پر جاتے ہیں سوئے کارزار
شد فدا بر ملک تا نامِ وطن پائندہ باد
مرد میرِ لشکرِ ما، میر لشکر زندہ باد

1936

غزلیات

(1)

تو خفا اور بہار کے دن ہیں
ارے ظالم یہ پیار کے دن ہیں

حسن کی سادہ لوحیاں ہیں ابھی
عشق پر اعتبار کے دن ہیں

گل غنیمت سمجھ یہ شورِ چمن
پھر سکوتِ ہزار کے دن ہیں

عہدِ شوخی کسی کا ختم ہوا
نگہِ شرمسار کے دن ہیں

مستیٔ عشق ایک رات کی ہے
پھر شکستِ خمار کے دن ہیں

زیست اک نام دن گزرنے کا
ہم ہیں اور انتظار کے دن ہیں

ابھی پختہ نہیں جنونِ عشق
قلب پر اختیار کے دن ہیں

وہ بھی آتے ہیں بن کے شکلِ بہار
وہ جو خونِ بہار کے دن ہیں

اب تو بھولو حدیثِ دل ملاؔ
یادِ پروردگار کے دن ہیں

(2)

بجل بجھی جب شمعِ دل پیغامِ شام آیا تو کیا
مر چکی جب پیاس ساقی لے کے جام آیا تو کیا

تابِ جلوہ بھی تو ہو وہ سوئے بام آیا تو کیا
چشمِ موسیٰ لے کے عشقِ تشنہ کام آیا تو کیا

کر دیا اک بار اس کا پیکرِ خاکی تو سرخ
خونِ دل گر خنجرِ قاتل کے کام آیا تو کیا

مدعائے دل سمجھ لیں گے اگر چاہیں گے وہ
میرے ہونٹوں تک سوالِ نا تمام آیا تو کیا

اک نگاہِ خاص کا طالب ہوں تجھ سے ساقیا
جامِ مے مجھ تک بہ طرزِ فیضِ عام آیا تو کیا

گر چکی اک بار جب بجلی نگاہِ شوق پر
طور کی چوٹی سے پھر کوئی پیام آیا تو کیا

منزلِ گورِ غریباں کے نہ جاگے کچھ نصیب
صحنِ گلشن میں کوئی محشر خرام آیا تو کیا

ظرفِ سائل بھی بدل اے رحمتِ سائل نواز
مے سے پُر ان کانپتے ہاتھوں میں جام آیا تو کیا

پُر ہے تیرے ذکر سے اپنی حدیثِ زندگی
اس میں بھولے سے کہیں دل کا بھی نام آیا تو کیا

وہ نگاہِ تلخ جب خونِ تمنا کر چکی
پھر تصور میں کوئی شیریں کلام آیا تو کیا

خونِ دل ضائع نہ ہو مجھ کو تو اتنی فکر ہے
اپنے کام آیا تو کیا غیروں کے کام آیا تو کیا

ہیں ابھی خاکسترِ ملا میں کچھ چنگاریاں
شعلۂ ہستی قریبِ اختتام آیا تو کیا

(3)

یہی اک حُبِّ قومی کا اصولِ مختصر جانا
وطن کے واسطے جینا، نہ جی سکنا تو مر جانا
وفا سے دل نہ باز آنا، جفاؤں سے نہ ڈر جانا
نہ جینے دے تجھے دنیا تو مٹ کر نام کر جانا
کسی بیکس کی تربت ڈھونڈنے گورِ غریباں میں
جدھر کوئی نہ جاتا ہو اُدھر بھی اے نظر جانا
ہر اک صورت پہ دھوکا کھا رہی ہیں تیری صورت کا
ابھی آتا نہیں نظروں کو تاحدِ نظر جانا
اسی کا نام جینا ہے جگر خوں ہو تو ہو جائے
نقوشِ دہر میں اک خاص اپنا رنگ بھر جانا
وہی میں ہوں، وہی دل ہے، وہی مایوسیاں ملا
زمانہ کو فقط اک بات آتی ہے گزر جانا

(4)

ہر شورشِ حیات سے بدظن بنا دیا
دنیا کو اہلِ امن نے مدفن بنا دیا
گلہائے شوق پھر بھی سمائے نہ چشم میں
حالاں کہ ہر نگاہ کو دامن بنا دیا
لے ہی لیا اسیروں نے دیوانگی سے کام
زنداں میں سر کو پھوڑ کے روزن بنا دیا

وہ سنگدل میں نالہ بلب، عشق زندہ باد
آہن کو موم، موم کو آہن بنا دیا
اہلِ جہاں کی تنگ روی بھی عجیب ہے
جادہ سے جو ہٹا اُسے رہزن بنا دیا
یہ کس نے مسکرا کے نظر کی مری طرف
ہر وادیِ حیات کو ایمن بنا دیا
ہاں صبر خوب چیز ہے مانا مگر یہ کیا
اپنے ہی دل کا خود مجھے دشمن بنا دیا
میری نگاہِ شوق کی بے باکیاں نہ پوچھ
تیرے ہر اک حجاب کو چلمن بنا دیا
اظہارِ دردِ دل کا تھا اک نام شاعری
یارانِ بے خبر نے اُسے فن بنا دیا

(5)

فرقت میں دل کو ہم یوں ہی بہلائے جاتے ہیں
کیوں بے قرار ہے وہ ابھی آئے جاتے ہیں
یہ تیری بزم اور ترا رندوں سے یہ سلوک
ایک ایک بوند کے لیے ترسائے جاتے ہیں
یہ کہتے جاتے ہیں کہ نہ لاؤ گے تابِ دید
رُخ سے مگر نقاب کو سرکائے جاتے ہیں
پہلے تو تنگ تھے مرے نالوں سے ہم نشیں
اب چپ جو ہوں تو اور بھی گھبرائے جاتے ہیں
اپنا ہی غم فقط ہو تو ممکن ہے جھیل لیں

ہم اک جہاں کے درد پہ تڑپائے جاتے ہیں
ہاں ایک بار اور الٹ دو نقابِ رُخ
تو پھر سے اپنے ہوش میں ہم آئے جاتے ہیں
یونہیں تھا کون سہل ترے در کا ڈھونڈنا
اور اس پہ جانم بوجھ کے بہکائے جاتے ہیں
جھوٹی تسلیوں کی کوئی انتہا بھی ہے
بچے بھی اس طرح نہیں بہلائے جاتے ہیں
تاکیدِ ہوش لب سے کیے جا رہے ہیں اور
آنکھوں سے اک شراب سی برسائے جاتے ہیں
ہاں جانتے ہیں حضرتِ مُلا کو خوب ہم
شاعر تو وہ نہیں ہیں پہ کہلائے جاتے ہیں

(6)

عمر کے دریا کے دریا بہہ گئے
ہم جہاں ڈوبے وہیں پر رہ گئے
لب سے آنکھیں ملا کر رہ گئے
چاہتے تھے چپ رہیں اور کہہ گئے
تم نے چھیڑا ہی نہ سازِ التفات
میرے نغمے لب تک آکر رہ گئے
دل میں آئے غم کے ایسے زلزلے
کیسے کیسے کاخ ارماں ڈھ گئے
فکرِ عقبےٰ اور اس دنیا کے بعد
وہ بھی سہہ لیں گے جو یہ غم سہہ گئے

مے کشوں نے پی کے توڑے جامِ مے
ہائے وہ ساغر جو رکھے رہ گئے
نالۂ ملا سے دنیا گونج اُٹھی
اور نغمے دل ہی دل میں رہ گئے

(7)

ظالم مری حیات کا دورِ شباب ہے
ہاں ہاں، تری جفا پہ بھی جینے کی تاب ہے
اتنا بھی شک نہ میری محبت پہ کیجیے
یہ میں بھی جانتا ہوں زمانہ خراب ہے
کانٹے سے کم خلش میں نہیں وہ نظر مگر
جس کی جگہ ہو دل میں وہ کانٹا گلاب ہے
پھر غرقِ بحرِ یاس ہوئی کیا کوئی اُمنگ
چھوٹا سا ایک سطحِ نظر پر حباب ہے
نرمی سے دل کو چھیڑ ذرا سختیٔ حیات
پہلا ابھی فریب تمنا کا خواب ہے

(8)

کون سی تصویرِ ماضی سامنے آئی نہیں
اک مرقع زیست کا ہے شامِ تنہائی نہیں
اشک بن کر آئی ہیں وہ التجائیں چشم تک
جن کے کہنے کے لیے ہونٹوں میں گویائی نہیں
حسن کے بازار میں ہوتی نہیں کچھ اس کی قدر
سکۂ اُلفت پہ جب تک مُہرِ رسوائی نہیں

یہ قفس کی تیلیاں سب شاخِ گل بن جائیں گی
جو نظر میں ہے ابھی تک وہ بہار آئی نہیں
عفو کے قابل ہے کیشِ مے کشاں میں ہر خطا
ہاں نہیں کوئی تو اک جرمِ شکیبائی نہیں
شمع پھر رکھتے ہیں ملا میرے آگے بزم میں
کیا ابھی دنیا مرے نالوں سے اُکتائی نہیں

(9)

چلتی ہے بادِ حسرت یوں دل کی سرزمیں پر
تخمِ مراد کوئی جمتا نہیں کہیں پر
دل میں جہاں کھٹک سی رہ رہ کے ہو رہی ہے
شاید رُکی تھی دم بھر ان کی نظر یہیں پر
عرشِ بریں پہ چمکا آج اور اک ستارہ
کس نے خلوصِ دل سے سر رکھ دیا زمیں پر
راہِ طلب میں ملا اس دُھن میں بڑھ رہا ہے
آخر ملیں گے جا کر ارض و سما کہیں پر

(10)

دل ہے اک دولت مگر درد آشنا ہونے کے بعد
اشک موتی ہیں مگر غم کی جلا ہونے کے بعد
اپنے ہی جلووں کو باطل سے کیا منسوب خود
پردہ داری نے کسی کی خود نما ہونے کے بعد
گونجتی ہے یادِ ارماں کی صدائے بازگشت
بے صدا ہوتا نہیں دل بے صدا ہونے کے بعد

تا بہ دامن آئی اک بے رنگ سی پانی کی بُوند
تھا ہی کیا آنسو میں صرف التجا ہونے کے بعد

مدعائے دل نہ پوچھو ڈال کر ابرو پہ بل
التجا آتی ہے لب تک آسرا ہونے کے بعد

وہ لیے کشتی لبِ ساحل ہے ملا منتظر
کون کب آواز دے شل دست و پا ہونے کے بعد

جواہر لال نہرو

(1936 میں کانگرس کا انچاسواں اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا جس کے
صدر پنڈت جواہر لال نہرو دوبارہ منتخب ہوئے تھے وہ اسی وقت یورپ سے
پلٹ کر آئے تھے)

وطن میں کون سردارِ چمن پھر بن کے آتا ہے
چمن کی سمت ارمانِ چمن پھر بن کے آتا ہے
رُخِ غم پر تبسم کی کرن پھر بن کے آتا ہے
سوئے یعقوب بوئے پیرہن پھر بن کے آتا ہے
حکومت نے کیا تھا قید جس کو سرگراں ہو کر
وہی یوسف پھر آیا ہے امیرِ کارواں ہو کر

یہ جس کیاری کا گل ہے اس کی پہچانی ہوئی بو ہے
مہک پھیلی ہوئی اس کی چمن بھر میں ہر اک سو ہے
خزاں کے دورِ حاضر میں یہی تسکیں کا پہلو ہے
یہی جانِ گلستاں ہے اسی کا نام نہرو ہے
دلوں پر نقش ہے اس کا زبانوں پر وظیفہ ہے
یہی وہ نام ہے جس کے سہارے قوم زندہ ہے

تری فرقت میں رنجیدہ تھے یارانِ کہن سارے
ترانے بھولتے جاتے تھے مرغانِ چمن سارے
لگے تھے جھلملانے سے چراغِ انجمن سارے

تری آواز کے تھے منتظر سازِ وطن سارے
ترا محفل میں آنا تھا کہ پھر منھ میں زباں آئی
رگوں میں پھر لہو دوڑا تنِ بیجاں میں جاں آئی

ترے دل میں تڑپ ہے ایک سوزِ غیر فانی کی
نظر میں اک تجلّی ہے شعاعِ زندگانی کی
ہنسی ہلکی سی ہونٹوں پر امیدِ کامرانی کی
قسم کھاتا ہے فردائے وطن تیری جوانی کی
انھیں ہاتھوں کھُلے گا اِک نہ اک دن بابِ آزادی
تری صورت میں دیکھا ہے وطن نے خوابِ آزادی

نہیں رکھنے کا تو پائے جفا پر فرقِ حُرّیت
ستمگاری کے بیڑوں کو کیا ہے غرقِ حُرّیت
ترے خوں میں سرایت کر گئی ہے برقِ حُرّیت
وطن کو تو بنا دے گا کسی دن شرقِ حُرّیت
تو ہی اس دورِ طوفاں میں ہے اپنا نُوحِ آزادی
ترے قالب میں کھنچ کر آ گئی ہے رُوحِ آزادی

قریب اختتام آنے لگا ہے دورِ بربادی
مرے کانوں میں آتی ہے صدائے نغمۂ شادی
کہیں روکے سے رُک سکتی ہے اب تعمیرِ آزادی
ہر اک زنداں میں رکھ آیا ہے تو اک سنگ بنیادی
ترے نقشِ قدم ہیں رزم گہ کے چپّہ چپّہ پر
ترے ایثار کی مہریں لگی ہیں ذرّہ ذرّہ پر

فطرتِ آزادی

مسکن ہے خاک میرا خود خاک سر بسر ہوں
دامِ حیات میں اک مرغِ شکستہ پر ہوں
پالا ہوا ہوں لیکن تاروں بھرے فلک کا
اس تیرہ خاکداں میں اک جلوۂ سحر ہوں
ہوں مُشتِ خاک لیکن فردوس در نظر ہوں

1937

غزلیات

(1)

وہ غمِ جاں فزا دیا تونے
راحتوں کو بُھلا دیا تونے
کر کے روشن چراغ اشکوں کے
روح کو جگمگا دیا تونے
دل کا ہر تار لرزہ بر اندام
کون نغمہ سنا دیا تونے
اپنی ہی بات اور کہہ نہ سکوں
جیسے گونگا بنا دیا تونے
کیا میں سمجھوں سوالِ دل کا جواب
پھر وہی مُسکرا دیا تونے
لطفِ احباب تک ہے دل پہ بار
کتنا نازک بنا دیا تونے
آنکھ جس کی جہاں لگی غمِ زیست
وہیں شانہ ہلا دیا تونے
تب کہیں لب تک آئی دل کی بات
جب ذرا آسرا دیا تونے
پیاس چشمِ کرم بُجھائی خوب
اور پیاسا بنا دیا تونے

مجھ سے لے کر مرا سکون و قرار
اس کے بدلے میں کیا دیا تونے
گم تھا جو ساز دل کے تاروں میں
وہی نغمہ سنا دیا تونے
تجھ سے جب تک ملا نہ تھا ملا
کیا تھا اور کیا بنا دیا تونے

(2)

ہم نے بھی کی تھیں کوششیں ہم نہ تمھیں بھلا سکے
کوئی کمی ہمیں میں تھی یاد تمھیں نہ آسکے
زیست کی راحتوں میں بھی غم نہ ترا بھلا سکے
لب سے ہنسے ہزار بار دل سے نہ مُسکرا سکے
نام ترا کیا ہے نقش یں نے اسی دعا کے ساتھ
دل سے نہ مٹ سکے کبھی لب پہ کبھی نہ آسکے
پاس کا خیر ذکر کر کیا دور بھی اُس کو ناگوار
ہم تو حریم دوست میں کوئی جگہ نہ پا سکے
میری اِنھیں کھلی ہوئی آنکھوں میں ایک خواب ہے
کاش کہ اس کی اک جھلک تیری نظر پا سکے
حسرت عشق پر ہمیں صبر کبھی نہ آسکا
دل کو غم بنا لیا، غم کو نہ دل بنا سکے
قفل سا اک زباں پہ تھا، آنکھ میں کچھ نمی سی تھی
ہوش نہیں کہ دل کا بھید کہہ گئے یا چھپا سکے
اپنے ہی شوق کی خطا، اپنی ہی آنکھ کا قصور

وہ تو اُٹھا چکا نقاب ہم نہ نظر اُٹھا سکے
جب ہمیں مٹ گئے تو پھر تیری جفا کا لطف کیا
ناز اسی قدر روا جتنے کوئی اُٹھا سکے
اور تو تیرے عشق میں ہم نے کوئی کمی نہ کی
اتنی خطا ضرور کی ہنس کے نہ چوٹ کھا سکے
عشق اگر کیا تو دیکھ عشق کی آبرو نہ جائے
ہوش نہ کھو، جو کھو تو یوں ہوش میں پھر نہ آ سکے
ملا ارے یہ کیا کیا عشق اور اُس صنم سے عشق
آگ لگا تو وہ لگا جس کو کبھی بجھا سکے

(3)

چھپ کے دنیا سے سوادِ دلِ خاموش میں آ
آ یہاں تو مری ترسی ہوئی آغوش میں آ
اور دنیا میں کہیں تیرا ٹھکانا ہی نہیں
اے مرے دل کی تمنّا لبِ خاموش میں آ
بے رنگیں پسِ مینا سے اشارے کب تک
ایک دن ساغرِ رندانِ بلانوش میں آ
عشق کرتا ہے تو پھر عشق کی توہین نہ کر
یا تو بیہوش نہ ہو، ہو تو نہ پھر ہوش میں آ
تو بدل دے نہ کہیں جو ہر انساں کا بھی رنگ
اے زمانے کے لہو دیکھ نہ یوں جوش میں آ
دیکھ کیا دام لگاتی ہے نگاہِ ملا
کبھی اے غنچۂ تر دستِ گل افروش میں آ

(4)

مٹا بھی میں تو رہے گا غمِ وطن باقی
کہ آشیانہ جلا بھی تو ہے چمن باقی
رہی اگر یہی تفریق تو دمن باقی
تو کوئی گُل ہی رہے گا نہ پھر چمن باقی
فروغِ محفلِ ماضی کی یاد گارِ خموش
نظر میں ہے فقط اک اشکِ بے سخن باقی
ادائے عرضِ تمنا میں رُک رہی ہے زباں
کسی جبیں پہ ہے شاید کوئی شکن باقی
نظامِ دہر کی بنیاد اس اصول پہ ہے
کہ اس میں فرد تو فانی ہے انجمن باقی
عمل عمل ہی رہے گا صلہ ملے نہ ملے
زبانِ خلق پہ ہے نامِ کوہکن باقی
سیاہ خانۂ دل کی طرف بھی بزم نواز
تری نظر میں اگر ہو کوئی کرن باقی
یہی ہے رسمِ چمن گل نہ کر صبا سے گِلہ
نہ رہ سکا کسی یوسف کا پیرہن باقی
وہ کب کے بزم میں آئے بھی اور چلے بھی گئے
نظر نظر میں ہے لیکن سخن سخن باقی
نہیں ہے دل میں تمنا تو کیوں ہے ناکامی
کہ آفتاب تو غایب ہے اور گہن باقی
وہ صدق دل سے کرے لاکھ عذرِ عجزِ سخن
ہے پھر بھی بزم کو ملا سے حسنِ ظن باقی

(5)

یوں ہی اُٹھ جانے کا میں اے ساقیِ محفل نہیں
یا تو بھر ساغر مرا یا کہدے اس قابل نہیں

بے قراری سی تمنّا میں اگر شامل نہیں
دل تو ہے لیکن مذاقِ عشق کے قابل نہیں

وہ تغافل کیش اُلفت سے کبھی غافل نہیں
التجا نا کام دل کی سعیِ لا حاصل نہیں

کون مانے گا یہی دل مرکزِ احساس تھا
یہ جواب پتھر کہے جانے کے بھی قابل نہیں

وہ تغافل کی نظر جانِ توجہ بن گئی
میں نے یہ ظاہر کیا جیسے کہ میں مائل نہیں

خوب ہے ضبط تمنا ہاں مگر کچھ حد بھی ہے
اب تو مدّت سے نظر تک رازدارِ دل نہیں

اشک تو وہ ہے جو دامن کو بنا دے لالہ زار
آستیں کا داغ بن جانا تو کچھ مشکل نہیں

رہرو صادق اُٹھاتا ہے قدم کس شوق سے
ہاں مگر جب تک نظر کے سامنے منزل نہیں

اک جنوں ہے عشق ملا اور اک دھوکا ہے حسن
یہ سمجھ کر بھی تو آساں زیست کی مشکل نہیں

(6)

بس شرط ہے اتنی کہ ہم آواز کوئی ہو
میں نغمے سناؤں گا تجھے، ساز کوئی ہو
کیوں پھیروں نگاہوں کو میں اے جلوۂ پیہم
جب راز ہی کھلتا ہے تو غماز کوئی ہو
تو چھپ نہیں سکتا ہے کرم کر کہ ستم کر
تو تو ہی رہے گا ترا انداز کوئی ہو
نالوں کو ترستے ہیں وفادارِ محبت
اتنا بھی نہ اب گوش برآواز کوئی ہو
ملا یہی آتی ہے ہر اک قبر سے آواز
انجام وہی ایک ہے آغاز کوئی ہو

(7)

جتنا کہ نگاہوں سے عیاں رازِ جگر ہے
تکمیلِ وفا میں ابھی اُتنی ہی کسر ہے
کچھ اپنی کشش کی بھی تجھے حسن خبر ہے
یا یوں ہی ہر اک آنکھ پہ الزامِ نظر ہے
رہرو تو وہی ہے جسے منزل کی خبر ہے
اور یوں تو گنانے کے لیے قافلہ بھر ہے
جس عہدِ وفا کے لیے بے صوت ہیں الفاظ
اُس کے لیے آئینِ محبت میں نظر ہے
اک آن میں مٹ جائیں گے شکوے بھی گلے بھی
ان سب کے لیے ایک محبت کی نظر ہے

ملا کی نہ پوچھو کہ وہ پروردۂ افلاک
ہے خاک مگر عالمِ بالا پہ نظر ہے

(8)

دل بجھا شمعِ کائنات گئی
زندگی کی اُجالی رات گئی
عشق میں کیا سوالِ خود داری
جانے کے بار اپنی بات گئی
سازِ دل بے صدا سا کیوں نہ رہے
کیوں تری ضربِ التفات گئی
تلخیِ غم کی لذتیں توبہ
لب سے شیرینیِ حیات گئی
عشق سے آرزو کو یہ تو ملا
وہ جو تھی قیدِ ممکنات گئی
پھر نہ معلوم کیا ہوئے مرے اشک
ہاں نظر تک تو اک برات گئی
اندھا کیا جانے روشنی کیا ہے
آئی ہی کب تھی جو حیات گئی
فصلِ گل اب بھی ہے جنوں انگیز
ہاں وہ پہلے کی سی تو بات گئی
بات ملا کہو تو صاف کہو
اب وہ رسمِ تکلفات گئی

(9)

بے رنج کے خوشی کا بھی ساماں نہ ہو سکا
کانٹوں سے بے نیاز گلستاں نہ ہو سکا
اک ربطِ باہمی کا جو امکاں نہ ہو سکا
گل جمع بھی ہوئے تو گلستاں نہ ہو سکا
تسلیم برگِ گل تری رنگینیاں مجھے
تجھ سے مگر جوابِ گریباں نہ ہو سکا
اک عرضِ شوق ہی پہ فقط منحصر نہیں
ہم سے کوئی بھی کارِنمایاں نہ ہو سکا
گوہر قدم پہ پھول کھلاتی رہی امید
دشتِ حیات پھر بھی گلستاں نہ ہو سکا
دی تھی کسی کی یاد کو جا میں نے ایک بار
پھر اس کے بعد دل کبھی ویراں نہ ہو سکا
سمجھا ہے شیخ ترک کو معراجِ بندگی
ناداں گناہ کر کے پشیماں نہ ہو سکا
ملائے بے نیاز ارے ملائے بے نیاز
تیرے بغیر نازِحسیناں نہ ہو سکا

(10)

قہر کی کیوں نگاہ ہے پیارے
کیا محبت گناہ ہے پیارے
دل کو اپنی ہی جلوہ گاہ سمجھ
آ نظر فرشِ راہ ہے پیارے

پھیر لی تونے جب سے اپنی نظر
میری دنیا سیاہ ہے پیارے
شک بھی کس پر مری محبت پر
جس کا تو خود گواہ ہے پیارے
تیری معصوم سی نظر کی قسم
یہی وجہِ گناہ ہے پیارے
دو نگاہیں جہاں پہ مل جائیں
عشق کی شاہراہ ہے پیارے
منہ جو سی دیتی تھی شکایت کا
اب کدھر وہ نگاہ ہے پیارے
جو بظاہر نہیں مری جانب
وہ نظر بے پناہ ہے پیارے
سچ بتا کچھ خفا ہے تو مجھ سے
یا حیا سدِّ راہ ہے پیارے
اجنبی بن رہی ہے تیری نظر
ختم کیا رسم و راہ ہے پیارے
راہِ الفت میں ٹھہرنا کیسا
دم بھی لینا گناہ ہے پیارے
دل سی شے اور ناپسند تجھے
اپنی اپنی نگاہ ہے پیارے
نیک ارادوں کے سنگریزوں پر
شاہراہِ گناہ ہے پیارے

لب پہ آتی ہے جو ہنسی بن کر
اک ایسی بھی آہ ہے پیارے
عشق میں وہ بھی ایک وقت ہے جب
بے گناہی گناہ ہے پیارے
اور ملا کو کیا مٹاتے ہو
وہ تو یونہی تباہ ہے پیارے

(11)

پیری کا ترنم بھی اک مرثیہ خوانی ہے
نغمہ تو جبھی تک ہے جب تک کہ جوانی ہے
اشکِ غم الفت میں اک رازِ نہانی ہے
پی جاؤ تو امرت ہے بہہ جائے تو پانی ہے
ہاں زیست کی فصلوں میں اک فصل جوانی ہے
جو دن ہے سنہرا ہے جو شب ہے سہانی ہے
دل ڈوب گیا ہوتا جوشِ غمِ فرقت سے
آنسو نہیں آنکھوں میں اُبلا ہوا پانی ہے
ہنستی ہوئی محفل کو کس دل سے رلائیں ہم
کہتے نہیں بنتی ہے اور اپنی کہانی
برسے ہوئے اشکوں کی آنکھوں میں کھٹک سی ہے
آغاز ہے پیری کا اور یادِ جوانی ہے
شاید تمھیں یاد آئے اک عہدِ گزشتہ کی
ہاں ہاں اُسی دیوانے ملا کی کہانی ہے

(12)

جفا صیّاد کی اہلِ وفا نے رائگاں کر دی
قفس کی زندگی وقفِ خیالِ آشیاں کر دی

یہ دل کیا ہے کسی کو امتحانِ ظرف لینا تھا
تنِ خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کر دی

بھرم حسنِ حقیقت کا کوئی کھلنے نہیں دیتا
نظر جب سامنے آئی تجلّی درمیاں کر دی

تری بے مہریاں آخر وہ نازک وقت لے آئیں
کہ اپنوں کی محبت بھی طبیعت پر گراں کر دی

اسیر آنکھیں کہاں سے سیرِ گلشن کے لیے لائیں
نظر جتنی بھی تھی صرفِ تلاشِ آشیاں کر دی

محبت کو کسی نے بے نیازِ دو جہاں کر کے
کفِ سائل میں پنہاں دولتِ ہر دو جہاں کر دی

بجز اشکوں کے عنوان کے نہ تھا کچھ سازِ شامِ غم
کسی کی یاد آئی اور مکمل داستاں کر دی

خرد کی مدّتوں کی محنتوں پر گر پڑی بجلی
کسی نے نفس کے سوئے دل نظر پھرنا گہاں کر دی

جبیں بے نور ہے میری تو کیا وہ در تو روشن ہے
کرن ہر ایک ماتھے کی نثارِ آستاں کر دی

وہی ہے مردِ رہرو خار زارِ زیست میں جس نے
ذرا آسان تر پہلے سے راہِ کارواں کر دی

وہی اک شامِ الفت حاصلِ ہستی ملا ہے
جسے دنیا سمجھتی ہے کہ اُس نے رائگاں کر دی

(13)

کب تک کسی سے مانگ کے ہم اختیار لیں
اب جی میں ہے کہ شیر سے لڑ کر کچھار لیں
کس کو رہا ہے وعدۂ فردا کا اب یقیں
دنیا کا آپ جائزہ اعتبار لیں
اپنا بنائیں دل کو جو دل کے نہ بن سکیں
جو اختیار دے نہ سکیں اختیار لیں
ہاں دوسرے کا درد ہے پھر دوسرے کا درد
لینے کو اپنے دل پہ اثر ہم ہزار لیں
تسکینِ دل کی پھر کوئی صورت بتائیں آپ
جب نام بھی نہ آپ کا ہم بے قرار لیں
دونوں کو ساتھ گوندھ سکیں جب تو لطف ہے
اک تار زندگی کا لیں اک دل کا تار لیں

(14)

بھولے سے بھی لب پر سخن اپنا نہیں آتا
ہاں ہاں مجھے دنیا میں پنپنا نہیں آتا
دل کو سرِ اُلفت بھی ہے رسوائی کا ڈر بھی
اس کو ابھی اس آنچ میں تپنا نہیں آتا
یہ اشکِ مسلسل ہیں محض اشکِ مسلسل
ہاں نام تمھارا مجھے جپنا نہیں آتا
تم اپنے کلیجہ پہ ذرا ہاتھ تو رکھو
کیوں اب بھی کہو گے کہ تڑپنا نہیں آتا
مے خانہ میں کچھ پی چکے کچھ جام بکف ہیں

ساغر نہیں آتا ہے تو اپنا نہیں آتا
زاہد سے خطاؤں میں تو نکلوں گا نہ کچھ کم
ہاں مجھ کو خطاؤں پہ پشیمانا نہیں آتا
بھولے تھے انھیں کے لیے دنیا کو بھی ہم
اب یاد جنھیں نام بھی اپنا نہیں آتا
دُکھ جاتا ہے جب دل تو اُبل پڑتے ہیں آنسو
ملا کو دکھانے کا تڑپنا نہیں آتا

(15)

گنگا کی لہر ہے یہ مری چشمِ نم نہیں
جس دل میں درد ہے کسی کعبہ سے کم نہیں
کیوں کر کہوں تمھاری جفاؤں کو میں جفا
جو دل کو راس آئے ستم وہ ستم نہیں
تخمیر عشق میں نہیں سودائے انتقام
تیری جفا پہ آہ کریں جو وہ ہم نہیں
راہِ طلب میں شوق کی دیکھو سبک روی
ڈالے کہیں جو نقش وہ اس کا قدم نہیں
اپنی زباں سے کیوں کہو مجھ کو گدائے در
اپنی عطا پہ ناز یہ شانِ کرم نہیں
یہ اور بات ہے کہ نہ دو دل میں تم جگہ
لیکن نظر چرانے کے قابل تو ہم نہیں
ملا کہیں بتوں کو ہٹانے ہی سے نہ ہو
کیوں اب وہ زیب و زینتِ طاقِ حرم نہیں

شبِ ہجراں

شبِ ہجر ہے اور تنہائیاں ہیں
تری یاد سے بزم آرائیاں ہیں
سکوں ایک دنیا پہ چھایا ہوا ہے
خموشی کی ہر سمت دارائیاں ہیں
کسی بے خبر سونے والے سے تاباں
مری آرزوؤں کی تنہائیاں ہیں
کہیں خوابِ نوشیں سے چونکے نہ کوئی
تمنا کی کیا کیا سبک پائیاں ہیں
مرے سامنے جیسے وہ جلوہ گر ہیں
وہی ناز، انداز، رعنائیاں ہیں
لبوں پر ہے اک ہلکا ہلکا تبسم
تبسم میں کیا کیا دل افزائیاں ہیں
نگاہوں سے ہیں میری جانب اشارے
اشارے نہیں ہیں مسیحائیاں ہیں
تمنائے مردہ میں جان آرہی ہے
امیدِ فسردہ میں رعنائیاں ہیں
پھر انگڑائیاں لے رہی ہیں اُمنگیں
نگاہ و جگر میں توانائیاں ہیں
نہ مرعوب ہو کر مری بے زبانی
نہ مجبور ہو کر شکیبائیاں ہیں

مزے سے مری اُن کی ہوتی ہیں باتیں
کہ جیسے کہیں کی شناسائیاں ہیں
کبھی عشق کی ہے نیاز آفرینی
کبھی حسن کی ناز فرمائیاں ہیں
کوئی سننے والا نہ دُہرانے والا
نہ غماز کوئی نہ رسوائیاں ہیں
کوئی در ہے اور میں نہیں اور کوئی
جبیں سائیوں پر جبیں سائیاں ہیں
چلے آرہے ہیں لبوں پر ترانے
بھری جیسے سینہ میں شہنائیاں ہیں
کبھی شوقِ گستاخ کی یورشیں ہیں
کبھی خود خجل ہو کے پس پائیاں ہیں
نہیں ہے کوئی دل کو سمجھانے والا
وہ عالم ہے معزول دانائیاں ہیں
وہاں روح جا جا کے ٹکرا رہی ہے
جہاں قلبِ انساں کی گہرائیاں ہیں
محبت کی باتیں تصور کو سونپیں
تصور پہ قرباں گویائیاں ہیں
نہ کر اِن کا پیچھا ارے جاگ ملا
یہ سب خوابِ ارماں کی پرچھائیاں ہیں

ہم لوگ

سُرخیِ انقلاب ہیں ہم لوگ
عنوانِ شباب ہیں ہم لوگ
تیرہ و تار غم کی راتوں میں
مژدۂ آفتاب ہیں ہم لوگ
چشمِ حسرت میں تشنہ کاموں کی
خوابِ جام و شراب ہیں ہم لوگ
موت کے حملہ ہائے پیہم پر
زندگی کا جواب ہیں ہم لوگ
سونے والوں کو کر دیا بیدار
اک پریشاں سا خواب ہیں ہم لوگ
کون آنکھیں ملائے گا ہم سے
جلوۂ بے نقاب ہیں ہم لوگ
قوم کا دل ہلا دیا ہم نے
نالۂ مستجاب ہیں ہم لوگ
موجِ دریا پہ چھائے جاتے ہیں
کاروانِ حباب ہیں ہم لوگ
جن کے مٹنے میں بھی ہے اک تعمیر
وہی خانہ خراب ہیں ہم لوگ
کام ناکامیوں سے لیتے ہیں
کس قدر کامیاب ہیں ہم لوگ

کوئی ہم سا نہیں زمانے میں
آپ اپنے جواب ہیں ہم لوگ
گرد چہرے سے پونچھ کر دیکھو
غیرتِ ماہتاب ہیں ہم لوگ
ایک روشن سی جس کی ہے تعبیر
وہی دُھندلا سا خواب ہیں ہم لوگ
جانتے ہیں کسی کی تابِ جفا
پھر بھی جینے کی تاب ہیں ہم لوگ
زیست کا ماحصل ہے عہدِ شباب
اور جانِ شباب ہیں ہم لوگ
کون دے گا صدا پہ اپنی صدا
نعرۂ انقلاب ہیں ہم لوگ

لوری

(سروجنی نائڈو کی ایک انگریزی نظم سے ماخوذ ہے)

(1)

نیلے آکاش سے اونچے کیلاش سے
لائی تیرے لیے میں شتاب
ہلکا ہلکا سا اک پیارا پیارا سا اک
ننھی آنکھوں کا ننھا سا خواب

(2)

دھان کے کھیت سے کھیت کی ریت سے
چُن کے لائی ہوں میں بے حساب
مسکراتے ہوئے جگمگاتے ہوئے
دھانی دھانی سنہرے سے خواب

(3)

باغ میں جھیل پر کچھ کنول ہیں جدھر
اور روش پر کھلے ہیں گلاب
میں اُسی کنج سے لائی تیرے لیے
بھینا بھینا نشیلا سا خواب

(4)

کھیلتے ہیں جہاں ہولی ارض و سما
ڈوبتا ہے جہاں آفتاب
واں سے آئی ہوں میں ساتھ لائی ہوں میں
ایک رنگیں گلابی سا خواب

(5)

ناز میں تتلیاں پی رہی ہیں جہاں
جامِ گل سے سنہری شراب
ان سے چھپ چھپ کے میں لائی چپکے سے مَیں
میٹھے میٹھے رسیلے سے خواب

(6)

مُند گئیں انکھڑیاں رخصت اے میری جاں
بڑھ چلی ہے ستاروں میں تاب
سو یونہیں رات بھر دیکھ اب تا سحر
ایک معصوم بے لوث خواب

مسلم لیگ 1937

جہاں سے اپنی حقیقت چھپائے بیٹھے ہیں
یہ لیگ کا جو گھروندا بنائے بیٹھے ہیں
پڑے ہوئے ہیں نگاہوں پہ پردۂ ہائے ریا
دلوں سے نقشِ صداقت مٹائے بیٹھے ہیں
زباں پہ دامنِ یوسف کی داستانیں ہیں
نظر کو خوابِ زلیخا بنائے بیٹھے ہیں
بھڑک رہی ہے تعصب کی دل میں چنگاری
چراغِ عقل و حقیقت بجھائے بیٹھے ہیں
ہر اک کے دین پہ الزامِ کافری رکھ کر
ہر ایک کفر پہ ایمان لائے بیٹھے ہیں
سجائے بیٹھے ہیں دوکاں وطن فروشی کی
ہر ایک چیز کی قیمت لگائے بیٹھے ہیں
قفس میں عمر کٹے جی میں ہے غلاموں کے
چمن کی راہ میں کانٹے بچھائے بیٹھے ہیں
نہیں شریک مصیبت میں ہند کی لیکن
عراق و شام سے رشتے ملائے بیٹھے ہیں
گرائی ایک پسینہ کی بوند بھی نہ کبھی
متاعِ قوم میں حصہ بٹائے بیٹھے ہیں
ہر ایک گل کی طرف ہے دراز دستِ ہوس
و ہر ایک خار سے چنگل بچائے بیٹھے ہیں

ؤ ہر ایک جلوہ کی جانب ہیں حرص کی نظریں
ہر ایک شعلہ سے دامن بچائے بیٹھے ہیں
خدا کی شان اُسی سر کی رفعتوں پہ غرور
جو آستانِ عدو ؤپر جھکائے بیٹھے ہیں
بھلا وہ قوم کو کیا دیں گے درسِ آزادی
جو آیتِ وطنیت بھلائے بیٹھے ہیں
وہ ہاتھ تیغِ سیاست کو کیا سنبھالیں گے
جو بزمِ عشق میں مہندی رچائے بیٹھے ہیں
سنیں گے خاک وہ بدبخت قوم کی آواز
جو ریڈیو سے شبستاں سجائے بیٹھے ہیں
نہ جوشِ حبِّ وطن ہے نہ جذبۂ ایثار
عمل کے نام سے آنکھیں چُرائے بیٹھے ہیں
کوئی بتائے انھیں آزمائیں ہم کب تک
ہزار بار جنھیں آزمائے بیٹھے ہیں
جہاں میں سُست عمل کا کہیں ٹھکانہ نہیں
کہ مُفت خوروں کے پلنے کا اب زمانہ نہیں

1938

غزلیات

(1)

آ غم کہ اب تجھی پہ ہے دارومدارِ دل
تیرے سوا کسی پہ نہیں اختیارِ دل

آنکھیں نہیں تو کون ہے پھر رازدارِ دل
کیوں کر تمھیں دلائے کوئی اعتبارِ دل

دل ہی رہے گا پھر نہ کوئی یادگارِ دل
قائم رہے اگر یہی لیل و نہارِ دل

تنہائی خزاں میں مجھے آرہے ہیں یاد
ایک ایک کر کے سارے رفیقِ بہارِ دل

بادل گھرے ہیں یاس کے اے چشمِ تر برس
رہ جائے دل ہی دل میں نہ سارا غبارِ دل

ہر ہر نفس ہے تیز سا نشتر لیے ہوئے
چبھنے لگا ہے زیست کے پہلو میں خارِ دل

کھوٹے کھرے کو دہر کے اس پر پرکھ کے دیکھ
انساں کے جانچنے کے لیے ہے عیارِ دل

تنظیمِ کائنات میں ہوں مَیں ترا حریف
تو کردگارِ حُسن مَیں پروردگارِ دل

میرے لیے تو مٹ کے بھی ہے سرمۂ نظر
خاکِ دیارِ دل تو ہے خاکِ دیارِ دل

پھر بھی کسی کے پردہ رُخ پر جمی ہے آنکھ
جلوے تو سینکڑوں ہیں یمین ویسار دل
ملا کے ضبطِ غم کی نہ پوچھو غریب نے
جاں دی مگر زباں پہ ڈالا نہ بارِ دل

(2)

سرِ محشر یہی پوچھوں گا خدا سے پہلے
تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے
اشک آنکھوں میں ہیں ہونٹوں پہ بُکا سے پہلے
قافلہ غم کا چلا بانگِ درا سے پہلے
یہ تو سچ ہے کہ تجھے ترکِ جفا کا حق ہے
ہاں مگر پوچھ تو لے اہلِ وفا سے پہلے
اُڑ گیا جیسے یکا یک مرے شانوں پر سے
وہ جو اک بوجھ تھا تسلیمِ خطا سے پہلے
ہاں یہی دل جو کسی کا ہے اب آئینۂ حُسن
ایک پتھر تھا محبت کی جِلا سے پہلے
آنکھ جھپکا بھی تو دے دل کو چرانے والے
اک تبسم نگہِ ہوش رُبا سے پہلے
لذتِ زیست کوئی اس کے مقابل کی نہیں
وہ جو اک کیف سا طاری ہے خطا سے پہلے
ابتدا ہی سے نہ دے زیست مجھے درس اس کا
اور بھی باب تو ہیں بابِ رضا سے پہلے
درِ مے خانہ سے آتی ہے صلائے تازہ
آج سیراب کیے جائیں گے پیاسے پہلے

راز بے نوشی ملا ہوا افشا ورنہ
کیا وہ مدمست نہ تھا لغزشِ پا سے پہلے

(3)

کام عشق بے سوال آہی گیا
خود بخود اس کو خیال آہی گیا
تو نے پھیری لاکھ نرمی سے نظر
دل کے آئینہ میں بال آہی گیا
دو مری گستاخ نظروں کو سزا
پھر وہ ناگفتہ سوال آہی گیا
زندگی سے لڑ نہ پایا جوشِ دل
رفتہ رفتہ اعتدال آہی گیا
حسن کی خلوت میں دڑاتا ہوا
عشق کی دیکھو مجال آہی گیا
غم بھی ہے اک پردہ اظہار شوق
چھپ کے آنسو میں سوال آہی گیا
وہ اُفق پر آگیا مہر شباب
زندگی کا ماہ و سال آہی گیا
بیخودی میں کہہ چلا تھا رازِ دل
وہ تو کہئے کچھ خیال آہی گیا
ہم نے کر پائے خطا بزدل ضمیر
لے کے تصویرِ مآل آہی گیا

ابتدائے عشق کو سمجھے تھے تکمیل
مرنے جینے کا سوال آ ہی گیا
لاکھ چاہا ہم نہ لیں غم کا اثر
رُخ پہ اک رنگِ ملال آ ہی گیا
بچ کے جاؤ گے کہاں ملا کوئی
ہاتھ میں لے کر گلال آ ہی گیا

(4)

یہ عشق کل تجھے حسنِ جواں ملے نہ ملے
نہ دیر کر کہ یہ جنسِ گراں ملے نہ ملے
بتوں سے مل کے بھی آرام جاں ملے نہ ملے
نظر ملے تو مزاجِ بتاں ملے نہ ملے
میں آج ہی اسے کیوں صرفِ دل نہ کر ڈالوں
یہ خوں کی بوند مجھے کل یہاں ملے نہ ملے
حدیثِ شوق پیمبر تلاش کر لے گی
زباں کی کون ضرورت زباں ملے نہ ملے
نگاہِ شوق نے دیکھا ہے اک حسین افق
مری جبیں کو ترا آستاں ملے نہ ملے
گلے لگا کے کیا نذرِ شعلۂ آتش
قفس سے چھوٹ کے پھر آشیاں ملے نہ ملے
متاعِ شوق کو اشکوں کے ساتھ بھیج بھی دوں
پھر اس کے بعد کوئی کارواں ملے نہ ملے

چلو قبول بھی کر لو مرے سجودِ نیاز
اب ان کو اور کوئی آستاں ملے نہ ملے
حیاتِ فانی ملا کی لذتوں کی قسم
بلا سے زندگیِ جاوداں ملے نہ ملے

(5)

مری بات کا جو یقیں نہیں مجھے آزما کے بھی دیکھ لے
تجھے دل تو کب کا میں دے چکا اسے غم بنا کے بھی دیکھ لے
یہ تو ٹھیک ہے کہ تری جفا بھی ہے اک عطا مرے واسطے
مری حسرتوں کی قسم تجھے کبھی مسکرا کے بھی دیکھ لے
مرا دل الگ ہے بجھا سا کچھ ترے حسن پر بھی چمک نہیں
کبھی ایک مرکزِ زیست پر انھیں ساتھ لا کے بھی دیکھ لے
مرے شوق کی ہیں وہی ضدیں ابھی لب پہ ہے وہی التجا
کبھی اُس جلے ہوئے طور پر مجھے پھر بلا کے بھی دیکھ لے
نہ مٹے گا نقشِ وفا کبھی نہ مٹے گا ہاں نہ مٹے گا یہ
کسی اور کی تو مجال کیا اسے خود مٹا کے بھی دیکھ لے
کسی گلِ فسردہ باغ ہوں مرے لب ہنسی کو بھلا چکے
تجھے اے صبا جو نہ ہو یقیں مجھے گدگدا کے بھی دیکھ لے
مرے دل میں تو ہی ہے جلوہ گر، ترا آئینہ ہوں میں سر بسر
یونہی دور ہی سے نظر نہ کر، کبھی پاس آ کے بھی دیکھ لے
مرے ظرفِ عشق پہ شک نہ کر، مرے حرفِ شوق کو بھول جا
جو بھی حجاب ہے درمیاں، یہ حجاب اُٹھا کے بھی دیکھ لے
یہ جہان ہے اسے کیا پڑی ہے جو یہ سُنے تری داستاں
تجھے پھر بھی ملا اگر ہے ضد غمِ دل سُنا کے بھی دیکھ لے

(6)

تری نگاہ مرے حسنِ رائگاں پہ نہیں
وگر نہ دل میں جو تارے ہیں آسماں پہ نہیں
مجھے یہ ڈر کہیں کچھ کہہ نہ دے نظر میری
انھیں گلہ کہ پیامِ نظر زباں پہ نہیں
کہیں یہی تو نہیں تیری برہمی کا سبب
مری نظر کا تقاضا مری زباں پہ نہیں
حیات فکرِ نشیمن میں کاٹنے والو
چمن کا کیا کوئی حق اہلِ آشیاں پہ نہیں
اِدھر بھی ایک نظر کیوں کسی پہ راز کھلے
کہ ہر طرف تو پڑے تیر اور نشاں پہ نہیں
نئے ستم کی نہ دے دھمکیاں ہمیں اے چرخ
وہ کون برق ہے ٹوٹی جو آشیاں پہ نہیں
قبول اب بھی نہیں کیا مرے سجودِ نیاز
وہ کون خطِ جبیں ہے جو آستاں پہ نہیں
کسی کے پاؤں کا رَوندا ہوا نہیں ملا
وہ ہے تو گرد مگر راہِ کارواں پہ نہیں

(7)

میرے جگر کی تاب دیکھ، رُخ کی شگفتگی نہ دیکھ
فطرتِ عاشقی سمجھ، قسمتِ عاشقی نہ دیکھ
اور نظر وسیع کر ورزشِ نگاہ ہی نہ دیکھ
موت میں ڈھونڈ زندگی زیست میں نیستی نہ دیکھ

جیسے ہر اک نفس نفس نوکِ سناں لیے ہوئے
عشق کا خواب دیکھ لے، عشق کی زندگی نہ دیکھ
میں تو سرائے شوق میں دل کا کنول جلا چکا
اب یہ تری خوشی کہ تو دیکھ کہ روشنی نہ دیکھ
ایک اصول یاد رکھ سالکِ راہِ زندگی
نقش و نگارِ دہر دیکھ، مڑ کے مگر کبھی نہ دیکھ
اپنی نگاہ پھیر لے ہاں یہ مجھے قبول ہے
رکھ مری آرزو کی شرم، شوق کی بے بسی نہ دیکھ
تجھ پہ عیاں ہے رازِ دل، جان کے بن نہ بےخبر
معنیِ خامشی سمجھ، صورتِ خامشی نہ دیکھ
ملا یہ کیا لگا لیا دل کو ہنسی ہنسی میں روگ
بات بتا رہے تھے جو ہو کے رہی وہی نہ دیکھ

(8)

جوشِ غم بھی دل کے کام آجائے ہے
چھپ کے آنسو میں پیام آجائے ہے
اپنے ہونٹوں سے لگا پاتا نہیں
میرے ہاتھوں تک تو جام آجائے ہے
اس سکوتِ غم کی تلخی کے نثار
یاد اک شیریں کلام آجائے ہے
جان کر لیتا نہیں میں تیرا نام
خود بخود ہونٹوں پہ نام آجائے ہے
ہجر کے ماروں کے جینے کا نہ پوچھ

صبح کٹتی ہے تو شام آجائے ہے
تجھ کو مجھ سے جب کوئی مطلب نہیں
کیوں تصوّر میں مدام آجائے ہے
دیکھ پایا وہ نہ مایوسی مری
گاہ ناکامی بھی کام آجائے ہے
گُل کِھلا کر خوش نہ ہو ناداں نسیم
یوں کہیں طرزِ خرام آجائے ہے

(9)

زندگی گو کشتۂ آلام ہے
پھر بھی راحت کی امیدِ خام ہے
ہاں ابھی تیری محبت خام ہے
تیرے دل میں کاوشِ انجام ہے
عشق ہے، میں ہوں، دلِ ناکام ہے
اس کے آگے بس خدا کا نام ہے
آ، کہاں ہے تو فریبِ آرزو
آج ناکامی سے لینا کام ہے
میں وہی ہوں، دل وہی، ارماں وہی
ایک دھوکا گردشِ ایّام ہے
اپنے جی میں یہ کہ دنیا چھوڑ دیں
اور دُنیا کو ہمیں سے کام ہے
جل چکے چشمِ ابھرا میں چراغ
سو بھی جا ملا کہ وقتِ شام ہے

(10)

سنہرے خرمنوں کا رنگِ پنہاں دیکھ لیتا ہوں
ہر اک دانہ میں خونِ گرمِ دہقاں دیکھ لیتا ہوں

محبت کو جہاں دل کا نگہباں دیکھ لیتا ہوں
وہاں گنجائشِ تعمیرِ انساں دیکھ لیتا ہوں

بجوی ہے خون سے مزدور کے ایک ایک اینٹ اس کی
لرز اُٹھتا ہوں مَیں جب کوئی ایواں دیکھ لیتا ہوں

کسی شوریدہ سر کی شکل پھر جاتی ہے آنکھوں میں
جہاں مَیں روزنِ دیوارِ زنداں دیکھ لیتا ہوں

غمِ امروز میں بھی راحتِ فردا پہ نظریں ہیں
انھیں اشکوں کے قطروں میں چراغاں دیکھ لیتا ہوں

(11)

اسے عقل والے نہیں جانتے ہیں
رہِ عاشقی کچھ ہمیں جانتے ہیں

غمِ عشق کی تلخ صہبا کے عادی
غمِ زیست کو انگبیں جانتے ہیں

بہت ہنس رہے ہیں یہ نادان غنچے
ابھی باغباں کو نہیں جانتے ہیں

یہی بن کے خورشیدِ محشر اُٹھے گا
جسے آج داغِ جبیں جانتے ہیں

تسلی مرے قلب کو دینے والے
زمانہ کو شاید نہیں جانتے ہیں
نظر میں تری آج کیا ہم نے دیکھا
کہ اپنے کو بھی اب حسیں جانتے ہیں
مروّت کے ماروں کا ایماں نہ پوچھو
نہیں منہ سے کرنا نہیں جانتے ہیں
ترے دل کی قیمت تری قدر ملا
زمانہ نہ جانے حسیں جانتے ہیں

(12)

دل کا چراغ جب تلک تجھ سے جلے جلائے جا
رات بھی ہے اگر تو کیا، رات کو دن بنائے جا
سانس سمائے جب تلک نغمۂ زیست گائے جا
ہونٹوں کو سی بھی دیں اگر دل ہی میں گنگنائے جا
حسن ہے بے وفا اگر عشق سے انتقام لے
لاکھ بھلائے وہ تجھے تو اُسے یاد آئے جا
دشتِ حیات ڈال دے پاؤں میں آبلے تو کیا
تُو تو امید اک چمن پیشِ نظر کھلائے جا
تنگ نہ کر حدِ کرم، ظرفِ سوال دور پھینک
در پہ کسی کے بیٹھ اور یونہی صدا لگائے جا
جرأتِ شوق سے نہ ڈر غفلتِ حسن تا بہ کے
خون کو دل بنائے جا، دل کو نظر بنائے جا

راز ترقّی جہاں ایک ہی ہے مجھ سے سُن
شاہ کو ہوشیار کر، چور سے کہہ چرائے جا
مطرب نغمہ حیات بھول نہ دل کی تھاپ کو
ایک اصول یاد رکھ، سم پہ پلٹ کے آئے جا
راز نیاز ہے یہی، مسلکِ عشق ہے یہی
دل میں سمجھ فریب حسن پھر بھی فریب کھائے جا

دو حقیقتیں

مرے ترقی پسند اک دوست کل یہ تقریر کر رہے تھے
ہر اک خرابیِ دورِ حاضر مجھی سے تعبیر کر رہے تھے
یہ کہہ رہے تھے "بنا ہے تو ہی تمام باطل پرستیوں کی
ترے ہی دل میں ہیں خوابگاہیں مذاقِ انساں کی پستیوں کی
ترے ہی خوابوں کی چادروں سے نقوشِ ہستی چھپے ہوئے ہیں
ترے ہی جالے ہر ایک ایوانِ زندگی میں لگے ہوئے ہیں
وہی فسانے خلافِ فطرت ابھی ترے لب سنا رہے ہیں
وہی قدامت کے مقبروں میں ترے دیئے ٹمٹما رہے ہیں"
جہاں میں دو ہی حقیقتیں ہیں، ہے جن پہ دارومدارِ ہستی
ہے جن سے قائم نظامِ عالم، ہے جن کے دم سے بہارِ ہستی
ہے ایک ان میں سے جسمِ عورت کا دوسری جیبِ مرد کی ہے
جہاں کی ہر شاہراہِ اخلاق انہیں کے قدموں نے گرد کی ہے
ہر اک تمدن کا خوں کیا ہے، ہر ایک تہذیب خاک کی ہے
ہمیشہ دستِ ہوس سے اپنے نقابِ فطرت کی چاک کی ہے
ہر ایک گنبد میں زندگانی کے گونجتی ہیں صدائیں ان کی
گڑی ہیں ہر انقلابِ دنیا کے زلزلوں میں بنائیں ان کی
جہاں میں تیرے سے چند ناداں جو نامِ الفت کا لے رہے ہیں
وہ یا تو خود کھا رہے ہیں دھوکا نہیں تو دھوکا سا دے رہے ہیں
کہاں گزر ان لطافتوں کا حیات کی سخت منزلوں میں
انہیں تو بھول آئی کب کی دنیا ترے تصور کی محفلوں میں

مثالِ حرفِ غلط لوحِ زندگی سے مٹائیں گی یہ
ہوائے دنیا کے رُخ پہ رکھ کر چراغ تیرے بجھائیں گی یہ
حیات کو اک نہ اک دن یہ برہمی کا پیام دیں گی
ترے جنازے کو دوش پر لے کے دعوتِ رقصِ عام دیں گی

(2)

اگر یہی دو حقیقتیں ہیں تو مَیں یقیناً ہوں نقشِ باطل
اگر محبت ہے زہرِ ہستی تو شعر میرے ہیں سمِ قاتل
مگر یہ کیا بات ہے کہ جب ایک دوسرے سے یہ چار ہوں گی
ہنسی اُڑاتی تھیں جس پہ میری اُسی طرح بے قرار ہوں گی
بڑھیں گی، اک دوسرے کی جانب مرا پیامِ نگاہ لے کر
مرے ہی سینے سے آگ لے کر مرے ہی ہونٹوں سے آہ لے کر
سنائیں گی یہ بصد ترنم، کبھی نظر سے کبھی زباں سے
وہی ترانے اُڑا لیے ہیں جو میرے لب ہائے خوں چکاں سے
مرے تصوّر سے رنگ لیں گی مرے ہی خوابوں سے نور لیں گی
مری تمناؤں کے خزانوں سے اپنے موتی ضرور لیں گی
الٰہی کس ارتقا کے مرکز کی سمت تہذیب جا رہی ہے
کہ جیسے انسانیت سے اپنی بشر کو خود شرم آ رہی ہے
یہ عقل کی مادّہ پرستی، مزاجِ دنیا بدل رہی ہے
یہ روحِ انساں کو رکھ کے اپنے قدم کے نیچے کچل رہی ہے
مجھے یہ تسلیم مَیں بشر ہوں جگر میں پانی نہیں لہو ہے
ہزار ہیں دل میں آرزوئیں مگر یہی جانِ آرزو ہے

مری امیدیں مری امنگوں کے چاہے کام آئیں یا نہ آئیں
مرے ستارے بغیر چمکے ہی چاہے سینہ میں ڈوب جائیں
مگر میں اس بد مذاق دنیا سے ایک دن انتقام لے لوں
میں اپنے خون جگر کے قطروں سے کاش اتنا ہی کام لے لوں
بڑے جو بنتے ہیں عقل والے انھیں بھی دل کا پیام دیدوں
سحر کے بے روح پیکروں کو حرارت خون شام دیدوں
جلے ہوئے ہیں جو برف میں دل انھیں بھی اک شعلہ زار کر دوں
جہاں کی سیلی ہوئی فضاؤں کو برق سے ہمکنار کر دوں

1939

غزلیات

(1)

غیر کے درد پہ بھی اشک بداماں ہونا
یہی معراجِ بشر ہے یہی انساں ہونا
اشکِ غم دیکھ اس اعزاز کے شایاں ہونا
ہے تجھے شمعِ شبِ تارِ غریباں ہونا
دل تو صد چاک مگر لب پہ تبسم ہے وہی
گل سے سیکھو چمنِ دہر میں خنداں ہونا
خلشِ عشق ہی بن جائے گی سرمایۂ زیست
اسی نشتر کو ہے اک روز رگِ جاں ہونا
اُف ری ناکامیِ پیہم کہ کبھی بہرِ دُعا
ہاتھ اُٹھانا تو اٹھاتے ہی پشیماں ہونا
بس تو یہ بھی نہیں اک پھول قفس میں رکھ لیں
اور نگاہوں میں گلستاں کا گلستاں ہونا
قسمتِ صولت شاہی میں لکھا تھا اک دن
چینِ پیشانیِ دہقاں سے نمایاں ہونا
ہائے وہ عشق کے آغاز کا اندازِ لطیف
دل کا خود اپنی تمنا پہ پشیماں ہونا
کچھ بھی کہنے کی مجھے اُن سے ضرورت نہ پڑی
آ گیا کام مرا بے سر و ساماں ہونا

کتنے پودوں کی ملی خاک میں رعنائی قد
تب کسی سرو نے سیکھا ہے خراماں ہونا
وہ اگر خوش بھی ہے عرفانِ خوشی اُس کو نہیں
جس نے جانا نہ کسی غم میں پریشاں ہونا
اِس کو مژگاں میں چھپالے کہ ہے غم کی توہین
عِصمتِ اشک کا آلودہ داماں ہونا
آمدِ موسمِ حرماں کا وہ انداز حسیں
شاخِ مژگاں کا سمن پوش و گل افشاں ہونا
اِس کو خودداریٔ ملا نے گوارا نہ کیا
آتشِ غیر کے شعلوں سے فروزاں ہونا
فروری 1939

(2)

آئینۂ رنگینِ جگر کچھ بھی نہیں کیا
کیا حسن ہی سب کچھ ہے نظر کچھ بھی نہیں کیا
چشمِ غلط انداز کے شایاں بھی نہ ٹھہرے
جذبِ غمِ پنہاں میں اثر کچھ بھی نہیں کیا
نظریں ہیں کسی کی کہ ہے اک آتشِ سیّال
یوں آگ لگانے میں خطر کچھ بھی نہیں کیا
ادنیٰ سا اشارہ بھی ہے جس کا مجھے اک حکم
اُس پر مری آہوں کا اثر کچھ بھی نہیں کیا
مانا مرے جلنے سے نہ آنچ آئے گی تم پر
لیکن مرے جلنے میں ضرر کچھ بھی نہیں کیا

یوں بھی کوئی دنیا کی نگاہوں سے نہ گر جائے
ملا کو بُرا کہنے میں ڈر کچھ بھی نہیں کیا

فروری 1939

(3)

مری باتوں پہ دنیا کی ہنسی کم ہوتی جاتی ہے
مری دیوانگی شاید مسلّم ہوتی جاتی ہے
توجہ کی نظر میری طرف کم ہوتی جاتی ہے
میں خوش ہوں عشق کی بنیاد محکم ہوتی جاتی ہے
ضرورت کچھ بھی کہنے کی بہت کم ہوتی جاتی ہے
مری صورت ہی اب شوق مجسم ہوتی جاتی ہے
کبھی تو نے پکارا تھا مجھے کچھ شک سا ہوتا ہے
مرے کانوں میں اک آواز پیہم ہوتی جاتی ہے
مجھے سمجھانے آئے ہیں کہ میں رونے سے باز آؤں
مرے سمجھانے والوں کی نظر نم ہوتی جاتی ہے
ابھی سُن لو تو شاید سن سکو تم دل کے نغموں کو
کہ اب اس کی صدا کچھ خود بخود کم ہوتی جاتی ہے
وہی دل ہے مگر اب وہ نہیں اگلی سی بیتابی
وہی خوں ہے مگر رفتار مدّھم ہوتی جاتی ہے
تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے
ترے ہاتھوں بہت توہینِ آدم ہوتی جاتی ہے
نشاطِ زیست کی ضامن ہے اب یادِ محبت ہی
یہی خود عشق کے زخموں کا مرہم ہوتی جاتی ہے

محبت ہی سے کھولو تم دلِ ملا کا دروازہ
یہی اس کے لیے اب اسمِ اعظم ہوتی جاتی ہے

مارچ 1939

(4)

گزری حیات وہ نہ ہوئے مہرباں کبھی
سنتے تھے ہم کہ عشق نہیں رائگاں کبھی
جائیں گی دل کو چھوڑ کے ناکامیاں کبھی
نکلے گی اس چمن سے بھی آخر خزاں کبھی
بھولے سے بھی ملے گا نہ آرامِ جاں کبھی
دنیا کو جان کر بھی نہ تھا یہ گماں کبھی
اتنا تو یاد سا ہے کہ ہم تھے جواں کبھی
پھرتی ہیں کچھ نگاہ میں پرچھائیاں کبھی
دو گل قفس میں رکھ کے نہ صیاد دے فریب
دیکھا ہی جیسے ہم نے نہیں آشیاں کبھی
وہ آرزو ہی دشمنِ جاں بن گئی جسے
دی تھی غمِ حیات سے دل میں اماں کبھی
بھولے ہوئے ہو تم تو دلائیں گے ہم نے یاد
ہم تم بھی راہِ زیست میں تھے ہم عناں کبھی
ویرانیِ نگاہ پہ میری نہ جائیے
پلتی تھیں اِس کے سائے میں بھی بجلیاں کبھی
ہاں ہاں یہی جو چشم تک آئی ہیں بن کے اشک
نام ان کا تھا امید کی رنگینیاں کبھی

آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار
گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی
ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہِ لطف
پھر خوں کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی
ملا بنا دیا ہے اسے بھی محاذِ جنگ
اک صلح کا پیام تھی اُردو زباں کبھی
اپریل 1939

(5)

خود اپنے دل کی روش پر نہ کیوں ہراس آئے
چلے گا چال وہی جو عدو کو راس آئے
پھر آیا ہوش مجھے تم جو میرے پاس آئے
تم آئے یا مرے کھوئے ہوئے حواس آئے
نہیں میں طالبِ کوثر مجھے تو دے ساقی
وہ مے کہ جس میں لبوں کی ترے مٹھاس آئے
مٹا کے تفرقۂ دل ملے نہ دیر و حرم
ہزار بار دکھانے کو پاس پاس آئے
تری جفا کو جفا میں تو کہہ نہیں سکتا
ستم ستم ہی نہیں ہے جو دل کو راس آئے
وہ لب نصیب نہیں ہیں تو کم سے کم ساقی
کسی کے ہونٹوں کو چھوتا ہوا گلاس آئے
حجابِ دیر و حرم میں اگر چھپا نہ اُسے
نظر کے سامنے وہ جلوہ بے لباس آئے

جفائے دوست کو ملا سمجھ رہے ہیں کرم
بڑے وہاں سے کسی کے اداشناس آئے
اپریل 1939

(6)

جب دل میں ذرا بھی آس نہ ہو اظہارِ تمنا کون کرے
ارمان کیے دل ہی میں فنا، ارمان کو رسوا کون کرے
خالی ہے مرا ساغر تو رہے ساقی کو اشارا کون کرے
خودداریِ سائل بھی تو ہے کچھ ہر بار تقاضا کون کرے
جب اپنا دل خود لے ڈوبے، اوروں پہ سہارا کون کرے
کشتی پہ بھروسا جب نہ رہا تنکوں پہ بھروسا کون کرے
آدابِ محبت بھی ہیں عجب دو دل ملنے کو راضی ہیں
لیکن یہ تکلف حائل ہے پہلا وہ اشارا کون کرے
دل تیری جفا سے ٹوٹ چکا، اب چشمِ کرم آئی بھی تو کیا
پھر لیکے اسی ٹوٹے دل کو امید دوبارا کون کرے
جب دل تھا شگفتہ گل کی طرح ٹہنی کانٹا سی چبھتی تھی
اب ایک فسردہ دل لے کر گلشن کی تمنا کون کرے
بسنے دو نشیمن کو اپنے پھر ہم بھی کریں گے سیرِ چمن
جب تک کہ نشیمن اُجڑا ہے پھولوں کا نظارا کون کرے
اک درد ہے اپنے دل میں بھی، ہم چپ ہیں دُنیا ناواقف
اوروں کی طرح دہرا دہرا کر اس کو فسانا کون کرے

کشتی موجوں میں ڈالی ہے مرنا ہے یہیں جینا ہے یہیں
اب طوفانوں سے گھبرا کر ساحل کا ارادا کون کرے
ملا کا گلا تک بیٹھ گیا، بہری دنیا نے کچھ نہ سُنا
جب سننے والا ہو ایسا رہ رہ کے پکارا کون کرے

جون 1939

(7)

نہیں میں پیار کے قابل تو مجھ کو پیار نہ کر
مگر نگاہِ ترحم سے شرمسار نہ کر
یہ رازِ دوست ہے الفت کو آشکار نہ کر
جو ہو سکے تو نظر تک کو راز دار نہ کر
نہ شاخ ہی پہ کہیں سوکھ جائیں پھول مرے
جو توڑنا ہوں تو اب توڑ انتظار نہ کر
بدل نگاہِ غضب کو نہ تو تغافل سے
تعلقات گوارا کو نا گوار نہ کر
اب اس قدر بھی نہ دنیا کو کم نگاہ سمجھ
غموں کو خندۂ باطل سے آشکار نہ کر
دیارِ حسن کی رنگینیاں قبول مگر
نگاہ شوق کا جلدی سے اعتبار نہ کر
کٹا ہے ناصحِ مشفق سے گفتگو میں جو وقت
اُسے تو زیست کی میعاد میں شمار نہ کر
مآلِ زیست سے گھبرا کے کر نہ خونِ شباب
خزاں کے خوف سے رسوائی بہار نہ کر

خزاں رسیدہ چمن کی بہار ہی کیا ہے
مری بہار سے اندازۂ بہار نہ کر
جفائے دوست پہ شکوے نہ چھیڑا ے ملا
عدو کے رنگ کو بھولے سے اختیار نہ کر

جون 1939

(8)

ہر اک دل نہیں بہرہ یابِ محبت
سکوں کھو کے ملتی ہے تابِ محبت
سنبھل کر ذرا تیز گامِ تمنا
کہیں دے نہ دھوکا سرابِ محبت
رُخِ حسن کا سب بھرم کھل نہ جائے
نہ دیکھو اُٹھا کر نقابِ محبت
بدل جائیں گے خود نگاہوں کے تیور
تغافل سے کب تک جوابِ محبت
یہ کس نے نظر کی کہ ہر ذرّۂ دل
تڑپ کر بنا آفتابِ محبت
ہنسو یوں نہ آغازِ اُلفت پہ میرے
کہیں لے نہ بدلہ شبابِ محبت
عجب حالتِ دل ہے غم میں کسی کے
نہ تابِ جُدائی نہ تابِ محبت
محبت کبھی کر کے دیکھو تو ملا
یونہی کب تلک مستِ خوابِ محبت

اگست 1939

(9)

یہی ہیں ترا نام کر جانے والے
ترے غم میں جی جی کے مر جانے والے

کہیں دے نہ دھوکا سرابِ تمنا
ذرا ہوش میں بے خبر جانے والے

گزر گاہِ ہستی سے لیتا ہوا جا
ہر اک شے کا دل پر اثر جانے والے

یہی موجِ ساحل ہے طوفانِ دل کی
یہ قطرے جو ہیں نا نظر جانے والے

محبت کی بازی خرد خاک سمجھے
اسے جیت جاتے ہیں ہر جانے والے

اندھیرے مکاں کے لیے روشنی دی
ان آنکھوں کو اشکوں سے بھرنے جانے والے

ذرا غور سے دیکھو پھر روئے ہستی
فقط ظاہری حسن پر جانے والے

یہ ملا کو بیٹھے بٹھائے ہوا کیا
ابھی دن نہ تھے اس کے مر جانے والے

اکتوبر 1939

(10)

اُسی کو جس نے نہ کی بھول کر بھی بات کبھی
بغیر یاد کیے کٹ سکی نہ رات کبھی

سمجھ میں آئی ہمیں عشق کی نہ بات کبھی
یہی حیات یہی دشمنِ حیات کبھی

بس ایک پھول نمایاں ہے دل کے داغوں میں
یہاں رُکی تھی تری چشمِ التفات کبھی
ہمیں پہ انجمنِ دوست کا مدارِ سخن
وہ ہم جو کہہ نہ سکے اپنے دل کی بات کبھی
وہ آب و تاب شب غم تھی اشکِ رنگیں کی
اس اہتمام سے نکلی نہ تھی برات کبھی
اک انتقامِ محبت نظر میں ہے ملا
وہ لگ گئے جو مری آرزو کے ہات کبھی

نومبر 1939

(11)

جھجک اظہارِ ارماں کی بہ آسانی نہیں جاتی
خود اپنے شوق کی دل سے پشیمانی نہیں جاتی
تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اُڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی
افق پر نور رہ جاتا ہے سورج ڈوبنے پر بھی
کہ دل بجھ کر بھی نظروں کی درخشانی نہیں جاتی
سوئے دل آکے اب چشمِ کرم بھی کیا بنا لیگی
شعاعِ مہر سے صحرا کی ویرانی نہیں جاتی
یہ بزمِ دیر و کعبہ ہے نہیں کچھ صحنِ میخانہ
ذرا آواز گونجی اور پہچانی نہیں جاتی
کسی کے لطفِ بے پایاں نے کچھ یوں سوئے دل دیکھا
کہ اب نا کردہ جرموں کی پشیمانی نہیں جاتی

تغافل پر نہ جا اس کے، تغافل ایک دھوکا ہے
نگاہِ دوست کی تحریکِ پنہانی نہیں جاتی
نظر جھوٹی، شباب اندھا، وہ حسن اک نقش فانی ہے
حقیقت ہے تو تو ہو لیکن ابھی مانی نہیں جاتی
میسر ہے ہر اک ایماں میں مجھ کو ذوق کا سجدہ
کوئی مذہب بھی ہو بنیادِ انسانی نہیں جاتی
نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہو
قیامت تک پھر اس دل کی پریشانی نہیں جاتی
نہ سمجھو ضبطِ گریہ سے خطا پر میں نہیں نادم
کہ آنسو پونچھ لینے سے پشیمانی نہیں جاتی
نہ پوچھو تجرباتِ زندگانی چوٹ لگتی ہے
نظر اب دوست اور دشمن کی پہچانی نہیں جاتی
زمانہ کروٹوں پر کروٹیں لیتا ہے اور ملا
تری اب تک وہ خواب آور غزل خوانی نہیں جاتی

دسمبر 1939

(12)

اُفقِ دہر پہ اک مہرِ درخشاں نکلا
میں نے دیکھا تو چراغ تہِ داماں نکلا
نہ چھپا پر نہ چھپا خونِ شہیدانِ وفا
غنچہ غنچہ میں عیاں رازِ گلستاں نکلا
تیری اُجڑی ہوئی جنت کو بسانے والا
وہی غصہ میں نکالا ہوا انساں نکلا

تختۂ مشقِ نگاہِ غلط انداز سہی
شکر ہے دل کسی خدمت کے تو شایاں نکلا
آج پھر تازہ ہوئی بزم میں یادِ ملا
کیا ترے در سے کوئی بے سرو ساماں نکلا

نوروز

آج پھر گلشن ہستی میں بہار آئی ہے
پھر ہر اک غنچہ و گل محوِ خود آرائی ہے
پتی پتی سے عیاں جلوۂ زیبائی ہے
ہر شجر مظہرِ کیفیتِ رعنائی ہے
جس طرف بادِ صبا آج نکل جاتی ہے
نئی کلیوں کے چٹکنے کی صدا آتی ہے

آج آتا ہے نئے سر سے شبابِ دنیا
اک نیا جام بدلتی ہے شرابِ دنیا
کچھ ذرا اور سرکتی ہے نقابِ دنیا
اک ورق اور پلٹتی ہے کتابِ دنیا
ختم پر حسرتِ ماضی کا فسانہ آیا
پھر زمانے کے بدلنے کا زمانہ آیا

پھر تمنا کی نظر میں کوئی تصویر سی ہے
پھر ارادوں میں ذرا ہمت تعمیر سی ہے
دل پُر شوق میں پھر جرأت تقصیر سی ہے
آج کچھ چیز ہوا میں ہے جو اکسیری ہے
رُوئے ارماں پہ ہے رنگینیٔ غازہ پھر سے
آج جی میں ہے کوئی عہد ہوتا تازہ پھر سے

زیست بے کیف ہے کچھ غیرِ سکوں جس میں نہیں
اشک بے رنگ ہے آمیزشِ خوں جس میں نہیں
درد وہ درد نہیں سوزِ دروں جس میں نہیں
عشق وہ خام ہے اندازِ جنوں جس میں نہیں
خون ہے جوشِ تمنا میں اُبلنے کے لیے
زیست ہے موت کی آغوش میں پلنے کے لیے

پھول کب تک کھلیں پیغامِ بہاراں لے کر
دستِ گلچیں کے لیے دولتِ داماں لے کر
عشرتِ خانۂ صیاد کا ساماں لے کر
اس سے بہتر ہے کہ مٹ جائیں گلستاں لے کر
شاہد اس جذبۂ غیرت کا زمانہ تو رہے
ہم رہیں یا نہ رہیں اپنا فسانہ تو رہے

طنز سے محفلِ اغیار میں چرچا تو نہ ہو
جس سے ماضی کو حیا آئے وہ فردا تو نہ ہو
ہم مٹیں ہم پہ مگر خندۂ اعدا تو نہ ہو
خونِ ہستی ہو مگر خونِ تمنا تو نہ ہو
یہی پیغامِ جنوں آج صبا لائی ہے
وہی زندہ ہے کسی دُھن میں جو سودائی ہے

تپشِ درد کو پھر تابِ دل افروزی دیں
ناوکِ شوق کو پھر اذنِ جگر دوزی دیں
پھر کسی برق کو پیغامِ نظر سوزی دیں
آج پھر زیست کو اک مژدۂ نو روزی دیں
پھر مے و گل لیے دوشیزہ سال آئی ہے
آج تقصیر کوئی ہے تو شکیبائی ہے

جہاں میں ہوں

وہی حرص و ہوس کا تنگ زنداں ہے جہاں میں ہوں
وہی انساں وہی دنیائے انساں ہے جہاں میں ہوں

تمنا قید، ہمت پابجولاں ہے جہاں میں ہوں
مجھے جکڑے ہوئے زنجیرِ امکاں ہے جہاں میں ہوں

کبھی شاید یہ محفل بھی ستاروں سے چمک اُٹھے
ابھی تو اشک بے کس سے چراغاں ہے جہاں میں ہوں

کسی دن تپتے تپتے یہ بھی شاید سُرخ ہو جائے
ابھی پانی کا ایسا خونِ دہقاں ہے جہاں میں ہوں

کبھی شاید فرشتہ آدمِ خاکی بھی بن جائے
ابھی تو بھیس میں انساں کے شیطاں ہے جہاں میں ہوں

کسی قیمت پہ بھی انسانیت ڈھونڈے نہیں ملتی
مگر جنسِ خدائی اب بھی ارزاں ہے جہاں میں ہوں

ہوائے علم شمعیں روح کی گُل کرتی جاتی ہے
خرد کے ہاتھ میں دل کا گریباں ہے جہاں میں ہوں

افق پر ہوں تو ہوں دُھندلے سے کچھ جلوے مسرت کے
ابھی راحت فقط اک خواب ارماں ہے جہاں میں ہوں

غرض مندی کی پوجا عام ہے یوں ہر شوالے میں
محبت اپنی فطرت پر پشیماں ہے جہاں میں ہوں

ابھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں
ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے جہاں میں ہوں

کسی دن کوئی چنگاری نہ دنیا کو جلا ڈالے
جہاں خود اپنے شعلوں سے ہراساں ہے جہاں میں ہوں

غلاموں کی ہنسی ہی کیا بس اک آواز بے نغمہ
بہار باغ ہر رنگ بیاباں ہے جہاں میں ہوں

نظر میں ہیں تصور کے وہی موہوم نظارے
ابھی انساں حقیقت سے گریزاں ہے جہاں میں ہوں

فقط ہلکی سی سطحِ آب پر ہے ایک جنبش سی
زبانوں پر فقط اک ذکرِ طوفاں ہے جہاں میں ہوں

خدا وہ دن تو لائے سوز بھی اک ساز بن جائے
ابھی ہر ساز میں اک سوز پنہاں ہے جہاں میں ہوں

مجھے بھی شوقِ آزادی ہے لیکن کیا کروں اس کو
مرے چاروں طرف زنداں ہی زنداں ہے جہاں میں ہوں

بدلنے کو بدل جائے جہاں لیکن ابھی ملا
وہی دنیائے برق و باد و باراں ہے جہاں میں ہوں

جون 1939

میری دنیا

(1)

بزمِ جہاں میں تیرے قابل نہ بن سکوں گا
افسردہ دل ہوں زیبِ محفل نہ بن سکوں گا
اک عارضی نمائش روحِ نظام تیری
رنگینیِ تصنع جانِ کلام تیری
تیرے چراغِ محفل دل ہیں جلے ہوؤں کے
نغموں کا زیر و بم ہے تاروں پہ آنسوؤں کے
چہروں پہ جن کے جھوٹی سرخی سی ہے خوشی کی
چوٹیں ہیں ان کے دل میں ضرباتِ زندگی کی
دھوکا نہ کھاؤں گا میں ظاہر کے چٹکلوں سے
نالے چھپا رہی ہے تو اپنے قہقہوں سے
جو تشنگی بجھائے تجھ میں وہ شے نہیں ہے
ساغر تو خوش نما ہے ساغر میں مے نہیں ہے
دل کے بجائے تیرے سینہ میں اب ہے پتھر
بے رُوح ہو چکا ہے تیرا حسیں پیکر
میری نظر میں تو ہے اک مصریوں کا مردہ
ظاہر ترا شگفتہ باطن ترا فسردہ
شعلوں میں تیرے تپکر انساں پگھل گئے ہیں
بازارِ زندگی کے سکّے بدل گئے ہیں

طاقت کی ہے پرستش اب تیرے معبدوں میں
سونے کے دیوتا ہیں تیرے صنمکدوں میں
دل کانپتا ہے میرا انساں کی طاقتوں سے
لگتا ہے خوف مجھ کو اونچی عمارتوں سے
لاشوں پہ ہے بنائے ایوانِ کامیابی
چونے کی جا لہو ہے اینٹیں ہیں ہڈیوں کی
سینچی ہوئی لہو سے سب تیری کیاریاں ہیں
مسروقہ دولتوں پر سرمایہ داریاں ہیں
چٹکی میں مل گیا جو اس کو مسل ہی ڈالا
زیرِ قدم جو آیا کچ سے کچل ہی ڈالا
انساں اتر رہا ہے رسمِ درندگی پر
تہذیب آگئی ہے حدِ برہنگی پر
کیا جہدِ زندگی میں طبعِ بشر یہی ہے
سو بار موت بہتر جینا اگر یہی ہے

(2)

اک بار دورِ گردوں ایسا نظام بھی ہو
جس میں ہر ایک میکش صہبا بہ جام بھی ہو
مظلوم کا کلیجہ تیرِ ستم نہ ڈھونڈے
ایوانِ شادمانی بنیادِ غم نہ ڈھونڈے
اک آرزوئے باطل فکرِ سکوں نہ ٹھہرے
الفت فقط مذاقِ اہلِ جنوں نہ ٹھہرے

تصویرِ نامرادی نقشِ جبیں نہ نکلے
راحت دلِ حزیں کا خوابِ حسیں نہ نکلے
کھوٹے تکلفوں میں اُلجھی نہ گفتگو ہو
دل کی کھری زباں میں اظہارِ آرزو ہو
انسان غاصبانہ راہوں سے ہٹ چکا ہو
پیشانیِ بشر کا تیور پلٹ چکا ہو
برفِ خرد میں جھل کر دل سُن نہ ہو گئے ہوں
آنکھوں میں آنسوؤں کے سوتے نہ جم چکے ہوں
غیروں کے درد پر بھی دل میں ذرا کسک ہو
خونِ سفید میں کچھ سرخی کی بھی جھلک ہو
انسانیت کا پودا ٹھٹھرے نہ جس ہوا میں
دل کا بھی سانس لینا ممکن ہو جس فضا میں
ایسی زمیں بھی کوئی کیا زیرِ آسماں ہے
میرے خیال بتلا دنیا مری کہاں ہے

زمینِ وطن

زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

ازل میں جہاں سب سے پہلے حیات
لیے اپنی آغوش میں کائنات
جلاتی ہوئی شمعِ ذات و صفات
حجاب عدم سے ہوئی جلوہ زن
زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں بسترِ برف سے مستِ خواب
اُٹھا آنکھ ملتا ہوا آفتاب
لٹاتی ہوئی جلوۂ بے نقاب
جہاں آئی پہلی سنہری کرن
زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں پہلے تخلیقِ انساں ہوئی
تری رحمت اس کی نگہباں ہوئی
خرد اس کی گہوارہ جنباں ہوئی
بشر نے تمدن کے سیکھے چلن
زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں ابنِ آدم پلا گودیوں
جہاں نسلِ انساں چلی گھٹنیوں
جہاں چشمِ حیرت کے کیا اور کیوں

لبِ طفل تک آئے بن کر سخن
زمیں وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں خیر و شر میں ہوا امتیاز
بنی زیست مجموعۂ سوز و ساز
کھلا رازِ ایماں سے ہستی کا راز
تراشے گئے ایزد و اہرمن
زمیں وطن! اے زمینِ وطن!!

وہ انساں کا بڑھتا ہوا اعتقاد
بنے دیوتا آتش و آب و باد
پرستش پہ دارومدارِ مراد
وہ ویدوں کے میٹھے سُریلے بھجن
زمیں وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں اک کنول پر بہ صد دلبری
اُٹھی دودھ کے کنڈ سے لکشمی
قدم شِو کے شانوں پہ دھرتی ہوئی
اُتر آئی گنگا جہاں خندہ زن!
زمیں وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں تیرے جلوے ہویدا ہوئے
جہاں اہلِ دل ان پہ شیدا ہوئے
جہاں گوتم اور کرشن پیدا ہوئے
جہاں سازِ فطرت ہوا نغمہ زن
زمیں وطن! اے زمینِ وطن!!

گئے چھوڑ کر اپنے اپنے نشاں
ہوئے باری باری جہاں کامراں
جہاں آکے اُترا ہر اک کارواں
مغل، آریہ، ترک تاتار ہن
زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

لیے غیر ملکوں نے تجھ سے سبق
تری داستاں کے اُڑائے ورق
ترے خوشہ چیں از شفق تا شفق
عرب، مصر، یونان، چین و ختن
زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

شبستانِ ایراں کا سامان و ساز
ترقیِ بازارِ وینس کا راز
وہ خود اہلِ روما کو تھا جن پہ ناز
ترے دستکار اور ترے اہلِ فن
زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

کہاں ہیں ترے سورما صف شکن؟
ترے اہلِ دانش ترے اہل فن؟
کہاں ہے ترا اقتدارِ کہن؟
ترے رام لچھمن، بھرت شترگن
زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

کسے آئے گا آج اس کا یقیں
اشوک اور اکبر کی اے سر زمیں
ترے در پہ گھستی تھی دنیا جبیں

کبھی تو ہی تھی سجدہ گاہِ زمن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!
ترے کوہ و دریا جمال آفریں
تری وادیاں رشکِ خلدِ بریں
کسی نے تجھے یوں بنایا حسیں
کہ جیسے سنواری گئی ہو دُلہن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!
نہیں کوئی تیرے لیے پُرخروش
تری راہ میں عازم و سخت کوش
نہ نادر کا جذبہ نہ غزنی کا جوش
نہ وہ بندۂ زر نہ وہ بت شکن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!
کوئی اب تری سمت آتا نہیں
نظر تیری جانب اُٹھاتا نہیں
تجھے کوئی اپنا بناتا نہیں
کہ جیسے کوئی لاش ہو بے کفن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!
مِٹا کر تری گرم بازاریاں
بنیں اہلِ یورپ کی زرداریاں
ترے خوں کی سینچی ہوئی کیاریاں
یہ مغرب کے سب لہلہاتے چمن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

نہیں کون آلودہ خون و خاک
ہوا ہو نہ جو اس فضا میں ہلاک
جسے کہہ سکیں ہم غلامی سے پاک
نہ سنگِ ہمالہ نہ آبِ جمن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

ترے دورِ ماضی کے آئینہ دار
تری شانِ اسلاف کی یادگار
کہیں کچھ کھنڈر ہیں کہیں کچھ مزار
نہ وہ اہلِ محفل نہ وہ انجمن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

یہ دہلی کے نقش و نگار خموش
یہ چتوڑ کی خاک لالہ فروش
یہ کیلاش کی چوٹیاں برف پوش
تجھے ڈھونڈتی ہیں عروجِ کہن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

یہ معصوم بچے ترے شیر خوار
امیدیں لیے شوق سے ہم کنار
گلے ان کے ہوں اور غلامی کے ہار
اور آئے نہ تیری جبیں پر شکن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

یہ دوشیزگانِ وطن سبز فام
رہیں یوں کنیزیں، جنیں یوں غلام
تری تیغ غیرت نہ ہو بے نیام

ہوا ہے سفید آہ خونِ وطن
زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

تجھے صولتِ بابری کی قسم
تجھے عِصمتِ پدمنی کی قسم
تجھے خاک پانی پتی کی قسم
پھر اک بار دکھلا جلالِ کہن
زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

بدلنے کو ہے موسمِ روزگار
ہواؤں میں ہے ایک کیفِ خمار
تری سمت پھر آرہی ہے بہار
لیے پھر گل و لالہ و نسترن
زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

پھر آنے کو ہیں بوئے گلشن اسیر
برسنے کو ہے پھر گھٹاؤں سے نیر
چٹانوں میں ہے مضطرب جوئے شیر
کہاں ہے کہاں تیشۂ کوہکن
زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

اخوت کا پھر ہاتھ میں جام لے
مساواتِ انساں کا پھر نام لے
روایاتِ ماضی سے پھر کام لے
وطن کو بنا در حقیقت وطن
زمین وطن! اے زمینِ وطن!!

~~~~~~
~~~~~~

1940

غزلیات

ہجر کی شب گھڑی گھڑی دل سے یہی سوال ہے
جس کے خیال میں ہوں گم اُس کو بھی کچھ خیال ہے

ہائے رِی بے بسیِ شوق دل کا عجیب حال ہے
اُس کا جواب سُن چکا پھر بھی وہی سوال ہے

خواب وفسوں نہیں تو کیا، دل یہ جنوں نہیں تو کیا
خلوتِ دوست اور تو تیرا کہاں خیال ہے

میں ترے در کو چھوڑ دوں، شرطِ وفا کو توڑ دوں
سونچ خود اپنے دل میں تو کیا یہ مری مجال ہے

شرم سی نذر دل کی ہے اُٹھتی نہیں نگاہِ شوق
عشق کی منزلوں میں اک منزلِ انفعال ہے

چاہیں گے گر تو دل کی بات، آپ ہی جان لیں گے وہ
منھ سے کہوں تو کیا کہوں شکل مری سوال ہے

بات انھیں کی مان لی جیسے میں ہی خطا پہ تھا
ان کو کہیں یہ شک نہ ہو دل میں مرے ملال ہے

اب تری جستجو ہوئی ہمتِ دل کے حسبِ ذوق
تو نے یہ جب سے کہدیا یہ طلب محال ہے

سطحِ مذاقِ بزم پر ملا اُتر کے آنہ تو
اوروں کا جو کمال ہے تیرے لیے زوال ہے

جنوری 1940

(2)

دیکھا کچھ آج یوں کسی غفلت شعار نے
میں اپنی عمر رفتہ کو دوڑا پکارنے

ہنگامۂ شباب کی پوچھو نہ سر گزشت
اپنے چمن کو لوٹ لیا خود بہار نے

پیکانِ تیر زہر میں اتنے بجھے نہ تھے
کچھ اور کر دیا ہے نظر کو خمار نے

حسرت بخیر دل کی شکایت کی داستاں
ہونٹوں کو سی دیا نگۂ شرمسار نے

ہمت پڑی نہ شیخ سے کہنے کی محتسب
آئے ہو اک غریب پہ غصہ اتار نے

وہ تو کہو کہ آئی قفس تک بھی بوئے گل
ورنہ بھلا دیا تھا ہمیں تو بہار نہ

جو حکِ گل تھے طرۂ دستار بن گئے
جو گل تھے آئے تربت بیکس سنوار نے

آئے ہو کیا تمہیں مجھے آواز دو ذرا
آنکھوں کا نور چھین لیا انتظار نے

آلامِ روز گار سے ملا کو کیا غرض
اپنا بنا لیا ہے اسے چشمِ یار نے

جنوری 1940

(3)

تجھی کو آنکھ اُٹھانے کی ارے ملا نہ تاب آئی
حقیقت ورنہ آئی سامنے اور بے نقاب آئی

شبِ غم بھی مہک اٹھی خیال دوست کے صدقے
ہر اک آنسو کے قطرہ میں مجھے بوئے گلاب آئی

بھلا میری یہ ہمت تھی کہ تم سے عرضِ دل کرتا
جبینِ بے شکن دیکھی تو کچھ کہنے کی تاب آئی

مجھے دھوکا نہ دیتی ہوں کہیں ترسی ہوئی نظریں
تمھیں ہو سامنے یا پھر وہی تصویرِ خواب آئی

تری چشمِ کرم کے سوئے دل آنے کو کیا کہیے
کہ جیسے کنجِ زنداں میں شعاعِ ماہتاب آئی

تجھے یہ حق تو حاصل ہے بدل دے رسم در اپنی
ابھی تک تو کفِ سائل ہمیشہ کامیاب آئی

جسے میں چاہتا ہوں وہ اگر قسمت سے بالا ہے
مرے حصّے میں کیوں میری نگاہِ انتخاب آئی

کرن مہتاب کی پھولوں میں جب تھی جانِ تسکیں تھی
یہی ذرّوں میں کیا آئی کہ موجِ اضطراب آئی

قفس کی تیلیاں بن جائیں شاخِ گل تو ہم جانیں
چمن میں شور ہے ہر سو ہوائے انقلاب آئی

خرد جھوٹی حقیقت سے لگی جب مجھ کو بہکانے
مرے دل کے پیمبر پر محبت کی کتاب آئی

شبِ غم بھی مجھے پیاسا نہ چھوڑا میرے ساقی نے
مری آنکھوں سے چھن کر میرے حصّہ کی شراب آئی

سُوارت ہو گئی ملا کی عمرِ رائگاں آخر
انھیں آج اس کی یاد آئی اُسے یادِ شباب آئی

جنوری 1960

(4)

امیدوں ہی پہ کاٹی ہے ابھی تک زندگی اپنی
کہاں گم ہو گئی آخر وہ حصّہ کی خوشی اپنی
تبسّم سے ترے دل کو ملی تابندگی اپنی
تری نظروں کے سائے میں کھلی ہے چاندنی اپنی
کوئی کب تک کیے جائے مسلسل خودکشی اپنی
خرد سے انتقام دل ہے یہ دیوانگی اپنی
بتائے کیا وہ غم اپنا وہ کیا سمجھے خوشی اپنی
کہ جس نے زندگی اپنی نہ جانی زندگی اپنی
مرا غم دیکھ کر، میں اور کچھ تم سے نہیں کہتا
اگر یہ ہو سکے تم سے تو پی جانا ہنسی اپنی
تری محفل میں ہوں میں بھی مگر بیگانۂ محفل
کسی زنجیر میں جُڑتی نہیں شاید کڑی اپنی
شبِ غم کی سیاہی اور بڑھ جاتی ہے اشکوں سے
کھٹکتی ہے اب اپنی آنکھ میں خود روشنی اپنی
نہ رکھ ہر در پہ سر ذوقِ جبیں آلودہ ہوتا ہے
نہ جانے کون کب مانگے مجھے دے بندگی اپنی
خزاں کے بعد کتنی ہی بہاریں باغ میں آئیں
نہ آنا تھی نہ آئی جا کے ہونٹوں پر ہنسی اپنی
ہجومِ یاس و حرماں کو بھی سینہ سے لگا لوں گا
جسے تم زندگی کہہ دو وہی ہے زندگی اپنی
غمِ افسردگی کیوں ہو سوارت ہو چکا جینا
ہوائے باغ میں حل ہو گئی ہے تازگی اپنی

محبت میں کوئی شے کامیابی ہے نہ ناکامی
نظر ملتے ہی اس سے زیست قیمت پا گئی اپنی
ہوا میں جیسے اک خوشبو سی ہے مرجھائے پھولوں کی
مگر ملا کو یاد آئی ہے شامِ زندگی اپنی
نومبر 1940

(5)

دُنیا خوشی میں غم کو بُھلاتی چلی گئی
اپنا فریب آپ ہی کھاتی چلی گئی
پردے حقیقتوں پہ گراتی چلی گئی
دل کے چراغ عقل بجھاتی چلی گئی
مایوسیوں کی بزم میں یوں آئی اس کی یاد
سوکھے بنوں میں آگ لگاتی چلی گئی
آتا رہا غموں میں بھی لب پر سرودِ زیست
اک جوئے آب دشت میں گاتی چلی گئی
وہ التجائے دل جو زباں تک نہ آسکی
اشکوں میں چھپ کے چشم تک آتی چلی گئی
جانِ بہار دل کی طرف بھی وہی نظر
جو ہر کلی کو پھول بناتی چلی گئی
اس شمع کی حیات بھی کوئی حیات ہے
جو اپنی لو ہوا سے بچاتی چلی گئی
دنیا نہ ٹھوکر سکی ملا کی رسمِ عشق
لیکن اسی مذاق پہ آتی چلی گئی
دسمبر 1940

(6)

رُخ اپنا آئینہ مجھ کو بنا کے دیکھ لیا
مری نگاہ کے پردے میں آ کے دیکھ لیا

جو دوست تھے انھیں دشمن بنا کے دیکھ لیا
زباں پہ دل کی تمنّا کو لا کے دیکھ لیا

حقیقتِ غمِ ہستی کے نقش مٹ نہ سکے
طلسم خانۂ ارمان بنا کے دیکھ لیا

وہ بے خبر مرے سوزِ جگر سے پھر بھی نہیں
ہر اک نگاہ پہ پردہ گرا کے دیکھ لیا

انھیں قبول نہیں عشق رائگاں اپنا
قدم قدم پہ نگاہیں بچھا کے دیکھ لیا

اب اور اس سے سوا چاہتے ہو کیا ملا
یہ کم ہے اس نے تمھیں مسکرا کے دیکھ لیا

دسمبر 1940

تم

سحر کی یاد ہو تم اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم
تمھیں خیال کی رعنائیوں میں دیکھا ہے
تمھیں امید کی تنہائیوں میں دیکھا ہے
تمھیں کو روح کی گہرائیوں میں دیکھا ہے
جدھر بھی آنکھ اُٹھی ہے فروغِ بام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم______________

ہر ایک امید کا میری تمھیں ہو گہوارہ
تمھیں ہو جیسے ہر اک درد کا مرے چارہ
تمھیں پہ آکے ٹھہرتی ہے چشمِ آوارہ
ہر ابتدائے محبت کا اختتام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم______________

میں کون؟ اک گلِ افسردہ و دلِ ناشاد
تم ایک بزم کی زینت تم اک چمن کی مراد
کہاں تم اور کہاں مجھ سا زندگی برباد
مرے نصیب کی جس میں نہیں وہ جام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم______________

اُفق حیات کا پھر بھی تمھیں سے ہے زرّیں
ہر ایک بزمِ تصوّر تمھیں سے ہے رنگیں
تمھاری سمت ہے دل کی نگاہ بازپسیں

اندھیری زیست کی اک زرنگار شام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم ______________

کروں میں عرضِ تمنا مری مجال نہیں
سوال دل میں ہے اور جرأتِ سوال نہیں
تمھاری یاد سے غافل خیال نہیں
میں کچھ کہوں نہ کہوں حاصلِ کلام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم ______________

خموشیوں میں ہے دمساز کون؟ تم جو نہیں
نظر نظر کا مری راز کون؟ تم جو نہیں
نفس نفس کی ہے آواز کون؟ تم جو نہیں
پیام بر ہوں اگر میں مرا پیام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم ______________

کسی نگاہ کا جو دل غلام ہو نہ سکا
جو سر کبھی کسی چوکھٹ پہ آج تک نہ جھکا
تمھارے در پہ وہی آج ہے جبیں فرسا
تو کیا جہاں کا ملا سے انتقام ہو تم؟
سحر کی یاد ہو تم ______________

جنوری 1940

مسز حامد علی

(یہ نظم آل انڈیا ویمنس کانفرنس 1940 کے سالانہ اجلاس میں جو الہ آباد میں
27/ جنوری کو زیر صدارت مسز حامد علی منعقد ہوا تھا حسب فرمائش پڑھی گئی تھی)

(1)

پھر بہار آئی ہوا شاداب پھر بستانِ قوم
جمع اک مرکز پہ ہیں پھر آج خاتونانِ قوم
پھر نئی ضو ہے، نئے جلوے، نئے انوار ہیں
آج دیکھے تو کوئی آکر رُخِ تابانِ قوم
ان میں ہر دیوی ہر اک خاتون ہے اپنی جگہ
فخرِ قوم و نازِ قوم و روحِ قوم و جانِ قوم
اپنی بہنوں کی بھی خواہش ہے ان کا مدّعا
ان کے تابع قوم ہے، یہ تابعِ فرمانِ قوم
ایک دن ان کو ملے گا اپنی محنت کا صلہ
ایک دن مشکور ہوگی سعیٔ بے پایانِ قوم
سوئے گلشن آئے گا پھر قیدیوں کا قافلہ
ایک دن توڑیں گی یہ قفلِ درِ زندانِ قوم
ان کے سینوں میں ہے پوشیدہ امانت قوم کی
ان کے چہروں سے ہے ظاہر جذبۂ پنہانِ قوم
ان کے ہونٹوں کا تبسم ہے خزانہ قوم کا
ان کی چمکیلی نگاہیں حاصلِ ارمانِ قوم

پھول ان کی گود کے چھینے بھی جائیں گے اگر
ان کے ہاتھوں سے نہ چھوٹے گا مگر دامانِ قوم
ان کی تصویروں سے ہوگی زینتِ محراب وطاق
جب سجائی جائے گی پھر محفلِ ویران قوم
ان کی قوت قوم کے بازو کی اب تسکین ہے
صنفِ نازک ان کو کہنا قوم کی توہین ہے

(2)

لیجیے جلسہ میں گونج اٹھی وہ آوازِ وطن
ہو رہا ہے منکشف ہر ایک پر رازِ وطن
آج کے جلسے میں آئی ہیں صدارت کے لیے
کون وہ خاتونِ ذیشان ملیہ نازِ وطن
جان و دل سے قوم کی حامی مسز حامد علی
ہاں وہی جو ہیں علاجِ طبعِ نا سازِ وطن
ہاں وہی عباس طیب جی کی زندہ یادگار
وہ علمبر دارِ آزادی وہ جانبازِ وطن
اپنی بہنوں کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں یہ
پھر رہی ہے ان کی نظروں میں تگ و تازِ وطن
ان کی ہر تحریر میں ہے ایک پیغام خلوص
ان کی ہر تقریر میں شامل ہے آوازِ وطن
گفتگو میں سحر ہے لیکن بحدِ اعتدال
دلکشی نظروں میں ہے لیکن باندازِ وطن
ان کی سیرت ہے فرشتوں کے لیے سامانِ رشک

ان کی صورت جلوہ حسنِ خدا سازِ وطن
فخر سے ہاتھوں کو اپنے چومتا ہے بار بار
لوحِ دل ان کی بنا کر آئینہ سازِ وطن
ان کی ہر تصویر نقاشی کا ہے اک شاہکار
یہ مجسم آپ ہیں اک نغمہ سازِ وطن
بزمِ انجم میں مثالِ ماہِ تاباں ہیں یہی
ایسی محفل کے لیے اک صدرِ شایاں ہیں یہی

جنوری 1940

توہینِ دوستی

سمجھ رہا ہوں میں خوب اس کو بھلا کہاں تو کہاں میں بیکس
مجھے کچھ اس کا گلہ نہیں ہے کہ فرق یہ تو نصیب کا ہے
زباں سے ملا کو دوست کہہ کر مگر نہ توہینِ دوستی کر
ذرا خیالوں کا جائزہ لے کہیں گزر بھی غریب کا ہے
نہیں وہ تیرے کرم کے شایاں تو کیوں اُسے دے حسین دھوکا
کہ وہ سمجھ بوجھ کر ہے ناداں ہنوز امکاں فریب کا ہے

جنوری 1940

آثارِ وقت

ہر اک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اک عصرِ نو کی بہار آ رہی ہے

بدلنے کو ہے پھر نظامِ زمانہ
ہوا ختم وہ دورِ شاہنشہانہ
لبِ دہر پر ہے نیا اک فسانہ
ترانے نئے زندگی گا رہی ہے
ہر اک سمت ________

خفا اس تغیر پہ جو ہو رہے ہیں
ابھی خوابِ غفلت میں جو سو رہے ہیں
زمانہ کی حالت پہ جو رو رہے ہیں
زمانہ کو ان پر ہنسی آ رہی ہے
ہر اک سمت ________

یہ جھگڑا نہیں سلطنت کا
نہ یہ تفرقہ مذہب وقومیت کا
تصادم یہ ہے ذہنیت کا
دلوں میں لڑائی لڑی جا رہی ہے
ہر اک سمت ________

ہر اک عہدِ ہستی میں یہ جلوہ گر ہے
اسی پر مدارِ اُمیدِ بشر ہے
کچھ ایسا جہانگیر اس کا اثر ہے

کہ دنیا سمٹتی چلی جا رہی ہے
ہراک سمت______

اِدھر اہلِ دولت کا جھنڈا گڑا ہے
اُدھر بے نواؤں کا ڈیرا پڑا ہے
جہاں دو قطاریں بنائے کھڑا ہے
زمیں جیسے گردوں سے ٹکرا رہی ہے
ہراک سمت______

یہی چاہتے ہیں جو ہیں اہلِ ثروت
ہے مُٹھی میں جن کی عنانِ حکومت
کسی طور ہاتھوں سے جائے نہ طاقت
مگر پھر بھی طاقت چھِنی جا رہی ہے
ہراک سمت______

حکومت کا لیکن طریقہ نہ بدلا
پڑا ہے ابھی تک نگاہوں پہ پردا
ہے انداز اب بھی وہی گفتگو کا
وہی راگ گائے چلی جا رہی ہے
ہراک سمت______

کبھی بھر کے آنکھوں میں چنگاریاں یہ
دیے جا رہی ہے ہمیں دھمکیاں یہ
کبھی بن کے اک مادرِ مہرباں یہ
کھلونوں سے بچوں کو بہلا رہی ہے
ہراک سمت______

کبھی ناتوانوں کی دمساز بن کر
کبھی بے زبانوں کی آواز بن کر
کبھی خود مشیت کی ہم راز بن کر
ہمیں نیک و بد خوب سمجھا رہی ہے
ہر اک سمت________________

نہیں آتی جب کام تقریر کوئی
نہیں ٹھیک پڑتا ہے جب تیر کوئی
نہیں بنتی جب اور تدبیر کوئی
تو مذہب کے شعلوں کو بھڑکا رہی ہے
ہر اک سمت________________

مگر وقت سے کون جیتا جیتا ہے بازی
کہیں موجِ طوفاں بھی روکے ہے رُکتی
تزلزل میں ہے قصیر سرمایہ داری
فصیل اک نہ اک ٹوٹتی جا رہی ہے
ہر اک سمت________________

منظم ہیں اب فاقہ مستوں کے لشکر
کڑے پڑ رہے ہیں غریبوں کے تیور
جو اُڑانے لگی تھیں حکومت کی شہ پر
اب ان چیونٹیوں کی قضا آ رہی ہے
ہر اک سمت________________

لیے دل میں اک جذبۂ بے پناہ ہی
نگاہوں میں اک جلوہ صبح گاہ ہی
ہے پھر کارواں نوعِ انساں کا راہی

مجھے اس کے قدموں کی چاپ آ رہی ہے
ہر اک سمت ____________

مساواتِ انساں کے بڑھ او سپاہی
ترے نام دنیا کی ہے شہریاری
عروسِ جہاں ہو چلی نیم راضی
تری گرم نظروں سے شرما رہی ہے
ہر اک سمت ____________

فروری 1940

دو پھول

(1)

صبح کو ایک ہی کیاری میں دو گلاب پھول رہے تھے
ایک ہی ڈالی کی پینگوں پر جھولا جھول رہے تھے
ایک ہی رات کے پردے میں اُترا تھا ہر دو پیالا
ایک ہی شبنم کی برکھا نے دھویا گورا پنڈا
کل پتے سے بڑے ہوئے تھے دونوں سنگ ہی سنگ
ایک ہی سورج کی کرنوں نے دیا تھا روپ اور رنگ
ایک ہی مٹی اور پانی سے نازک جسم بنا تھا
ایک ہوا کی گود میں جیون کا سپنا دیکھا تھا

(2)

آئی ٹہلنے باغ میں اک چنچل مدھ ماتی نار
ایک کو اس نے توڑا اور بالوں کا کیا سنگھار
ڈالی سے بھی سوا لگا کچھ سر پر پھول وہ پیارا
جیسے بادل چیر کے ہنس دے کوئی روشن تارا
جیسے کالی پلکوں پر آنسو کا موتی دمکے
جیسے پربت کی چوٹی پر برف کی چاندی چمکے
جسے ساگر کے جل تھل پر کوئی ٹاپو ابھرے
جیسے شیش پہ شنکر کے گنگا کی دھارا اُترے

(3)

دوسرا پھول گلے گلے ڈالی ہی پر کمھلایا
ترس ترس کر ہلکے ہلکے سارا روپ گنوایا
گرم اور تیز ہوا کے جھونکوں کی وہ تاب نہ لایا
سوکھ کے آخر ڈالی پر سے ٹوٹ کے خاک پہ آیا
خاک میں مل کر خاک ہوئیں وہ نازک پنکھڑیاں بھی
جن کو دیکھ کے جلتی تھیں اندراسن کی پریاں بھی
اور تو اور اسی کیاری کی آنکھوں میں وہ کھٹکا
دور اسے لے جا کر مالی نے گھورے پر پٹکا

(4)

پھیر یہ کیسا بھاگ کا ہے کیسی یہ جگ کی ریس؟
ایک نظر کی جوت بڑھائے ایک جگر کی ٹیس
ایک کو اپنائے اور ایک کو آنکھ دکھائے باغ
ایک کو گھر کا دیا کہے اور ایک کو کُل کا داغ
ایک کا ہو ہر کنج میں چرچا ایک کو جائیں بھول
ایک کسی کے سر کا زیور ایک کے سر پر دھول
دو......گلاب......کے......پھول

اپریل 1940

انتظار

اونچی دیواروں کے اندر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے
بیٹھے ہیں مقفل کچھ انساں، انساں جو نہیں اک گنتی ہیں
ان کے بھی کبھی دن آئیں گے، ان پر بھی کریں گی لطف کبھی
وہ اندھی پریاں جو ہستی کا تانا بانا بنتی ہیں
ٹوٹے گا کبھی قفلِ زنداں جاگے گی کبھی سوئی قسمت
کچھ بیکس روحیں آس لگائے عمر کی گھڑیاں گنتی ہیں

اپریل 1940

بلّی اور چوہا

(ماخوذ از ایلس ان ونڈر لینڈ، ALICE IN WONDER LAND)

یہ بلّی نے چوہے سے اک دن کہا
بہت تو نے مجھ کو پریشاں کیا
ارادہ ہے دعویٰ کروں تجھ پہ آج
نہیں ہے مجھے اور کچھ کام کاج
یہ ڈرتے ہوئے موش نے عرض کی
نہیں یہ خطا مجھ سے سرزد ہوئی
کوئی اس میں دھوکا ہوا ہے ضرور
کہیں مجھ میں اتنی سکت ہے حضور
میں اور ایسی گستاخیاں کیا مجال
بدل ڈالیے آپ اپنا خیال
بھلا فیصلہ کی یہاں کون راہ
نہ جج ہی کوئی ہے نہ کوئی گواہ
کہا اس سے بلّی نے چپ بدتمیز!
نہ کر رائگاں میرا وقتِ عزیز
کوئی اس میں تاخیر ممکن نہیں
یہ جھگڑا چکے گا ابھی اور یہیں
میں جج ہوں، میں جوری، میں ہی مُدعی
سزا تجھ کو دیتی ہوں میں موت کی

دسمبر 1940

1941

غزلیات

(1)

یہ ربطِ عشق خود اک حدِ فاصل ہوتا جاتا ہے
جو پردہ اُٹھتا جاتا ہے وہ حائل ہوتا جاتا ہے
زباں تک حرفِ دل لانا بھی مشکل ہوتا جاتا ہے
یہ کیسا یا الٰہی رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے
قدم رُک رُک کے کچھ پڑنے لگے ہیں جیسے رہرو کے
مجھے شک ہے کہ شاید قُربِ منزل ہوتا جاتا ہے
خبر لے حُسنِ بے پروا کہ حسرت بن چلی ارماں
نظر کی آڑ لے کر سامنے دل ہوتا جاتا ہے
نظر آنے لگا ہے شیخ کو ہر جا وہی جلوہ
یہ اب کافر کہے جانے کے قابل ہوتا جاتا ہے
نہیں لاتا ہے ظرفِ حُسن تابِ عاشقی شاید
جسے جتنا ہی چاہو اور قاتل ہوتا جاتا ہے
کسی سے عرضِ دل کرنا جو اک دنیا کو آساں ہے
نہ جانے کیوں یہی ملا کو مشکل ہوتا جاتا ہے

جنوری 1941

(2)

ارماں کو چھپانے سے مصیبت میں ہے جاں اور
شعلہ کو دباتے ہیں تو اُٹھتا ہے دھواں اور

انکار کیے جاؤ اسی طور سے ہاں اور
ہونٹوں پہ ہے کچھ اور نگاہوں سے عیاں اور

خود تونے بڑھائی ہے یہ تفریق جہاں اور
تو ایک مگر روپ یہاں اور وہاں اور

دل میں کوئی غنچہ کبھی کھلتے نہیں دیکھا
اس باغ میں کیا آکے بنا لیگی خزاں اور

اتنا بھی مرے عہدِ وفا پر نہ کرو شک
ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں کہ ہے رسمِ جہاں اور

ہر لب پہ ترا نام ہے اک میں ہوں کہ چپ ہوں
دنیا کی زباں اور ہے عاشق کی زباں اور

اب کوئی صدا میری صدا پر نہیں دیتا
آوازِ طرب اور تھی آوازِ فغاں اور

کچھ دور پہ ملتی ہیں حدیں ارض و سما کی
صحرائے طلب میں نہیں منزل کا نشاں اور

اک آہ اور اک اشک پہ ہے قصۂ دل ختم
رکھتی نہیں الفاظ محبت کی زباں اور

وہ صبح کے تارے کی جھپکنے سی لگی آنکھ
کچھ دیر ذرا دیدۂ انجم نگراں اور

ملا وہی تم اور وہی کوئے حسیناں
جیسے کبھی دُنیا میں نہ تھا کوئی جواں اور

جنوری 1941

(3)

خندہ بے اختیار چھوٹے ہے
یوں بھی غم کا پہاڑ ٹوٹے ہے
شامِ غم ہے یہ رنگِ دیدۂ تر
جیسے اک آبشار پھوٹے ہے
حسن اور عشق میں نہیں معلوم
کون لٹتا ہے کون لوٹے ہے
ہیں اسیر آج کچھ اُداس اُداس
ایک ساتھی قفس سے چھوٹے ہے
وہ نظر اب اِدھر نہیں آتی
کون لوٹے ہوؤں کو لوٹے ہے
نگہِ زخمہ زن کی چھیڑ گئی
سازِ دل اس طرف بھی ٹوٹے ہے
شاخِ دل پر جہاں لگے ہے تیر
نئی کونپل وہیں سے پھوٹے ہے
کیا کہیں اپنے دل کی بربادی
باغباں خود چمن کو لوٹے ہے
مرگِ ملا پہ کیوں نہ شادی ہو
ایک غمگین غم سے چھوٹے ہے

اپریل 1941

(4)

ہوا ناسازگارِ گلستاں معلوم ہوتی ہے
اگر ہنستی بھی ہیں کلیاں فغاں معلوم ہوتی ہیں

خوشی میں اپنی خوشی بختی کہاں معلوم ہوتی ہے
قفس میں جا کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے
ہر اک کے ظرف کی وسعت یہاں معلوم ہوتی ہے
محبت آدمی کا امتحاں معلوم ہوتی ہے
کبھی شاید محبت کا کوئی حاصل نکل آئے
ابھی تو رائگاں ہی رائگاں معلوم ہوتی ہے
یہ دل کو کر دیا کیسا کسی کی کم نگاہی نے
ذرا سی پھانس چبھتی ہے سناں معلوم ہوتی ہے
کھنچ آتی ہیں اُسی ساحل پہ خود دو اجنبی موجیں
محبت ایک جذبِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
افق ہی پر ابھی تک ہیں تصور کی حسیں شامیں
کہیں ٹھہری ہوئی عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے
تم اس حالت کو کیا جانو نہ جانو ہی تو اچھا ہے
ہنسی جب آکے ہونٹوں پر فغاں معلوم ہوتی ہے
تری بے مہریاں آخر وہ نازک وقت لے آئیں
کہ اپنوں کی محبت بھی گراں معلوم ہوتی ہے
نظر آتا نہیں شبنم کا گرنا پھول کا کھِلنا
محبت کی حقیقت ناگہاں معلوم ہوتی ہے
چمن کا درد ہے جس دل میں تو چاہے کہیں اُٹھے
اُسے اپنی ہی شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے
نظر پھرتی تھی وہ پہلے بھی لیکن یوں نہ پھرتی تھی
کچھ اب کی ختم ہوتی داستاں معلوم ہوتی ہے

ابھی خاکسترِ ملا سے اُٹھتا ہے دھواں کچھ کچھ
کہیں پر کوئی چنگاری تپاں معلوم ہوتی ہے
مئی 1941

(5)

ارمانوں پہ ہے غم کی گھٹا چھائی ہوئی سی
تاروں کو سرِ شام ہی نیند آئی ہوئی سی
آغازِ محبت میں عجب دل کا ہے عالم
جیسے کہ دلہن ہو کوئی شرمائی ہوئی سی
دنیا ہے محبت کی حقیقت سے خبردار
اور پھر بھی محبت پہ یقیں لائی ہوئی سی
شاید کسی قابل ہو مری نذرِ محبت
یہ ایک زمانہ کی ہے ٹھکرائی ہوئی سی
پھر جہلِ گزشتہ کی ہے دُنیا متلاشی
دانائیِ امروز سے گھبرائی ہوئی سی
گل رشک کے قابل ہے ترا فلسفۂ زیست
دل چاک مگر لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی
ملا ہے کسی سوچ میں اس وقت نہ چھیڑو
اک بھولنے والے کی ہے یاد آئی ہوئی سی
اگست 1941

(6)

اُس کے کرم پہ شک تجھے زاہد ضرور ہے
ورنہ ترا قصور نہ کرنا قصور ہے

موسیٰ یہی نظر ہے اسی دل میں طور ہے
ہاں عام اک غلط سی روایت ضرور ہے
اک درس ہے تری غلط اندازیِ نگاہ
کوئی نہ زد میں ہے نہ کوئی زد سے دور ہے
آزردگی کا میری خموشی پہ شک نہ کر
یہ اور بات ہے کہ محبت غیور ہے
کشتی کے ڈوبنے کا گلہ نا خدا نہیں
کشتی کو چھوڑنے کی شکایت ضرور ہے
نفرت کا دل کو دیتی ہے دھوکا کبھی کبھی
وہ عشق کی کشش جو ابھی لاشعور ہے
بس دیکھنے ہی میں ہیں نگاہیں کسی کی تلخ
شیریں سا اک پیام بھی بین السطور ہے
دل ہی کی تربیت پہ ہے ملا مدارِ زیست
ہے غمکدہ یہی، یہی دارالسرور ہے
ستمبر 1941

سماج کا شکار

(1)

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

اک سال سے ہر روز وہ مزدور کا بیٹا
آتا تھا اِدھر شام ہو دن ہو کہ سویرا
دو روز سے لیکن اُسے میں نے نہیں دیکھا
معلوم نہیں اس کو یکا یک یہ ہوا کیا

اب تک اُسے آنے سے کبھی روک نہ پائے
تپتی ہوئی گرمی میں بھی وہ لُو کے تھپیڑے
سردی کی ہواؤں کے وہ اُڑتے ہوئے نیزے
برسات کی جھڑیاں ہی نہ بجلی ہی نہ اولے

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

(2)

دروازہ سے کچھ دور جو اُس پار گلی کے
اک پیڑ ہے پیپل کا اسی پیڑ کے نیچے
میں نے تو ہمیشہ اُسے پایا یہیں بیٹھے
کچھ چپ سا کچھ آزردہ سا کھویا ہوا جیسے

جی کی نہ کبھی اُس نے کسی کو بھی بتائی
سب چھوٹے بڑے اس کو سمجھتے رہے خبطی
مانی نہ بُری اس نے کوئی بات بھی کڑوی
سب ہنستے تھے جب اُس پہ تو ہنس دیتا تھا وہ بھی

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

(3)

دن آیا تھا پرسوں جو مری سال گرہ کا
معلوم نہیں کس نے اُسے جا کے بتایا
جاتی تھی شوالے کو میں جب کرنے کو پوجا
اُس نے مجھے لاکر دیا اک پھولوں کا مالا
میں بڑھ گئی جلدی سے لیا میں نے نہ مالا
کچھ اُس نے کہا اور نہ کچھ میں نے ہی پوچھا
مجھ کو یہ گوارا نہ تھا شاید وہ یہ سمجھا
پلٹی تو مجھے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

(4)

دربان نے کیا جانیے کیا دور سے دیکھا
اور جا کے پتا جی سے نہ معلوم کہا کیا
غصّہ میں گئے منھ میں جو آیا وہ سُنایا
چپ چاپ وہ سُنتا رہا کچھ منھ سے نہ بولا
کی میں نے شکایت کہیں وہ یہ تو نہ سمجھا
خود اُس نے کوئی عذر کیا اور نہ شکوا
پرنام پتا جی کو کیا اور سدھارا
اور جب کا گیا پھر وہ پلٹ ہی کے نہ آیا
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

(5)

کیا دے گئی دھوکا اُسے سچ مچ یہ رُکھائی
نادان تھا کیسا کہ نہ سمجھا مرے جی کی
یہ شرم بھی جھوٹی ہے یہ تہذیب بھی جھوٹی
اے کاش کہ ہوتی نہ مہاجن کی میں بیٹی
چنگل میں دبائے ہے یہ خونخوار سماج آہ!
قیدی ہے بشر اور ہے دیوار سماج آہ!
قربانی کی ہم بھیڑیں ہیں تلوار سماج آہ!
جینے نہیں دیتی ہے یہ مردار سماج آہ!
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

(6)

اک بار وہ پھر آئے تو کیا کیا نہ کروں گی
سچ کہتی ہوں دُنیا کی میں پروانہ کروں گی
رسوا ہوں تو ہوں شوق کو رسوا نہ کروں گی
کھاتی ہوں قسم اب کبھی ایسا نہ کروں گی
جاں ہوتی ہے پیاری مجھے اس کا تو یقیں ہے
دُنیا بھی جوانی کی نگاہوں میں حسیں ہے
لیکن وہ جہاں رہتا تھا رونا یہ وہیں ہے
جو دل میں مرے شک ہے کہیں سچ تو نہیں ہے
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں

مارچ 1941

اندھی لڑائی

کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں
یہ نادان انساں لڑے جا رہے ہیں

کوئی ان سے پوچھے لڑائی یہ کیوں ہے
مذاقِ نبردآزمائی یہ کیوں ہے
بشر کی بشر پر چڑھائی یہ کیوں ہے
نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ______________

عدو کون ہے اور حمایت ہے کس کی
خصومت ہے کس سے رفاقت ہے کس کی
مٹانا ہے کس کو حفاظت ہے کس کی
نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ______________

حقیقت میں سب اختلافات کیا ہیں
جہاں کے اصولی نزاعات کیا ہیں
جو کرنے ہیں حل وہ سوالات کیا ہیں
نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ______________

یہ پیکار جو ہیں وہ اغراض کیا ہے
مریضِ تمدّن کے امراض کیا ہیں
لڑائی کی تہہ میں نہاں راز کیا ہیں

نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ________________

صداقت پہ اُٹھی ہے تلوار کس کی
ہے اک دامِ تزویر گفتار کس کی
جو جیتے تو اس میں ہوئی ہار کس کی
نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ________________

غلامِ حکومت بندھے لڑ رہے ہیں
تمدّن کے جکڑے ہوئے لڑ رہے ہیں
نہیں جانتے کس لیے لڑ رہے ہیں
مگر لڑنے والے لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ________________

جو دیکھیں ذرا غور سے اک نظر پھر
تو کھل جائے ہے کون پردہ کے اندر
وہی اہلِ دولت خود اپنی غرض پر
غریبوں کو قرباں کیے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ________________

فریبِ دلائل سے بہکا کے ان کو
سرابات کی سمت لے جا کے ان کو
نزاعاتِ باطل میں اُلجھا کے ان کو
حقیقت چھپائے چلے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ________________

کہیں بن کے اک دورِ نو کے پیمبر
کہیں تازہ کر کے مذاقِ سکندر
کہیں حبِّ قومی کا بہروپ بھر کر
زمانے کو دھوکے دیے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ________________

کسی طور رائج نہ یکسانیت ہو
نہ بیدار تقدیرِ انسانیت ہو
جو ہوتی ہو تجدیدِ حیوانیت ہو
یہ اپنی ہی لیکن کیے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ________________

کمی ہے نہ غلّہ کی کھیتوں میں کوئی
ترقّی پہ ہے علم اور آگہی بھی
جہاں کی ضرورت کو ہر شے ہے کافی
بشر پھر بھی بھوکے مرے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ________________

جو دل تھے کبھی بے قرارِ محبت
جو تھے مایۂ صد بہارِ محبت
جو بن سکتے تھے نغمۂ زارِ محبت
وہ نفرت کدے اب ہوئے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں ________________

جسے خوابِ راحت بنانا تھا ممکن
جسے نازِ قدرت بنانا تھا ممکن
جہاں جس کو جنّت بنانا تھا ممکن

اسے اک جہنم کیے جا رہے ہیں

کٹے جا رہے ہیں ——————

تشدّد کی کب تک یہ فرماں روائی

لٹیروں کے قبضہ میں کب تک خدائی

ارے آہِ بیکس کی یہ نارسائی

دلوں کے عقیدے ہلے جا رہے ہیں

کٹے جا رہے ہیں ——————

کبھی امن کا دور آئے گا آخر

نظامِ تشدّد یہ ٹوٹے گا آخر

کبھی خونِ انساں بھی کھولے گا آخر

اسی آس پر ہم جیے جا رہے ہیں

کٹے جا رہے ہیں ——————

مگر ان سوالوں پہ کس کی نظر ہے

گہن میں ابھی آفتابِ بشر ہے

مقابل ہے کوئی بس اتنی خبر ہے

اک اندھی لڑائی لڑے جا رہے ہیں

کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں

یہ نادان انساں لڑے جا رہے ہیں

اگست 1941

نذرِ ٹیگور

خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا
وطن کے شاعرِ اعظم تجھے سلام مرا
تجھے چمن کی فضائیں سلام کہتی ہیں
سحر کی مست ہوائیں سلام کہتی ہیں
یہ اودی اودی گھٹائیں سلام کہتی ہیں
کہ ذرّہ ذرّہ پہ برسا ہے ابر جام ترا
خوشا وہ یاد ________________
تجھے فروغِ بصیرت سے دیکھنا چاہا
اُبھر کے عقل کی ظلمت سے دیکھنا چاہا
تجھے حیات کی رفعت سے دیکھنا چاہا
نظر کو مل نہ سکا پھر بھی اَوجِ بام ترا
خوشا وہ یاد ________________
بلند طائرِ سدرہ سے آشیاں تیرا
نظامِ شمس و قمر پیشِ آستاں تیرا
ستارے رَوندتا چلتا ہے کارواں تیرا
کہ روحِ قُدس کے پہلو میں ہے مقام ترا
خوشا وہ یاد ________________
جہاں کے دشت میں تخئیل جوئے آب ہے تو
ابھی جو تشنۂ تعبیر ہے وہ خواب ہے تو
اُفق پہ ہے جو دلوں کے وہ آفتاب ہے تو

ابھی دیارِ شفق میں ہے دورِ جام ترا
خوشا وہ یاد ــــــــــــــــــــــــــــــ

شبیہِ حسن ہے تیرے نگار خانوں میں
سرودِ عشق جواں ہے ترے ترانوں میں
حیات رقص کناں ہے ترے فسانوں میں
کہ اک بہشتِ ترنم ہے یا کلام ترا
خوشا وہ یاد ــــــــــــــــــــــــــــــ

ہے گونج لے میں تری سرمدی ربابوں کی
ترے نفس میں مہک جنتی گلابوں کی
تری نظر میں ہے دنیا بشر کے خوابوں کی
ہر اک طلوعِ سحر میں ہے عکسِ شام ترا
خوشا وہ یاد ــــــــــــــــــــــــــــــ

کدورتوں پہ سدا خاک ڈالنے والا
خصومتوں کو محبت میں ڈھالنے والا
دلوں سے درد کا کانٹا نکالنے والا
سکون و امن کا حامل ہے ہر پیام ترا
خوشا وہ یاد ــــــــــــــــــــــــــــــ

حیاتِ فانیِ انساں کی انتہا ہے جہاں
مسرتِ ابدی دل سے آشنا ہے جہاں
بشر کی رُوح کی تکمیل ارتقاء ہے جہاں
وہاں سے نور فشاں ہے سہیلِ جام ترا
خوشا وہ یاد ــــــــــــــــــــــــــــــ

وطن میں دُھوم ہے ہر سمت اوستادوں کی
بساطِ شعر پہ اک فوج ہے پیادوں کی
تجھی پہ ختم ہوئی نسل دیو زادوں کی
ادب کے کوہِ ہمالہ پہ ہے مقام ترا
خوشا وہ یاد _______________
وہ زیست پائی کہ اک کائنات رشک کرے
وہ خوبیاں تھیں کہ ہرذی صفات رشک کرے
ملی وہ موت کہ جس پہ حیات رشک کرے
یہ بزمِ سوگ ہے تیری کہ جشنِ عام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا
وطن کے شاعرِ اعظم تجھے سلام مرا

نومبر 1941

قطعِ محبت

میں جاؤں تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا
تمھیں پسند نہیں طرزِ گفتگو میرا
تمھیں قبول نہیں ذوقِ جستجو میرا
تمھیں عزیز نہیں خوابِ آرزو میرا
میں تم پہ جبرِ مروّت روا نہ رکھوں گا
میں جاؤں تم سے ——————
مرا نیاز، مرا عشق رائگاں ہے اگر
مری نگاہِ محبت تمھیں گراں ہے اگر
جبینِ شوق مری تنگِ آستاں ہے اگر
تمھارے در پہ سرِ مدّعا نہ رکھوں گا
میں جاؤں تم سے ——————
نہیں تمھارے خیالوں میں جب گزر میرا
تمھارے دل میں نہیں جب مری کوئی پروا
تمھارے پاس نہیں جب مرے لیے کوئی جا
میں تم سے دور کا بھی سلسلہ نہ رکھوں گا
میں جاؤں تم سے ——————
بے عنب کے لیے جامِ گِل نہیں شایاں
شعاعِ مہر نہیں بہرِ حجرۂ زنداں
نسیمِ باغ کہاں اور قفس نصیب کہاں

کسی امید کی اب دل میں جا نہ رکھوں گا
میں جاؤ تم سے ______________

یہ سچ ہے اس میں اذیّت ضرور ہوتی ہے
طبیعت اور بھی کچھ کرنا صبور ہوتی ہے
میں کیا کروں کہ محبت غیور ہوتی ہے
اسے ذلیل کروں یہ روا نہ رکھوں گا
میں جاؤ تم سے ______________

یہ ٹھیک ہے کہ محبت بدل نہیں سکتی
وفا سرشت کی فطرت بدل نہیں سکتی
کسی کے دل کی حقیقت بدل نہیں سکتی
مگر میں تم سے کوئی آسرا نہ رکھوں گا
میں جاؤ تم سے ______________

گو اب وہ سلسلۂ نامہ و پیام نہیں
مری حدیثِ تمنّا مگر تمام نہیں
مزاجِ عشق میں سودائے انتقام نہیں
مجھے قسم ہے کہ دل میں گِلہ نہ رکھوں گا
میں جاؤ تم سے ______________

میں دل ہی دل میں سجاؤں گا ایک بزمِ خیال
جہاں نہ گردِ کدورت ہے اور نہ رنگِ ملال
جسے نہ خوفِ تغیر ہے اور نہ بیمِ زوال
تمھیں بھی اس سے مگر آشنا نہ رکھوں گا
میں جاؤ تم سے ______________

شبِ حیات کو دوں گا یہاں نویدِ سحر
یہاں بچھاؤں گا گلہائے شوق کی چادر
یہاں لُٹاؤں گا دل کے عقیق و لعل و گہر
یہاں میں کوئی بھی ارماں اُٹھا نہ رکھوں گا
میں جاؤ تم سے ________________

یہاں وہ شمعیں جلاؤں گا جو جلا نہ سکا
پڑھوں گا شعر جو تم کو کبھی سنا نہ سکا
وہ گیت گاؤں گا جو تارِ جاں پہ گا نہ سکا
میں کوئی ساز یہاں بے صدا نہ رکھوں گا
میں جاؤ تم سے ________________

حقیقتوں نے کیا چاک زیست کا داماں
بس اک فریبِ تصور ہی اب ہے راہِ اماں
اسے بھی ہاتھ سے کھو دوں تو جاؤنگا میں کہاں
نہیں نہیں اسے ہرگز روا نہ رکھوں گا
میں جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا

نومبر 1941

ایک البم میں

ارے او صفحۂ کاغذ یہی منشائے فطرت ہے
مری اور تیری یکجائی میں پنہاں دستِ قدرت ہے
حیاتِ جاوداں دونوں کو ملنا اب یقینی ہے
اگر شک ہے تو اس میں ہے کسے کس کی بدولت ہے

دسمبر 1941

1942

غزلیات

(1)

شمع و گل و سرود و مے بزم میں یوں تو کیا نہیں
بزم تھی جس کے دم سے بزم، آہ وہ آشنا نہیں

بات بھی کہہ کے کھوؤں کیوں جب کوئی آسرا نہیں
ہاں تجھے کوئی غم نہیں، ہاں مجھے کچھ گلا نہیں

عشق بغیر زیست حیف! جینے میں کچھ مزا نہیں
نغمے ہیں اور رس نہیں، اشک ہیں اور ضیا نہیں

تم وہی میں وہی مگر دل میں وہ ولولا نہیں
آتشِ تیزِ عشق میں شعلۂ دیر پا نہیں

چھیڑ کے دل کو دیکھ لو نغمۂ جاں سنائے گا
ساز فقط خموش ہے یہ ابھی بے صدا نہیں

توڑ کے دل کی ہر امید یُوں چُھپ رہے ہیں چپ ہو کیوں
اور وہ ہنس کے اس طرح جیسے کہ کچھ ہوا نہیں

سُونی پڑی ہے بزمِ دل تیرہ و تار ہے نظر
کب سے سرائے شوق میں کوئی دیا جلا نہیں

ہو گئی ہونے والی بات جانے بھی دو اثر نہ لو
تم بھی وہی کے ہو وہی میں کوئی دوسرا نہیں

گُل نہیں بوئے گُل سہی، سوئے قفس بھی ہاں کبھی
باغ کی فصلِ گل پہ کیا کوئی بھی حق مرا نہیں

تنگ ہے ذوقِ عشق کو جادۂ قیس و کوہکن
ڈھونڈ رہا ہوں راہ وہ جس میں نقوشِ پا نہیں
ہو چکی التجا تمام بن چکے اشکِ خوں سفید
ملا انھیں گرا بھی دو ان میں کچھ اب رہا نہیں
اپریل 1942

(2)

آتا ہے تو آ دن جاتے ہیں پھر عشق کا یہ پیغام کہاں
بالفرض رہا بھی عشق اگر یہ دل کی سنہری شام کہاں
پی لے جتنی پینا ہے ابھی آتی ہے پلٹ کر شام کہاں
جب صبح نے آ کر دستک دی پھر شیشہ کہاں اور جام کہاں
اے دل آ چھوڑ دیں دنیا کو دنیا میں ہماری جا ہی نہیں
اس نیک چلن آبادی میں تجھ سے ہم سے بدنام کہاں
مقصد کے لیے جہدِ پیہم، جینا ہے یہی باقی باتیں
آرام کے جویا ہم بھی تھے دنیا میں مگر آرام کہاں
بجلی سی یکا یک کوند گئی، برچھی سی اچانک آن لگی
آنکھوں میں جھپک سی باقی ہے وہ جلوہ نمائے بام کہاں
خلوت میں حرم کی آ ہی گیا کچھ سوچ سمجھ کر آخر میں
کافر دنیا میں اور کہیں یہ تذکرۂ اصنام کہاں
اُلفت کی توقع کرتا ہے اور اس سے ارے یہ نادانی
ملا ملا کچھ ہوش میں آ، پہونچا ہے خیالِ خام کہاں
اگست 1942

(3)

محبت سے بھی کارِ زندگی آساں نہیں ہوتا
بہل جاتا ہے دل غم کا مگر درماں نہیں ہوتا
کلی دل کی کھلے افسوس یہ ساماں نہیں ہوتا
گھٹائیں گھر کے آتی ہیں مگر باراں نہیں ہوتا
محبت کے عوض میں اوٖمحبت ڈھونڈنے والے
یہ دنیا ہے یہاں ایسا ارے ناداں نہیں ہوتا
دلِ ناکام اک تُو ہی نہیں ہے صرف مشکل میں
اُسے انکار کرنا بھی تو کچھ آساں نہیں ہوتا
ہنسی میں غم چھپالینا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں
جو غم دراصل غم ہوتا ہے وہ پنہاں نہیں ہوتا
زمانے یہ تختی کشتِ ارماں پر لگادی ہے
گُل اس کیاری میں آتا ہے مگر خنداں نہیں ہوتا
کہیں کیا تم سے ہم اپنے دلِ مجبور کا عالم
سمجھ میں وجہِ غم آتی ہے اور درماں نہیں ہوتا
مآلِ اختلافِ باہمی افسوس کیا کہیے
ہر اک قطرہ میں شورش ہے مگر طوفاں نہیں ہوتا
دیارِ عشق ہے یہ ظرفِ دل کی جانچ ہوتی ہے
یہاں پوشاک سے اندازۂ انساں نہیں ہوتا
غرورِ حسن تیری بے نیازی شانِ استغنا
جبھی تک ہے کہ جب تک عشق بے پایاں نہیں ہوتا
صدائے بازگشت آتی ہے ایّامِ گزشتہ کی
یہ دل ویران ہو جانے پہ بھی ویراں نہیں ہوتا
محبت تو بجائے خود اک ایماں ہے ارے ملا
محبت کرنے والے کا کوئی ایماں نہیں ہوتا

ستمبر 1942

صبح کا ہنگام ہے ہنگام کی باتیں کریں

وقت آیا کام کا کچھ کام کی باتیں کریں
تا بہ کے اپنے دلِ ناکام کی باتیں کریں

پھر اُفق ہے ایک صبحِ نو سے رشکِ لالہ زار
شمعِ افسردہ لیے کیا شام کی باتیں کریں

کارواں پھر زندگی کے موڑ پر ہے گرم رو
کس طرح ہم سجدۂ ہر گام کی باتیں کریں

ہر نفس ہے تیز سے کچھ تیز تر رفتارِ زیست
اب ہمیں فرصت کہاں آرام کی باتیں کریں

خونِ انساں سے لبا لب آج ہے جامِ حیات
کس زباں سے حافظ و خیام کی باتیں کریں

لکھ رہی ہے تیغِ خوں آشام تاریخِ جہاں
اور ہم اک بزمِ مے آشام کی باتیں کریں

زندگی کی تلخیوں سے پھیر کر کب تک نگاہ
شاہد و شمع و شراب و جام کی باتیں کریں

نغمہ ہائے آشیاں ہونے لگے کانوں پہ بار
اب چمن میں مرغِ زیرِ دام کی باتیں کریں

مضطرب دل کے فسانے اب مزا دیتے نہیں
اک زمینِ لرزہ براندام کی باتیں کریں

زندگی نے توڑ ڈالے وہ پرانے بت تمام

طاقِ نو ڈھونڈیں نئے اصنام کی باتیں کریں
جس میں شامل ہو ہر اک ٹوٹے ہوئے دل کی فغاں
آؤ اب اُس نغمۂ ناتمام کی باتیں کریں
اب گھنے سایوں کا پھولوں کی روش پر ذکر کیا
ایک تپتی شاہراہِ عام کی باتیں کریں
پختگیِ عقل اچھی ہے مگر بہتر ہے یہ
گاہے گاہے آرزوئے خام کی باتیں کریں
رفعتوں سے دردِ انساں کی بھی چھیڑیں گفتگو
تا بہ کے پستیِ ذوقِ عام کی باتیں کریں
شیخ جی ملا پہ لعنت بھیجئے کافر ہے وہ
آیئے ہم آپ کچھ اسلام کی باتیں کریں
اگست 1942

ترکِ محفل

دنیا سے کنارہ کر کے الگ بیٹھے ہیں اکیلے دل کو لیے
محفل سے بظاہر دور ہیں ہم دل میں ہیں مگر محفل کو لیے

کھولا نہ کسی نے دروازہ آخر تھک کر خاموش ہوئے
کب تک دیتے ہر در پہ صدا اک خواہشِ لا حاصل کو لیے

دیوانہ ہمیں سمجھا سب نے دی پاس کسی نے بھی نہ جگہ
آخر محفل چھوڑی ہم نے لیکن سازِ محفل کو لیے

اک آنکھ میں بھی ہم کو نہ ملی ڈھونڈے سے بھی ہمدردی کی چمک
کتنی راتوں سے ہم گزرے بس ایک چراغِ دل کو لیے

معتوب ہمیں ہیں نظروں میں بیزار ہمیں سے محفل ہے
وہ ہم جو ہیں اس محفل کے لیے صد جلوۂ مستقبل کو لیے

گرمیِ محبت کو اپنی لے جاکے وہاں کیا خوار کریں
ٹھٹھرے سے کچھ انساں ہیں جہاں سلے سے ہوئے اک دل کو لیے

اک فکر یہی ہے بس جن کو کھل جائے کہیں ان کا نہ بھرم
سب شاہ بنے بیٹھے ہیں جہاں اک چور سے اپنے دل کو لیے

بازارِ جہاں میں ہو بھی چکی تبدیلی قدرِ اشیاء کی
یہ بھولے سوداگر ہیں مگر اب تک نرخِ باطل کو لیے

زندانِ بشر کب تک جھوٹے اخلاق کی خستہ دیواریں
اِک دن یہ کھنڈر ڈھ جائے گا تعمیر کی ہر منزل کو لیے

سطحِ بحرِ ذہنِ انساں طوفاں آثار ہے پھر کچھ یوں
ہر جزِ تمدن لرزاں ہے اپنے اپنے ساحل کو لیے

لیلائے حقیقت کے شیدا اس دشت میں جا کر کیوں بھٹکیں
رسمی مجنوں سوتے ہیں جہاں اک خوابِ پسِ محمل کو لیے
جو راہ چُنی ہے اپنے لیے ہٹنے کے نہیں اب اس سے قدم
مٹنا ہے تو ہاں مٹ جائیں گے لیکن خوابِ منزل کو لیے
محفل سے اُٹھ آئے ہیں ملا لیکن دل کا عالم ہے وہی
جس کو اب تک حل کر نہ سکے بیٹھے ہیں اُسی مشکل کو لیے

ستمبر 1942

امن کے سپاہی

ابھی فضائے جہاں میں غبار ہیں کیا کیا
مگر انھیں میں نہاں شہ سوار ہیں کیا کیا

نشیب صلح میں سیلابِ جنگ کے آگے
قدم جمائے ہوئے کوہسار ہیں کیا کیا

ہر ایک سمت ہیں گو سنگلاخ چٹانیں
ترانہ بار مگر آبشار ہیں کیا کیا

جہادِ زیست کے تپتے ہوئے بیاباں میں
اُٹھائے سر شجر سایہ دار ہیں کیا کیا

کثیف چیتھڑے زخمی بدن پہ چہرہ پہ خاک
غبار وخوں کی تہوں میں نگار ہیں کیا کیا

چھپائے زخمِ جگر کو تبسم لب سے
محاذِ زیست پہ سینہ فگار ہیں کیا کیا

دلیر مرد فقط جنگجو صفوں میں نہیں
سپاہِ امن میں بھی جاں نثار ہیں کیا کیا

~~~~~
~~~~~

مگر وہ معرکۂ زندگی کے میداں میں
تن اسلحہ سے سجائے ہوئے نہیں ملتے
مصافِ زیست کی خونریز رزمگاہوں میں
لہو میں ہاتھ رچائے ہوئے نہیں ملتے
شبِ حیات کی پُر ہول تیرگی میں بھی وہ
چراغ روح بجھائے ہوئے نہیں ملتے
جلائے آتشِ نفرت کو اپنے سینوں میں
نظر میں زہر بجھائے ہوئے نہیں ملتے
کشادہ کر کے خصومت کا ہر جنوں خانہ
دلوں پہ قفل چڑھائے ہوئے نہیں ملتے
خدائے جبر و تشدد کے آستانے پر
سرِ نیاز جھکائے ہوئے نہیں ملتے
کہیں کہیں مترنم ہے ان کے دم سے ہوا
ابھی فضا پہ وہ چھائے ہوئے نہیں ملتے

~~~~~~

ابھی تمام نہیں داستانِ حرص و ستم
ابھی سکندر و اسفندیار ہیں کیا کیا
نہیں ہے کامِ بشر آشنائے لذت سے
لہو کے گھونٹ ابھی خوشگوار ہیں کیا کیا
ابھی نظر نہیں جاتی جبہِ حقیقت تک
خزاں کے دور بہ رنگِ بہار ہیں کیا کیا
~~~~~~

چڑھائی جاتی ہے انسانیت کی بھینٹ جنھیں
ابھی سماج کے پروردگار ہیں کیا کیا
دبا ہوا ہے خدائی کے بوجھ سے انساں
ابھی زمین پہ گردوں کے بار ہیں کیا کیا
فقط ہلاکِ اجل ہی نہیں ہے آدم زاد
ابھی حیات کے زندہ شکار ہیں کیا کیا
ابھی ہے دور بہت بامِ ارتقائے حیات
دلِ بشر کو ابھی انتظار ہیں کیا کیا

نومبر 1942

1943

غزلیات

(1)

ساتھ ہو کوئی تو کچھ تسکین سی پاتا ہوں میں
تیرے آگے جا کے تنہا اور گھبراتا ہوں میں

سامنے آتے ہی ان کے چپ سا ہو جاتا ہوں میں
جیسے خود اپنی تمناؤں سے شرماتا ہوں مَیں

اک مسلسل ضبط ہی کا نام شاید عشق ہے
اب تو نظروں تک کو آنکھوں ہی میں پی جاتا ہوں مَیں

دیکھ سکتے کاش تم میری تمناؤں کا جشن
جب انھیں جھوٹی امیدیں دے کے بہلاتا ہوں مَیں

میرے پَیروں کو ہے کچھ روندی ہوئی راہوں سی بَیر
جس طرف کوئی نہیں جاتا ادھر جاتا ہوں مَیں

اک نگاہِ لطف آتے ہی وہی ہے حالِ دل
سب پُرانے تجربوں کو بھول سا جاتا ہوں مَیں

یہ مرے اشکِ مسلسل بس مسلسل اشک ہیں
کون کہتا ہے تمھارا نام دہراتا ہوں مَیں

شامِ غم کیا کیا تصور کی ہیں چیرہ دستیاں
ہاں تمھیں بھی تم سے بن پوچھے اُٹھا لاتا ہوں مَیں

کاروبارِ عشق میں دنیا کی جھوٹی مصلحت
مجھ کو سمجھاتے ہیں وہ اور دل کو سمجھاتا ہوں مَیں

ساتھ تیرے زندگی کا وہ تصوّر میں سفر
جیسے پھولوں پر قدم رکھتا چلا جاتا ہوں مَیں
رنج انساں کی حقیقت میں تو سمجھا ہوں یہی
آج دنیا میں محبت کی کمی پاتا ہوں مَیں
میرے ہر آنسو میں خوشبو، میرے ہر نالہ میں راگ
اب تو ہر سانس میں شامل تمھیں پاتا ہوں مَیں
اب تمنا بے صدا ہے، اب نگاہیں بے پیام
زندگی اک فرض ہے جیتا چلا جاتا ہوں مَیں
ہائے ملا کب ملی خاموشیِ اُلفت کی داد
کوئی اب کہتا ہے کچھ ان سے تو یاد آتا ہوں مَیں
فروری 1943

(2)

نہ عقل کے کوہِ نور پر ہے نہ دیں کی وادیِ راز میں ہے
بشر کی سب سے جمیل تصویر دل کے سوز و گداز میں ہے
نکل کے خلوت سے کون جلوہ مشاہدہ گاہِ ناز میں ہے
کہ آج گھر گھر چراغ روشن دیارِ اہلِ نیاز میں ہے
حیاتِ انساں نئی نظر سے پھر آج تفتیشِ راز میں ہے
خیال سانچے بدل رہے ہیں ضمیرِ ہستی گداز میں ہے
یہی تقاضائے زندگی ہے اسی لیے خونِ گرمِ دل ہے
حقیقتوں کو بھی رنگ دیدے وہی جو روئے مجاز میں ہے
کھڑا ہوں میں پاشِ حسن حیراں ابھی ہیں بے لوث دل کے سجدے
دعا بھی آجائے گی زباں تک ابھی تمنا نماز میں ہے

وہ نور ہی کیا بلند یوں ہی کو جو فقط زر نگار کر دے
جمالِ خورشید کی حقیقت شعاعِ ذرّہ نواز میں ہے
کسی کو اپنے جمالِ رُخ کا کہیں نہ اندازہ غلط ہو
مجھے تو شک ہے وہ آئینہ ہے جو ذہنِ آئینہ ساز میں ہے
مریضِ غم کو تسلّیوں سے کہیں سوا دے رہا ہے تسکیں
وہ اک چھلکتا ہوا سا آنسو جو دیدۂ چارہ ساز میں ہے
لب و گلو میں جو ڈھل نہ پایا، جو صوتِ نے میں سما نہ پایا
سرودِ خاموش ایک وہ بھی دلِ شکستہ کے ساز میں ہے
ہزار سجدے کرو میسّر مگر دوبارہ نہیں یہ نعمت
وہ ایک فردوسِ کیف و مستی جو دل کی پہلی نماز میں ہے
خدائے انصاف تجھ سے پوچھوں اسے اگر تو گلہ نہ سمجھے
خوشی کا دھندلا سا کوئی تارا ابھی غم کی شامِ دراز میں ہے
ابھی مرے دل میں کچھ ستارے ہیں جو نظر تک نہ آسکے ہیں
مری خموشی پہ تم نہ جاؤ سرود خوابیدہ ساز میں ہے
یہی تو اُس در پہ اُن کے سجدے قبول ہونے سے روکتی ہے
وہ ایک در پر وہ تمکنت سی جو عجزِ اہلِ نیاز میں ہے
فریبِ تحسینِ عام کھا کر سمجھ نہ کانٹوں کو پھول ملا
کہ گُل تو دراصل گل وہی ہے جو دامنِ امتیاز میں ہے

مارچ 1943

(3)

اجنبیت سی نگاہِ دوست میں پاتے ہوئے
اُٹھ گئے محفل سے ہم نظروں کو کتراتے ہوئے

اک ترانہ زیست کا شام و سحر گاتے ہوئے
جی رہے ہیں موت کو ہنس ہنس کے شرماتے ہوئے

عقل کے بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھلاتے ہوئے
ہم نے کاٹی زندگی دیوانہ کہلاتے ہوئے

ابتدائے عشق میں نظروں کا عالم اُس سے پوچھ
جس نے دیکھی صبح دم کرنوں میں تاب آتے ہوئے

شمعِ دل کی لَو کی ہر جنبش انھیں کے دم سے تھی
یہ جو کچھ قطرے سے ہیں پلکوں پہ تھراتے ہوئے

شیخ شاید میں بھی کل ہو جاؤں تجھ سا پاکباز
دیر کچھ لگتی نہیں نیت بگڑ جاتے ہوئے

لے ہی آئیں عشق کی ناکامیاں دل پر وہ وقت
جب نظر ڈرتی ہے تاحدِ نظر جاتے ہوئے

کر رہا ہوں موت بھی تیری نگاہوں سے قبول
اور دل میں زندگی ہی زندگی پاتے ہوئے

یادگار زندگی عشق ہی کیا چند داغ
ہاں مگر فردوس کے پھولوں کو شرماتے ہوئے

ایک کیفِ مشترک لڑتی ہوئی نظروں میں ہے
رند جیسے مے پئیں پیالوں کو کھنکاتے ہوئے

کیا کہوں کس طرح آنکھوں ہی میں پی جاتا ہوں اشک
پھول دیکھا ہے کبھی ڈالی پہ کمھلاتے ہوئے

عشق کی راہوں میں ہیں یوں رسم دنیا کے اسیر
ہر قدم پر اپنے سایہ یک سے گھبراتے ہوئے
نالہ زارِ زیست سے مانا مفر ممکن نہیں
یہ تو ممکن ہے کہ نالے کیجیے گاتے ہوئے
اک سلام اک مسکراہٹ، اک سوال اک شکریہ
وہ بھی یونہیں راہ میں آتے ہوئے جاتے ہوئے
ہم نے بھی ملا کو سمجھانے کو سمجھایا مگر
چوٹ سی لگتی ہے دل میں اس کو سمجھاتے ہوئے
اپریل 1943

(4)

برکھا رُت ہے ابر ہے پیارے
آ اب دوری جبر ہے پیارے
جی تو بس میں آ بھی جائے
عمر بڑی بے صبر ہے پیارے
تجھ سے دور یہ حال ہے جی کا
سانس بھی لینا جبر ہے پیارے
دن ہے ایک بھیانک سپنا
رات اندھیری قبر ہے پیارے
آس کا تارا چھپ چھپ جائے
چھایا ایسا ابر ہے پیارے
ہجر کے ماروں کا جینا کیا
دھیان ترا اور صبر ہے پیارے

تجھ بن جی ہے سُونا سُونا
جی ہے یا اک قبر ہے پیارے
کھل کھل کے گھر گھر کے برسے
آنکھ نہیں اک ابر ہے پیارے
ریت یہ کیسی ہے اس جگ کی
اپنوں ہی پر جبر ہے پیارے
مجبوروں کا قابو ہی کیا
عشق کی قسمت صبر ہے پیارے
ملا کی ڈاڑھی پہ نہ جاؤ
ملا دل کا گبر ہے پیارے

جولائی 1943

(5)

دنیا کے وہی قصے ہیں مگر عنوان بدلتے جاتے ہیں
فطرت قائم ہے اپنی جگہ انسان بدلتے جاتے ہیں
ایمان بدلتی دنیا میں ہر آن بدلتے جاتے ہیں
ہاں سینہ بہ سینہ آنے میں قرآن بدلتے جاتے ہیں
مابینِ خداوند و آدم اک جنگ چھڑی تھی روزِ ازل
وہ جنگ ابھی تک جاری ہے میدان بدلتے جاتے ہیں
فطرت کے تقاضوں پر پہرے ہیں آج بھی رسم و ایماں کے
قیدی کے فقط بہلانے کو دربان بدلتے جاتے ہیں
شرڈہا کے اندھیرے گھاٹ پہ بھی اب بھگتوں کی بھگتی وہ نہیں
ٹھاکر جی سنبھالو ٹھکرائی ججمان بدلتے جاتے ہیں

ہستی کا سفر ہے طوفانی اس میں یک رانی نادانی
جو شاہ سوار ماہر ہیں وہ ران بدلتے جاتے ہیں

ہر دور پیمبر لاتا ہے ہر سانس سندیسہ دیتی ہے
جیسا جیسا وقت آتا ہے اعلان بدلتے جاتے ہیں

نیکی و بدی کے خانوں کی ہر روز لکیریں مٹتی ہیں
زندہ دنیا کی نظروں کے میزان بدلتے جاتے ہیں

ملا کو وفا سے بیگانہ کہنا ہے پیارے بھول تری
ہے سلطنتِ دل اس کی وہی سلطان بدلتے جاتے ہیں

نومبر 1943

ٹھنڈی کافی

(1)

اس میں خوبی سی کچھ آئینِ مکافات کی تھی
کچھ جنوں خیز بغاوت سی بھی جذبات کی تھی
اک فسوں ساز شرارت سی بھی کچھ رات کی تھی
ورنہ اس کو نہ مجھی کو خبر اس بات کی تھی
کہ یہی رات مقدّر میں ملاقات کی تھی

(2)

نہ کوئی عہد ہوا تھا نہ چلی تھی تدبیر
کسی کوشش کا نتیجہ نہ مآلِ تذویر
اتفاقات کی کڑیوں سے بنی تھی زنجیر
آئی بننے پہ تو بنتی ہی گئی پھر تقدیر
منتظر جیسے مری زیست اسی رات کی تھی

(3)

گرمیاں ختم پہ تھیں آمدِ باراں کی تھی آس
ہلکے چھینٹوں سے بجھی تھی نہ ابھی خاک کی پیاس
دھان کی کنواریاں استادہ تھیں کھیتوں میں اُداس
دل سے دہقاں کے مٹا تھا نہ ابھی خوف وہراس
رُت ابھی ایک نہ برسی ہوئی برسات کی تھی

(4)

میرے اک دوست اُسی رات تھے سرگرمِ سفر
اُن کی ٹرین آئی بڑی دیر سے اسٹیشن پر
کر کے رخصت انھیں آخر میں جب آیا باہر
پاس زینوں کے یکایک مجھے آئی وہ نظر
اور کچھ فکر سی چہرے پہ کسی بات کی تھی

(5)

ایک مدّت سے میں تھا اس کی محبت میں اسیر
میں سمجھتا تھا کہ ہوں اس کی نگاہوں میں حقیر
میری ہمّت ہی نہیں تھی کوئی سوچوں تدبیر
بازیِ دل کی نگاہوں میں یہی تھی تصویر
چاہے جو چال چلوں میرے لیے مات کی تھی

(6)

دور ہوتی ہی چلی جاتی تھی دُنیائے خیال
اب نہ خط تھا نہ پیام اور نہ کبھی پرسشِ حال
کہیں ملتے بھی اگر تھے تو وہ غیروں کی مثال
اک سلام ایک تبسّم کوئی رسمی سا سوال
کچھ زمانے سے یہی طرز ملاقات کی تھی

(7)

پہلے دم بھر کے لیے ایک ذرا میں جھجکا
ہو نہ ہو اس کو گوارا مرا ملنا اس جا
پھر ذرا جی کو کڑا کر کے میں اس سمت بڑھا
سامنے جا کے نمسکار کیا اور پوچھا
کوئی خدمت مرے لائق مری اوقات کی تھی

(8)

دیکھ کر مجھ کو وہ اک بار ہوئی حیراں سی
رُخ پہ پھر ایک تبسّم کی کرن دوڑ گئی
اک کرن جو نہیں معلوم کہاں سے پھوٹی
آج تک جس کی حقیقت کبھی مجھ پر نہ کھلی
اس کی آنکھوں کی کہ ہونٹوں کے مضافات کی تھی

(9)

پھر لگی کہنے کہ اس وقت بہت خوب ملے
جانے کے سال اسی آس میں بیٹھے بیتے
شاید آجائے سواری کوئی بھولے بھٹکے
یہ غنیمت تھی کہ جینے کے لیے ساتھ مرے
ایک تھرماس اور اک جلد حکایات کی تھی

(10)

میں نے بھی ہنس کے کہا تم کو ملی خوب سزا
اپنے آنے کا نہ دو اور کوئی مجھ کو پتا
آج اک کار خرد عمر حماقت میں کیا
گھر پلٹنے کے لیے روک لیا ہے تانگا
مصلحت اس میں یہی قاضیِ حاجات کی تھی

(11)

پھر یہ پوچھا کہ کہاں رات کی ہے جائے قیام
بولی ہوٹل میں ہے بک پہلے سے کمرہ مرے نام
میں نے چاہا تھا کروں نیند کسی کی نہ حرام
نیک ارادوں کا مگر حیف یہی ہے انجام
اور پھر لب پہ وہی موج خرابات کی تھی

(12)

راہ لی بولتے ہنستے یوں ہی پھر ہوٹل کی
سرد مہری کوئی جیسے کبھی آپس میں نہ تھی
دل میں لیکن یہی شک سا کہ یہ سب ہے وقتی
جیسے دو دائرے اک نقطہ پہ مل جائیں کبھی
حد الگ پاس پہنچ کر بھی خیالات کی تھی

(13)

چھوٹ جائے سرِ صبر و توازن نہ کہیں
ڈھ پڑے کھوکھلی بنیادِ تمدّن نہ کہیں
کھول لیں دل کی گرہ شوق کے ناخن نہ کہیں
خالقِ عشق کے لب بول اُٹھیں پھر کُن نہ کہیں
سعی پیہم سی نگہداری جذبات کی تھی

(14)

جنگ کا رنگ حکومت کی درندہ صفتی
بھاؤ غلّہ کا ہر اک شے کی گرانی تنگی
کوئی تقریب، نئی فلم، سفر کی سختی
گفتگو ایک وہ بے ربط مسلسل سطحی
دل کی آواز نہ اُبھرے فقط اس بات کی تھی

(15)

رات تاریک تھی جیسے کسی اندھے کی نگاہ
اِکّے دُکّے کسی رہرو کی جھلک گاہ بہ گاہ
چند لمحات کو لیٹی تھی دورویہ سرِ راہ
اپنی پیدائشی وردی میں غریبوں کی سپاہ
ساعتِ امن یہ مابینِ مصافات کی تھی

(16)

بند بازار تھے سڑکوں پہ تھی بجلی کی قطار
تھک کے سوئی تھی دلہن شہر کی پہنے ہوئے ہار
دھندلے دھندلے سے مکانات کہ سینہ کا اُبھار
ہلکی ہلکی سی ہوا سانس کی جیسے رفتار
عصمتِ شہر پہ چادر پڑی رات کی تھی

(17)

شب تاریک میں ہوٹل نظر آیا ایسے
ابر کی گود میں اک ابرِ سیہ تر جیسے
کنجی لی ہال میں لٹکے ہوئے اک نقشے سے
پہنچے اسباب لیے کمرے میں جیسے تیسے
داستاں ختم بالآخر غمِ آفات کی تھی

(18)

میں نے یہ کہہ کے کہ نا وقت ہے رخصت مانگی
بولی ٹھہرو ابھی جاتے ہو کہاں بیٹھو بھی
میرے تھرماس میں تھوڑی سی ہے ٹھنڈی کافی
آؤ پی لو مری خاطر سے سہی اک پیالی
ہر ادا صبر شکن اس کی مدارات کی تھی

(19)

کافی پینے لگے پھر بیٹھ کے اک صوفے پر
خود بخود ہونے لگیں باتیں بہ عنوانِ دگر
اب جو ملتی تو رُک جاتی تھی دم بھر کو نظر
دل پہ ماحول کا کچھ غیر شعوری سا اثر
ایک وارفتگی ساون کی سیہ رات کی تھی

(20)

زیبِ دیوار تھی اک شوخ حسینہ عریاں
جانے کیا اس کی نگاہوں میں تھا جادو پنہاں
یک بیک دوڑ گئی جسم میں اک برقِ تپاں
خوں کی ہر بوند میں پھر رقص کناں اک طوفاں
دل میں اک گونج سی بھولے ہوئے نغمات کی تھی

(21)

وقت کی بات تھی یا سوزِ جگر کی تاثیر
وہ بھی کرنے لگی کچھ کھوئی ہوئی سی تقریر
کھنچ گئی جیسے یکا یک کوئی سینوں میں لکیر
گو ابھی لب پہ نہ تھی جذبۂ دل کی تعبیر
ایک دنیا مگر آنکھوں میں اشارات کی تھی

(22)

جو نہ کھلتی تھیں وہ کھلنے لگیں راہیں ازخود
گر پڑیں فرقِ تکدّر سے کُلا ہیں ازخود
دل کی دل کے لیے اُٹھنے لگیں باہیں ازخود
ڈھونڈنے آئیں نگاہوں کو نگاہیں ازخود
لب ہر مُو پہ صدا دل کی مناجات کی تھی

(23)

ہو گئی دونوں پہ پھر ایک خموشی طاری
اب وہ باتوں میں روانی تھی نہ شوخی نہ ہنسی
جیسے لوہے کی سلاخوں میں گھرے دو قیدی
دور ہی دور سے کچھ آنکھوں میں کہہ لیں۔ وہ گھڑی
پابہ زنجیر اسیروں کی ملاقات کی تھی

(24)

میں جواں سال نہیں تھا کوئی معصوم نہ تھا
پھر بھی اس راز سے واقف دلِ مغموم نہ تھا
اس کی در پردہ توجہ سے میں محروم نہ تھا
ایک دھوکا تھا تغافل مجھے معلوم نہ تھا
ہائے وہ رات بھی کیا کشف و کرامات کی تھی

(25)

میری خودداریِ خاموش کا اُس کو تھا گلا
اُس کی بیگانہ وشی کا تھا مجھے بھی شکوا
در حقیقت نہ مجھی کچھ تھا نہ وہ ہی کچھ تھا
سمجھے بیٹھے تھے جسے غیریتِ دل کی فضا
ایک بدلی سی محبت کے حجابات کی تھی

(26)

وہ تو ہاں تھی ہی مری خلوتِ دل کی قندیل
مجھ سا نا چیز بھی تھا اُس کی نگاہوں میں جمیل
شوقِ بیتاب کہ ہو جذبۂ دل کی تکمیل
بیچ میں صرف وہ ٹوٹی ہوئی گرتی سی فصیل
ایک مٹتی ہوئی دنیا کی روایات کی تھی

(27)

نگہِ گرم تمنا کی وہ شعلہ اثری
اک سلگتا ہوا پارہ تھا کہ خونِ جگری
اک لرزتے ہوئے آنچل کی وہ زیرو زبری
شرم کی آخری مفلوج سی سینہ سپری
مشتعل آگ سی بھڑکے ہوئے جذبات کی تھی

(28)

ٹوٹے بوسیدہ تمدّن کے کگارے آخر
رہ گئے طاق پہ دنیا کے اجارے آخر
قدِ آدم اُٹھے سینوں کے شرارے آخر
ایک آواز میں دو جسم پکارے آخر
گفتگو حسن و محبت میں مساوات کی تھی

(29)

پہلے روغن کے کدورت کی صفائی کا وہ وقت
لب سے اور چشم سے پھر عقدہ کشائی کا وہ وقت
دل کی بڑھتی ہوئی گستاخ ڈھٹائی کا وہ وقت
رفتہ رفتہ بشریّت کی خدائی کا وہ وقت
حکمرانی کی گھڑی عشقِ خوش اوقات کی تھی

(30)

توڑ کر قفلِ نہاں خانۂ زندانِ حیات
آرزو ے ہی اُڑی چند سنہرے لمحات
چھان کر دہر کا تلخابۂ زہر آیات
پھر جواں عزمِ محبت نے پیا جامِ نبات
مے جو تھی دور میں وہ چشمۂ ظلمات کی تھی

(31)

عظمتِ فطرتِ انساں کا لگا کر نعرا
فاتحِ عشق نے مستانہ پھر اک رقص کیا
پھر فرشتوں نے حسد سے سوئے دنیا دیکھا
خلد نے خلد کے باغی کو کیا پھر سجدا
عرش پر بات پھر آدم کی فتوحات کی تھی

(32)

روزنِ نور کھلا غم کے سیہ خانوں میں
شعلۂ برق گرا خاک کے پیمانوں میں
جسم کی شمع جلی عقل کے ویرانوں میں
بانسری پھر بجی ایماں کے بیابانوں میں
رات پھر ساحلِ جمنا کی حکایات کی تھی

(33)

پاسبانِ چمنِ دہر سے شاید ہوئی بھول
غم کی کیاری میں اُگا ایک مسرّت کا بھی پھول
عشق نے جھونک دی پھر چشمِ روایات میں دُھول
کُرۂ خاک پہ کچھ دیر تھا جنت کا نزول
رات جیسے کسی دنیائے طلسمات کی تھی

(34)

اپنے معراجِ ترنم پہ تھا سازِ فطرت
ایک نغمہ تھا تکلم تو خموشی اک گت
چشم و لب کو ثرو تسنیم تو بازو جنت
سادہ سی سادہ ہر اک بات میں بھی اُس ساعت
ایک رنگینیِ پُر کیف محاکات کی تھی

(35)

قصّہِ دہر کے ہر بابِ فغاں کے باوصف
پابہ زنجیریِ عمرِ گزراں کے باوصف
دیوتاؤں کی نگاہِ نگراں کے باوصف
نہ مٹی بندہ نصیبیِ جہاں کے باوصف
کون خلّاق لکیر ایسی مرے ہات کی تھی

(36)

مجھ کو اس مکر کی دنیا میں صداقت کی قسم
آدمِ پاک کے سینے کی امانت کی قسم
خوں کے ہر قطرہِ باغی کی نبوّت کی قسم
ایک اُجڑے ہوئے فردوس کی حسرت کی قسم
زیست تھی زیست کے شایاں تو اسی رات کی تھی

(37)

اس میں خوبی سی کچھ آئینِ مکافات کی تھی
کچھ جنوں خیز بغاوت سی بھی جذبات کی تھی
اک فسوں ساز شرارت سی بھی کچھ رات کی تھی
ورنہ اس کو نہ مجھی کو خبر اس بات کی تھی
کہ یہی رات مقدر میں ملاقات کی تھی

اگست 1943

قحطِ کلکتہ

(1)

ارضِ بنگال کا نازوں کا وہ پالا ہوا شہر
شاہِ خاور کی شعاعوں کا اُجالا ہوا شہر
چشمہِ مشک و گل و عود میں ڈالا ہوا شہر
روضہِ خلد کے سانچے میں وہ ڈھالا ہوا شہر
آج سنسان اسی شہر کی ہر بستی ہے
عرصہِ جنگ سے بھی موت وہاں سستی ہے

(2)

جنگ کی موت تو ہے طالعِ بیدار کی موت
ننگِ قومی کے لیے قوم کے جرار کی موت
سر فروشی کی اجل غیرت و ایثار کی موت
کسی مقصد کے لیے مردِ وفا دار کی موت
نوعِ انساں کی روایات ہیں زندہ جس سے
روئے تاریخ پہ ہے سُرخیِ غازہ جس سے

(3)

جنگ کی موت اک حُسنِ مکافات تو ہے
ایک یکسانیتِ صدمہ و آفات تو ہے

جھونپڑی میں جو ہے محلوں میں وہی رات تو ہے
غم کی تقسیم میں اک رنگِ مساوات تو ہے
اس میں کچھ تفرقۂ مفلس و زردار نہیں
ایک گولی کسی فرقہ کی طرفدار نہیں

(4)

ہے مگر قہر یہ بے بلائی ہوئی موت
ناتوانوں پہ تواناؤں کی لائی ہوئی موت
شہ نشینوں سے زمینوں پہ گرائی ہوئی موت
چور بازار کے سکوں کی چلائی ہوئی موت
قتل کر دے کسی بیکس کو ہلاکو جیسے
لوٹ لے خانۂ بیوہ کوئی ڈاکو جیسے

(5)

آج بنگال میں جاری ہے یہ فرمانِ اجل
گوشہ گوشہ میں ہے اک گورِ غریبانِ اجل
قافلہ غم کا ہے اور راہ بیابانِ اجل
فاقہ مستی کا فسانہ ہے بہ عنوانِ اجل
تیرہ بختی کی ہر اک سمت جہانداری ہے
سو یاس ہے اور بھوک کی سالاری ہے

(6)

منھ سے نکلی ہوئی وہ سرخ زباں خون سے تر
کالے جوشن وہ سنپولوں کے سیہ بازو پر

پہنے گوندھے ہوئے اک ہار میں کچھ کاسہ سر
کھڑگ اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں خوں کا ساغر
رقص کرتی ہوئی لاشوں پہ بھوانی آئی
آج پھر جوش پہ کالی کی جوانی آئی

(7)

آج گندم کی بہا عرش کے خوشوں سے سوا
تاج شاہی کے چمکتے ہوئے ہیروں سے سوا
حرفِ قرآں سے سوا وید کے شبدوں سے سوا
ماں کی نظروں میں بھری گود کے پھولوں سے سوا
خواہشِ اوّلِ انساں کے مقابل سب ہیچ
عقل و دیں ہیچ، نزاعِ حق و باطل سب ہیچ

(8)

خاکِ بنگال میں اب بھی ہے وہی ہریالی
اب بھی گھر گھر کے برستی ہیں گھٹائیں کالی
کیا قیامت ہے وہی جس نے یہ کھیتی پالی
اس کے حصہ میں نہیں ایک بھی سوکھی بالی
وہ حکومت کی ضرورت کہ ٹھکانہ ہی نہیں
اور بے چارے کساں کے لیے دانہ بھی نہیں

(9)

حاجتِ فوجِ مسلّم مگر انداز کے ساتھ
جنگ برحق مگر آئینِ جہاں ساز کے ساتھ

نغمۂ فتح تو ہے غلق کی آواز کے ساتھ
نہ کہ اُکھڑے ہوئے انفاس کی پرواز کے ساتھ
جیت دھوکا ہے اگر جیت کی صورت ہے یہی
تین حرف اس پہ اگر فتح کی قیمت ہے یہی

ستمبر 1943

1944

غزلیات

(1)

صفِ حیات سے جب کوئی تشنہ کام آیا
نظامِ ساقیِ محفل پہ اتہام آیا
ملا بھی غم تو وہ غم زندگی کے کام آیا
مرے لیے ہر اک آنسو میں ایک جام آیا
لبِ کلیم پہ آیا نہ پھر سوال کوئی
ہزار برقِ پشیماں کا پھر پیام آیا
عدو کو بخش دیے ہم نے کوثر و تسنیم
یہ کس کے ہونٹوں کو چھو کر ہمارا جام آیا
کھڑا ہوں دیر سے گم زیست کے دوراہے پر
جو کارواں سے چھٹاتا ہے وہ مقام آیا
کوئی مصوّرِ ہستی کا شاہکار بھی ہے
ابھی تلک تو ہر اک نقش نا تمام آیا
حریف بن کے جہاں جب مٹا سکا نہ ہمیں
تو دوست بن کے محبت کا لے کے نام آیا
مجھے مِٹا کے وہ تھوڑی ہی دیر خوش سے رہے
پھر اس کے بعد محبت کا انتقام آیا
خوشا وہ ساعتِ فردوس جب کہ پہلے پہل
کسی کے لب پہ ذرا رُک کے اپنا نام آیا

رہِ حیات ہے سُونی مقامِ عشق کے بعد
یہاں تلک تو ہر اک دل شکستہ خرام آیا
ہنسوں کہ روؤں میں اپنی حیات پر ملا
ہوا سے بچ کے سحر تک چراغِ شام آیا
جنوری 1944

(2)

دل کو خلشِ شوق سے بیگانہ بنا دے
اُلفت کو فقط روح کا نذرانہ بنا دے
وارفتگیِ شوق پہ پابندیِ صد ہوش
یہ عقل نہ اک دن تجھے دیوانہ بنا دے
اے دل یہ ترے ضبط کا دعویٰ ہے ابھی خام
یوں اپنی خموشی کو نہ افسانہ بنا دے
تو اپنی کڑی جوڑ دے روداد جہاں میں
اور یوں کہ اُسے حاصلِ افسانہ بنا دے
بسنے کا نہیں حشر تلک وہ دلِ برباد
آباد جسے کر کے وہ ویرانہ بنا دے
مے تجھ کو ملے گی ترے حصّہ کی یقیناً
یوں جی کہ ہر اک سانس کو پیمانہ بنا دے
افسانۂ دنیا کو بنا دل کی حقیقت
پھر دل کی حقیقت کو اک افسانہ بنا دے
ملّا ترے دل میں نہیں وہ شعلۂ سوز
جو شمع کو تیری ترا پروانہ بنا دے
اپریل 1944

(3)

رازِ ہستی تشنۂ تعبیر ہے تیرے بغیر
زندگی تقصیر ہی تقصیر ہے تیرے بغیر
زیست کی ہر کامیابی بھی مری نظروں میں خاک
ایک بے بنیاد سی تعمیر ہے تیرے بغیر
جس کو ہونا چاہیے تھا تازہ دم کلیوں کا ہار
وہ نفس کا سلسلہ زنجیر ہے تیرے بغیر
ہاں وہی لب جو تبسم کا خزانہ تھا کبھی
آج رہنِ نالۂ شب گیر ہے تیرے بغیر
دل کی حالت ہے کہ جیسے اک طلسمِ بے کلید
ہر تمنا حرفِ بے تعبیر ہے تیرے بغیر
ہو نہیں پاتی کوئی آسان سی مشکل بھی سہل
کند سا ہر ناخنِ تدبیر ہے تیرے بغیر
چاند برساتا ہے جب راتوں کو امرت کی پھوار
ہاں اسی کی ہر لڑی اک تیر ہے تیرے بغیر
روشنی اس کے کسی رُخ پر بھی آپاتی نہیں
زندگی دُھندلی سی اک تصویر ہے تیرے بغیر
آ اگر بیگانۂ احساس تیرا دل نہیں
تیرا ملا خستہ و دلگیر ہے تیرے بغیر

اپریل 1944

(4)

صبح ہے بے نور، سُونی شام ہے تیرے بغیر
آ کہ حرفِ زیست اک دشنام ہے تیرے بغیر
جی رہا ہوں اور جینے میں کوئی لذّت نہیں
زندگی اک مفت کا الزام ہے تیرے بغیر
ہر نفس اک جہد ہے جس کا کوئی حاصل نہیں
آرزو آغازِ بے انجام ہے تیرے بغیر
پڑ رہے ہیں بے ارادہ بہکے بہکے سے قدم
زندگی اک لغزشِ ہر گام ہے تیرے بغیر
یہ اجازت بھی نہیں چھپ کر کہیں کاٹیں حیات
جانے کیا دنیا کو ہم سے کام ہے تیرے بغیر
شعلہ زارِ شوق بن سکتا تھا جو دورِ حیات
وہ بھی اک خاکسترِ ایّام ہے تیرے بغیر
ہاں جلا دے آ کے پھر اس کی حقیقت کا چراغ
جانِ ملّا کشتۂ اوہام ہے تیرے بغیر
جون 1944

(5)

زندگی سلسلۂ کرب و بلا ہے تو سہی
مگر اس کرب میں بھی ایک مزا ہے تو سہی
افقِ دل پہ نئی کوئی گھٹا ہے تو سہی
پھر ذرا نم سی نگاہوں کی فضا ہے تو سہی
نزدِ ساقی نہ سہی دور سہی ساقی سے

آخر اس بزم میں میری کوئی جا ہے تو سہی
اب یہ تقدیر مری مجھ کو ملا زہرِ فنا
انھیں آنکھوں میں مگر آبِ بقا ہے تو سہی
نامِ اُلفت سے اگر چڑھ ہے تو کہہ لو کچھ اور
کوئی شے عقل سے عظمت میں سوا ہے تو سہی
آ گئی ہے اُسے شاید کسی فردوس میں نیند
ورنہ دنیا کے غریبوں کا خدا ہے تو سہی
شک سا ہوتا ہے مجھے تو نے پکارا تھا کبھی
ایک بھولی ہوئی کانوں میں صدا ہے تو سہی
غمِ ہستی کے لیے یہ بھی مداوا نہ ہوئی
مے تری چشم کی اندوہ رُبا ہے تو سہی
میری غیرت نے کبھی تم سے تقاضا نہ کیا
ورنہ دنیا میں محبت کا صِلا ہے تو سہی
ٹوٹتا ہے کہ نہیں اب درِ زنداں اپنا
آج کچھ تند زمانہ کی ہوا ہے تو سہی
کھولنے ہم بھی چلے تھے گرہِ دل اپنی
ایک اُلجھا ہوا ہاتھوں میں سرا ہے تو سہی
عشق کی شانِ وفا کا یہ تقاضا ہے کہ ہنس
اُس کی پرسش پہ خموشی بھی گِلا ہے تو سہی
وادیٔ شعر میں یہ جادہ ملا ہی نہ ہو
اک الگ ہٹ کے نشانِ کفِ پا ہے تو سہی
جولائی 1944ء

(6)

کچھ بھی جفائے دوست ہو سامنے جا کے بھول جا
دل میں گلے ہزار ہوں آنکھ ملا کے بھول جا

شانِ دعا تو ہے یہی حرفِ سوال کچھ نہ ہو
ہاتھ اُٹھے تھے کس لیے ہاتھ اُٹھا کے بھول جا

دیر و حرم سے دور ہے محویتِ نیازِ عشق
کوئی بھی در ہو تجھ کو کیا سر کو جھکا کے بھول جا

کانوں کو اس کے ناگوار جب ترے نغمہائے شوق
خلوتِ شامِ ہجر میں دل کو سُنا کے بھول جا

میری نگاہِ شوق ہی پردہ دری کرے تو کیوں
تو بھی کبھی تو حُسن خود پردہ اٹھا کے بھول جا

دیکھ وفائے عشق کا ایک یہی اصول ہے
لمحے کرم کے یاد رکھ سال جفا کے بھول جا

تیز رویِ زیست میں فرصتِ عاشقی کہاں
طاق ملے جو راہ میں شمع جلا کے بھول جا

دل پہ نہ لے جو ہو سکے تلخیِ غم کا کچھ اثر
ہنس کے بھلا سکے نہ جب اشک بہا کے بھول جا

عقل و خرد بجا مگر دل کا بھی حق ہے زیست پر
کوئی گھڑی تو بارِ ہوش سر سے گرا کے بھول جا

ہار کے جان و دل بھی کر ملا نہ اس سے کچھ گِلا
ایک جُوا ہے عشق بھی داؤں لگا کے بھول جا

اگست 1944

(7)

جہاں کو ابھی تابِ اُلفت نہیں ہے
بشر میں ابھی آدمیت نہیں ہے
تکلف اگر ہے حقیقت نہیں ہے
تصنع زبانِ محبت نہیں ہے
ضروری ہو جس کے لیے ایک دوزخ
وہ میرے تصور کی جنت نہیں ہے
مرے دل میں اک تو ہے تجھ سے حسیں تر
مجھے اب تری کچھ ضرورت نہیں ہے
محبت یقیناً خلافِ خرد ہے
مگر عقل ہی اک حقیقت نہیں ہے
اسے ایک بیتابیٔ شوق سمجھو
تغافل کا شکوہ شکایت نہیں ہے
مجھے کر کے چپ کوئی کہتا ہے ہنس کر
انھیں بات کرنیکی عادت نہیں ہے
کبھی ہو سکے گا نہ ملا کا ایماں
جس ایماں میں دل کی شہادت نہیں ہے
نومبر 1944

(8)

ہاں جفا پر بھی تری دل مرا بے آس نہیں
اپنی حد پر ہے محبت تو کبھی یاس نہیں

زندگی کیا جو دل اک جنتِ احساس نہیں
پھر تو یہ زیست بجز رشتۂ انفاس نہیں

اس کمی کی کوئی دنیا میں تلافی ہی نہیں
تم نہیں پاس تو پھر کچھ بھی مرے پاس نہیں

یہ تو ممکن نہیں وہ جان کے ڈھائے یہ ستم
میری تکلیف کا شاید اسے احساس نہیں

کر لیا جس کو ترے غم نے شنا سا اپنا
کوئی دنیا کی مسرت پھر اسے راس نہیں

غلط انداز نگاہوں سے نہ ہوگی تسکین
یوں پلانے سے تو بجھنے کی مری پیاس نہیں

شیخ سمجھا ہے نہ سمجھے گا کبھی عظمتِ عشق
اُس کے ادراک کو حاصل مرا احساس نہیں

دہر کی رسمِ محبت کو کہوں کچھ میں کون؟
شاید اپنی ہی خطا ہے جو مجھے راس نہیں

اب سمجھنے سا لگا ہے تجھے کچھ کچھ ملا
یہی بیگانہ روی ہے تو اسے یاس نہیں

دسمبر 1944

رخصت اے دوست

رخصت اے دوست!

یہی مرضی ہے تو اچھا میں چلا جاؤں گا
اب فسانہ غمِ اُلفت کا نہ دُہراؤں گا
غیرتِ عشق کو شکووں سے نہ شرماؤں گا
چُپ دبے پاؤں تری بزم سے اُٹھ آؤں گا
ہو سکے گا تو تجھے رُخ بھی نہ دکھلاؤں گا
رخصت اے دوست

تجھ کو آزردہ نہ کردے یہ رُخِ زرد کہیں
تیری شمعوں کو بُجھا دے نہ دمِ سرد کہیں
چھین لے تیری مسرّت نہ مرا درد کہیں
تیرے پھولوں پہ نہ پڑ جائے مری گرد کہیں
تیرے سایہ سے بھی کترا کے نکل جاؤں گا
رخصت اے دوست

غم کی تلخی سے بھی ارماں کی حلاوت سے بھی دُور
نگہِ یاس کی خاموش شکایت سے بھی دُور
اپنی خود رحمی سے غیروں کی شماتت سے بھی دور
عشق کے خواب سے دنیا کی حقیقت سے بھی دُور
تجھ سے میں دُور بہت دُور چلا جاؤں گا
رخصت اے دوست

منحرف ہو کے تمنا کی بہاروں سے بھی ہاں
پھیر کر آنکھ خود اپنے ہی ستاروں سے بھی ہاں
لڑ کے سب ساتھ کے کھیلے ہوئے یاروں سے بھی ہاں
ہو کے اوجھل تری نظروں کے کناروں سے بھی ہاں
تیری دنیا کی حدوں سے بھی نکل جاؤں گا
رخصت اے دوست

اب نہ اُلجھیں گی تری راہوں سے راہیں میری
تجھ کو آزردہ کریں گی نہ نگاہیں میری
خللِ اندازِ طرب ہوں گی نہ آہیں میری
اب ترے خواب بھی دیکھیں گی نہ بانہیں میری
مجھ کو ڈھونڈیگا بھی اب تُو تو میں چھپ جاؤں گا
رخصت اے دوست

اپریل 1944

دو یاتری

(ایک شادی کے موقع پر)

دو یاتری ساتھ چلے جیون سندر کا پھر درشن کرنے
پھر پریم کی مورت کے آگے دو من کے کنول روشن کرنے
نظروں سے ملا کر پھر نظریں، پھر ڈال کے بانہوں میں بانہیں
ہنستے ہنستے طے کرنے چلے جگ کی سیدھی اُلٹی راہیں
دنیا پہ دھنش کی بیٹھ کے پھر تاروں کے پتھر پر پگ دھرتے
سنسار کی کالی رین اپنے من سپنوں سے جگمگ کرتے
پھولوں کی طرح ہنستے گاتے آشا کی لچکتی ڈاروں پر
ارماں کے سنہرے کنجوں میں برکھا کے رو پہلے تاروں پر
اے کاش یونہیں ملا ان کو رہتی دنیا تک نیند آئے
کھل جائیں نہ ان کی بند آنکھیں سپنا سپنا ہی رہ جائے

☆

سونلائیں نہ کالے تپتے دن ان کی یہ چمکتی تصویریں
کھلتی ہوئی کلیوں کے گجرے بن جائیں یہ رسی زنجیریں
پڑ جائیں نہ دل میں نیل ان کے دنیا کے سنہری دھوکوں سے
جھل جائیں نہ ان کے نرم بدن ہنستی نظروں کی نوکوں سے

کانٹوں سے بھرے بنجر نکلیں پھولوں کی ٹھمائیں ان کے لیے
دُکھ کے ساگر، چِتا کے بھنور امرت کی گھٹائیں ان کے لیے
سو جائیں نہ ان کے دل اس مندر کے منتر گاتے گاتے
دُنیا کے سے ہو جائیں نہ یہ دُنیا سے رگڑ کھاتے کھاتے

اپریل 1944

میں

مجھے ممکن ہے دھوکا ہو کہ میں روئے حقیقت ہوں
مگر جو کچھ بھی ہوں اس دورِ باطل میں غنیمت ہوں
مجھے روشن نہیں کرتی کوئی سیلی سی چنگاری
فروزاں ہوں تو اس آتش فشاں دل کی بدولت ہوں
مذاقِ بزم نے کیا کیا نہ زک دینے کی کوشش کی
ہواؤں سے جو لڑ لڑ کر بنی ہے وہ عمارت ہوں
میں اپنے وقت کا یہ تو زمانہ ہی بتائے گا
بہ قولِ خود اک آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
ازل سے آج تک گونجے ہیں جو دنیا کے کانوں میں
وہی آنکھوں کا نغمہ ہوں وہی دل کی حکایت ہوں
مرے نغموں سے ہے بیزار آج اک جنگجو دنیا
ابھی کانٹوں میں جو پلتا ہے وہ برگِ محبت ہوں
بنائے زندگی رکھتا ہوں فطرت کے تقاضوں پر
جو فخر آدم پہ کرتا ہے وہ جرمِ آدمیت ہوں
مری تقدیر ہے خود جل کے اوروں کو ضیا دینا
غم اپنے حق میں ہوں اوروں کا سامانِ مسرّت ہوں

بھٹک کر آ گیا اس دور میں کیسے خدا جانے
خرد کی یخ زدہ صبحوں میں اک شامِ محبت ہوں

خزاں کے تند جھونکوں میں بھی خوابِ رنگ و بُو دیکھا
جہنم میں بھی جس نے گُل کھلائے ہیں وہ جنت ہوں

مجھی پر ایک دن ایمان لائے گا جہاں ملا
اگر اُلفت خدائی ہے تو میں دل کی نبوّت ہوں

نومبر 1944

رُوٹھنا

اب نہ کہوں گا تجھ سے کچھ مجھ کو ملال کچھ بھی ہو
لب پہ نہ آئے گا سوال دل میں سوال کچھ بھی ہو
میری خوشی و رنج سے جب تجھے کچھ غرض نہیں
پُوچھ نہ مجھ سے میرا حال اب مرا حال کچھ بھی ہو

دسمبر 1944

اعترافِ محبّت

وہ اعترافِ محبت کا لمحۂ فردوس
میں پا چکا زرو دلبری کہو نہ کہو
نظر سے کہہ بھی چکے تم میں دل سے سُن بھی چکا
زباں سے اب یہ تمھاری خوشی کہو نہ کہو

دسمبر 1944

گُل کردو قمر کو

(1)

اے کاش بجھا دے کوئی قندیلِ قمر کو
اے ابر کے پارے
اس چاند کو ڈھک دے
کیا جانئے کب سے یہ مجھے گھور رہا ہے
پیڑوں کی گھنی ڈالوں میں گہ خود کو چھپا کر
گہ سامنے آکر
نظروں میں مری اپنی نگاہوں کو چبھو کر
گستاخ کہیں کا
بے شرم کی بھولے سے جھپکتی بھی نہیں آنکھ
اور اتنی بڑی آنکھ
جیسے کہ ہے اک گھاؤ سا سینے میں فلک کے
جس میں سے رواں ایک سنہری سا لہو ہے۔
اک گوشہ میں اس کے
میں کیا مری ہستی کی ہر اک چیز سما جائے
اور اس کی نظر کے وہ چمکتے ہوئے نیزے
سینہ میں اُترتے ہی چلے جاتے ہیں میرے
گھنگھور اندھیرے بھی نہاں خانۂ دل کے
ان شوخ لٹیروں کی نظر سے نہیں محفوظ
یہ چیر کے ہر پردہ خاطر مجھے ڈر ہے
دیکھیں گے مری روحِ برہنہ کا تماشا
اور چھین کے لے جائیں گے مجھ سے مری دولت
وہ رازِ محبت

جی بھر کے جسے خود ابھی میں نے نہیں دیکھا
اور ان کی یہ آوارہ و بیباک نگاہیں
لے جائیں گی ہر گوشۂ دنیا میں مری شرم
کس طرح ملاؤں گی نظر اہلِ جہاں سے
ہو جاؤں گی رسوا
اے ابر کے پارے
آ میرے سہارے
اس چاند کو ڈھک دے

(2)

شاید یہ فلک زاد
ہے فطرۃً آزاد
آئینِ رہ و رسم وہاں کا ہے مگر اور
اخلاقِ زمیں اور ہے تہذیبِ فلک اور
اُس دیس میں کیا عشق کوئی جرم نہیں؟
کیا خواہشِ فطری کو چھپایا نہیں جاتا؟
کیا دل کے تقاضوں کو دبایا نہیں جاتا؟
میں بھی وہیں ہوتی تو مجھے فکر نہ ہوتی
لیکن مری دنیا
یہ خاک کی بستی
چھائے ہوئے ہر سمت جہاں عقل کے سایے
ایماں کے دھندلکے
بے نور فضائیں
آباد جہاں آدمِ اعظم کی وہ اولاد
جو مورثِ اوّل کے لیے باعثِ صد ننگ

ٹھٹھرے ہوئے انساں

کم ظرف، جفا کیش، غرض کوش، ریا کار
جو شب کو بھی سوتے ہیں تو پہنے ہوئے چہرے
ترسی ہوئی، سہمی ہوئی، کچلی ہوئی روحیں
ڈرتے ہوئے لیتی ہیں جو اوروں سے چھپا کر
جکڑے ہوئے سینوں میں کچھ اکھڑی ہوئی سانسیں
ہر سانس میں سسکی
اور شوق سے ڈالے ہوئے خود اپنے گلے میں
صدیوں کی تراشی ہوئی زنجیرِ گرانبار
ہر دَور میں جس میں
بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں کچھ حلقۂ نو اور
اک نسلِ غلام ابنِ غلام ابنِ غلام آہ!
پیدائشی قیدی
ان آہنی کڑیوں سے رہائی نہیں ممکن
مجھ میں نہیں ہمت
طائر میں کہاں دم کہ قفس توڑ کے اُڑ جائے
اس چاند سے کہدو کہ نہ پھیلائے بغاوت
بہکائے نہ مجھ کو
اس کی جو سنوں گی تو کہیں کی نہ رہوں گی
دنیا کو ابھی اس کی تجلی کی نہیں تاب
ظلمت کی حکومت ہے اندھیرے کا یہاں راج
اے ابر کے پارے
لا اپنی سیاہی
اور چاند پہ مل دے

دسمبر 1944

1945

غزلیات

(1)

آرزو کو دل ہی دل میں گھٹ کے رہنا آگیا
اور وہ یہ سمجھے کہ مجھ کو رنج سہنا آگیا
پوچھتا کوئی نہیں اب مجھ سے میرا حالِ دل
شاید اپنا حالِ دل اب مجھ کو کہنا آگیا
سب کی سنتا جا رہا ہوں اور کچھ کہتا نہیں
وہ زباں ہوں اب جسے دانتوں میں رہنا آگیا
زندگی سے کیا لڑیں جب کوئی بھی اپنا نہیں
ہو کے شل دھارے کے رُخ پر ہم کو بہنا آگیا
لاکھ پردے اضطرابِ شوق پر ڈالے مگر
پھر وہ اک مچلا ہوا آنسو برہنا آگیا
تجھ کو اپنا ہی لیا آخر نگارِ عشق نے
اے عروسِ چشم لے موتی کا گہنا آگیا
پی کے آنسو ہی کے لب بیٹھا ہوں یوں اس بزم میں
در حقیقت جیسے مجھ کو رنج سہنا آگیا
ایک ناشکرے چمن کو رنگ و بو دیتا رہا
آگیا ہاں آگیا کانٹوں میں رہنا آگیا
لب پہ نغمہ اور رُخ پر اک تبسّم کی نقاب
اپنے دل کا درد اب ملا کو کہنا آگیا

فروری 1945

(2)

حیات اک سازِ بے صدا تھی سرودِ عمرِ رواں سے پہلے
بشر کی تقدیر سو رہی تھی خطائے باغِ جناں سے پہلے

نظر نے کی نذر روح و دل پیش لب پہ شورِ فغاں سے پہلے
ادا ہوا سجدۂ محبت خروشِ بانگِ اذاں سے پہلے

بدل گیا عشق کا زمانہ کہاں سے پہنچا کہاں فسانہ
انھیں بھی مجھ پر زبان آئی وہی جو تھے بے زباں سے پہلے

کسے خبر تھی کہ بن کے برقِ غضب گرے گا یہی چمن پر
وہ حسن جو مسکرا رہا تھا نقابِ ابرِ رواں سے پہلے

ستم تو شاید میں بھول جاتا اگر یہ نشتر چبھا نہ ہوتا
وہ اک نگاہِ کرم جو کی تھی نگاہِ نامہرباں سے پہلے

نظر ہے ویراں مری تو کیا غم نظر کے جلوے تو ہیں سلامت
نہ تھے تم اتنے حسیں میری محبتِ رائگاں سے پہلے

تری طرف پھر نظر کروں گا نشاطِ ہستیِ جاودانی
خرید لوں لذّتِ الم کچھ متاعِ عمرِ رواں سے پہلے

بچھڑ گئے راہِ زیست میں ہم تمھیں بھی اس کا اگر ہے کچھ غم
چلیں وہیں سے پھر آؤ باہم چلے تھے ہم تم جہاں سے پہلے

قفس کی لوہے کی تیلیاں اب انھیں کی ضربوں سے خونچکاں ہیں
یہی جو تھے منتشر سے تنکے تصوّرِ آشیاں سے پہلے

چمن میں ہنسنے سے پھر نہ روکوں گا غنچۂ سادہ لوح تجھ کو
مگر ذرا آشنا تو ہو جا طبیعتِ باغباں سے پہلے

نظر کے شعلے دلوں میں اک آگ ہر دو جانب لگا چکے ہیں
بس اب تو یہ رہ گیا ہے باقی کہ لَو اُٹھے گی کہاں سے پہلے
نہ ڈھونڈو ملا کو کارواں میں پھرے گا صحرا میں وہ اکیلا
کسی سبب سے جو تا بہ منزل نہ آسکا کارواں سے پہلے

مئی 1945

گمراہ مسافر

دنیا کے اندھیرے زنداں سے انساں نے بہت چاہا نہ ملا
اس غم کی بھول بھلیاں سے باہر کا کوئی رستا نہ ملا
اہلِ طاقت اُٹھتے ہی رہے بھاری بھاری تیشے لے کر
دیوار پس دیوار ملی دیوار میں دروازا نہ ملا
ایماں کا فسوں گر بھی آیا جادو کا عصا ہاتھوں میں لیے
اک لکڑی تو اندھے کو ملی آنکھوں کو مگر جلوا نہ ملا
جراحِ خرد آتا ہی رہا صد مرہم اکسیری لے کر
جو زیست کے زخموں کو بھرتے ایسا کوئی پھاہا نہ ملا
ساقیِ سیاست محفل کے جام و مینا بدلا ہی کیا
جس میں اک تہہ تلخی کی نہ ہو کوئی شیریں جرعا نہ ملا
دولت کا مغنی بھی آیا مضرابِ فراموشی لے کر
ہر ساز سے اک نغمہ پھوٹا لیکن دل کا پردا نہ ملا
رقاصۂ عشرت نے آ کر پھر دل سے نکالیں کچھ پھانسیں
لیکن اس کی چٹکی کو بھی جو روح میں کانٹا تھا نہ ملا
تقسیم مساوی کے حامی پھر لے کے بڑھے میزاں اپنا
جو سب کو یکساں تول کے دے میزان میں وہ پلّا نہ ملا
بیچاری اُلفت کی مشعل کونے میں پڑی جل جل کے بجھی
لیکن اسے ہاتھوں میں لے کر کوئی بڑھنے والا نہ ملا
اور پھر کے وہیں پر آتا ہے انساں ہے رہِ باطل پہ ابھی
صدیاں گزریں چلتے چلتے لیکن ہے اسی منزل پہ ابھی

مارچ 1945

یومِ انتقام

کب تک بشر رہے گا اسیرِ خیالِ خام
اوہام پر فریفتہ الفاظ کا غلام

(1)

وہ خطۂ بہار

جو پل رہا ہے گود میں طوفان و باد کی
جس کے بلند نخل صفیں دیوزاد کی
اُبھرا ہوا ہر اک رخِ تاباں کا خال و خد
جس کی حیات پر نہیں مجبوریوں کی حد
منشیٔ خرد کا جس پہ نہ کچھ چل سکا نظام
پرچم اُڑا رہا ہے جو فطرت کا لیکے نام
دنیا کی اصطلاح میں جنگل ہے وہ مقام

(2)

وہ پارۂ زمیں

جس کی رگوں میں خشک ہوا زیست کا لہو
جس سے کہ چھین لی گئی ہر قوتِ نمو
ہر ذرہ ذرہ جس کا شکستہ و خستہ حال
صدیوں سے کر رہا ہے جہاں جس کو پائمال
کوہِ گراں کی زد پہ جہاں زندگی کی کاہ
جو کارواں کی ضربِ قدم سے ہے بے گیاہ
دنیا کی اصطلاح میں اس کا ہے نام راہ

(3)

روندی ہوئی یہ راہ

چلنے نہ پائے اس پہ اگر کوئی راہ رو
ڈالیں نہ سنگ و خشت کے رہ رہ کے بارِ نو
بن جائے کچھ دنوں میں پھر اک وادیِ حسیں
گہوارۂ بہار، گل و لالہ آفریں
صد مخزنِ لطافت و گوہر بدامنے
فردوس درکنار و بہ آغوش گلشنے
اک جوئے آتشیں کے اُبلنے کی دیر ہے
سینہ سے پتھروں کے پگھلنے کی دیر ہے
بس کارواں کے رُخ کے بدلنے کی دیر ہے
زیرِ زمیں سے آنے لگا ہے پھر اک پیام
فطرت منانے والی ہے کیا یومِ انتقام

دسمبر 1945

1946

غزلیات

(1)

جب کبھی امن کی انساں نے قسم کھائی ہے
لب ابلیس پہ ہلکی سی ہنسی آئی ہے
عشق جس دل میں نہیں تکملۂ کیف نہیں
زندگی نیم کشیدہ سی اک انگڑائی ہے
دل میں اک برق کو آسودہ کیا ہے میں نے
تب کہیں جا کے نظر میں یہ تڑپ آئی ہے
میں تری غفلتِ پیہم سے بھی مایوس نہیں
میں نے بے لوث محبت کی قسم کھائی ہے
شمع اک موم کے پیکر کے سوا کچھ بھی نہ تھی
آگ جب تن میں لگائی ہے تو جان آئی ہے
قصۂ دل کے ہیں دو باب ہمیشہ سے یہی
پہلے تقصیر ہے پھر ذوقِ جبیں سائی ہے
ہاں اسی زیست کے ایسے بھی ہیں کچھ نظارے
موت کی آنکھ جنھیں دیکھ کے شرمائی ہے
چشم خونبار میں باقی نہ رہا کیا کوئی اشک
آج بیمار محبت کو ہنسی آئی ہے
آ گئی ختم پہ بازیِ دلِ ناکام تری
مات کھاتا ہے جسے چل کے وہ چال آئی ہے

یہ بھی درکار ہے رعنائی گلشن کے لیے
وہ جو بازو میں اسیروں کے اک انگڑائی ہے
اپنی محفل میں ابھی تک ہیں وہی جام پہ جام
اور دنیا ہے کہ انگڑائی پہ انگڑائی ہے
تیری بیگانہ روی کا نہ کروں گا شکوہ
ورنہ کانٹوں سے بھی پھولوں کی شناسائی ہے
عشق مفلس کا ہے اک نیم کشیدہ سی شراب
اور جوانی بھی ادھوری سی اک انگڑائی ہے
ہم کو معلوم ہے محفل میں مقامِ ملا
چمن شعر میں اک لالۂ صحرائی ہے
جذبۂ عشق ترا خام ابھی ہے ملا
تیرے دل میں ابھی اندیشۂ رسوائی ہے

جنوری 1946

(2)

خبر آئی ہے چمن میں نہیں دور وہ زمانا
کہ قفس کی تیلیوں ہی سے بنے گا آشیانا
مجھے کر چکی تھی وقفِ شبِ غم تری جدائی
تجھے یاد کر کے سیکھا مرے غم نے مسکرانا
وہ عجب گھڑی تھی نظریں مری تجھ سے جب ملی تھیں
مگر ایک دم کو جیسے کہ ٹھہر گیا زمانا
مری اجنبی نظر سے تمھیں کیوں کوئی گلہ ہو
میں تمھیں بھلا چکا ہوں مرے سامنے نہ آنا

اسے پا کے کھو چکا ہوں مجھے اب یہ دیکھنا ہے
کہ مرے نصیب میں ہے کبھی کھو کے اُس کو پانا
مری زیرِلب حقیقت کی اُسے خبر نہ ہوتی
وہ تو یہ کہو کہ دنیا نے بنا دیا فسانا
کوئی کہہ رہا ہے جیسے مرے غم کی تیرگی میں
میں بجھا چکا ہوں جن کو وہ دیے نہ پھر جلانا
تری فکر اور عمل میں نہیں کوئی ربط ملا
تری زندگی غلامی ترا ذہن باغیانا
فروری 1946

(3)

زیست ہے اک معصیت سوزِ دلی تیرے بغیر
ہاں محبت بھی ہے اک آلودگی تیرے بغیر
شامِ غم تیرے تصور ہی سے آنکھوں میں چراغ
ورنہ میرے گھر میں ہو اور روشنی تیرے بغیر
یہ جہاں تنہا بھلا کیا مجھ کو دے پاتا شکست
میں نے کب کھایا فریبِ دوستی تیرے بغیر
رات کے سینہ میں ہے اک زخم جس کا نام چاند
اک سنہری جوئے خوں ہے چاندنی تیرے بغیر
ہر نفس ہے پے بہ پے ناکامیوں کا سامنا
زیست ہے اک مستقل شرمندگی تیرے بغیر
دے گئی دھوکا مگر شائستگیِ غم مری
آرہا ہے دل پہ الزامِ خوشی تیرے بغیر

علم و عقل و نام و جاہ و زور و زر سب ہیچ عشق
ہو کے سب کچھ بھی نہیں کچھ آدمی تیرے بغیر
دل کی شادابی کی ضامن ہے تو ہی اے یارِ دوست
آ نہ پائی غم کے پھولوں میں نمی تیرے بغیر
ایک اک لمحہ میں جب صدیوں کی صدیاں کٹ گئیں
ایسی کچھ راتیں بھی گزری ہیں مری تیرے بغیر
زندگی ملا کی ہے مجبوب نامِ زندگی
رہ گئی ہے شاعری ہی شاعری تیرے بغیر

اپریل 1946

(4)

ہر جلوہ پر نگاہ کیے جا رہا ہوں میں
آنکھوں کو خضرِ راہ کیے جا رہا ہوں میں
مٹنے نہ پائے تازگیِ لذتِ گناہ
توبہ بھی گاہ گاہ کیے جا رہا ہوں میں
کیسی یہ زندگی ہے کہ پھر بھی ہے شوقِ زیست
گو ہر نفس اک آہ کیے جا رہا ہوں میں
اشکوں کی مشعلوں کو فروزاں کیے ہوئے
طے التجا کی راہ کیے جا رہا ہوں میں
خود جس کے سامنے سپر انداختہ ہے حسن
ایسی بھی اک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں
شاید کبھی وہ بھول کے رکھیں اِدھر قدم
آنکھوں کو فرشِ راہ کیے جا رہا ہوں میں

بڑھتی ہی جا رہی ہیں تری کم نگاہیاں
کیا دل میں تیرے راہ کیے جا رہا ہوں میں
ظلمات دیر و کعبہ میں کچھ روشنی سی ہے
شاید کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں
ملا ہر ایک تازہ مصیبت پہ ہنس کے اور
کج گوشۂ کلاہ کیے جا رہا ہوں میں
اپریل 1946

(5)

دل میں ناکامی کی جب تک تشنگی ہوتی نہیں
عشق کی اُس وقت تک تکمیل سی ہوتی نہیں
عشق کی آزردگی آزردگی ہوتی نہیں
ٹوٹتا ہے دل محبت میں کمی ہوتی نہیں
زندگی امید سے خالی کبھی ہوتی نہیں
روشنی بجھ کر بھی دل میں تیرگی ہوتی نہیں
اشک کچھ ایسے بھی ہیں جن میں نمی ہوتی نہیں
دل سلگتا ہے نظر میں روشنی ہوتی نہیں
دل کی زنجیریں نہ ٹوٹیں توڑدی ہر رسم وراہ
اجنبی بنتے ہیں اور بیگانگی ہوتی نہیں
اک ذرا کام و دہن کی تربیت درکار ہے
ورنہ یہ مینا میں جوشے ہے بُری ہوتی نہیں
اے خدائے رنج وراحت بخت انساں کی قسم
بے زباں بندوں سے بھی اب بندگی ہوتی نہیں

کیوں ستم سے تم اُٹھاؤ ہاتھ میں یوں بھی ہوں خوش
کیا تمھیں خوش دیکھ کر مجھ کو خوشی ہوتی نہیں
فطرت انساں نہ بدلی ہے نہ بدلے گی کبھی
یوں نئی کہنے سے کچھ دنیا نئی ہوتی نہیں
کر چکا تیرا تغافل کام اپنا ساقیا
اب تو ساغر دیکھ کر بھی تشنگی ہوتی نہیں
دل میں اک سچی ندامت آگئی جن کے لیے
وہ خطائیں لاکھ ہوں آلودگی ہوتی نہیں
بند منھ کرنے سے ملا کیا بھرے گا زخم دل
اندر اندر خون بہنے میں کمی ہوتی نہیں
مئی 1946

(6)

وہ کرم ہو یا ہو ستم ترا جو ہو مجھ پہ یوں تو بُرا نہ ہو
ترے مرتبہ سے بھی کم نہ ہو مرے ظرف سے بھی سوا نہ ہو
یہ قدم قدم کی شکستگی یہ نفس نفس کی گرفتگی
مری زندگی کا بسرا لیے کوئی دشمنوں کا خدا نہ ہو
تری پختہ کاریِ ناز کا ہے ہر ایک وار جچا تُلا
وہ مذاقِ تیرِ نظر ترا کہ خطا بھی ہو تو خطا نہ ہو
دلِ صبر کُن تجھے چاہیے کہ ہو خستگی میں بھی نغمہ زن
کہ وہ آئینہ نہیں موم ہے جو شکستہ ہو تو صدا نہ ہو
یہ ہے کون منزلِ عاشقی کہ جو یاد آئے ہر اک گھڑی
کہیں اتفاق سے جب ملے تو کوئی سلام و دعا نہ ہو
اگست 1946

لال قلعہ

روکے گا تجھے اب کون وطن کھوئی ہوئی عظمت پانے سے
پھر لال قلعہ کی دیواریں دہراتی ہیں افسانے سے
ذرہ ذرہ خود اپنی جگہ جن کا ہیرا اور پنّا تھا
ان دیواروں کی قسمت میں زندانِ فرنگی بننا تھا
معراجِ وطن بھی دیکھ چکیں تاراجِ وطن بھی دیکھ لیا
اپنے دل پر پتھر رکھ کر سن ستاون بھی دیکھ لیا
دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجی اور یہ پنبہ درگوش رہیں
رنگون کے قیدی کی آنکھیں نکلیں پھر بھی خاموش رہیں
چپکے چپکے رودادِ وطن کا درسِ تباہی دیتی ہیں
تاریخ کے کن کن جرموں کی خاموش گواہی دیتی ہیں
اک معرکہ تاریخی ہے پھر آج انھیں دیواروں میں
ہمت والے مجبوروں میں طاقت والے مختاروں میں
آئینِ حکومت اک جانب، آئینِ خدا ساز اک جانب
قانون کے الفاظ اک جانب اور دل کی آواز اک جانب
سوگندِ سپاہی ایک طرف، عہدِ وطنیت ایک طرف
بے روح سے جملے ایک طرف، سینوں کی حرارت ایک طرف

کاغذ کی قسم کیا سب کچھ ہے، فطرت کا تقاضا کچھ بھی نہیں؟
کھائی تھی جو ماں کے سینے پر وہ دل کی قسم کیا کچھ بھی نہیں؟
کب دل کی آگ دبا پائی رسمی عہدوں کی سرد آبی
نبضوں کی دہکتی گرم روی، سانسوں کی سلگتی بے تابی
جب دل لَو دینے لگتا ہے، پھر کھوئی عقل پگھلتی ہے
زنجیرِ غلامی کی کڑیوں سے بھی اک آنچ نکلتی ہے
شوقِ آزادی ہر ذی حس انساں کے دل کا جذبہ ہے
اقدامِ بغاوت محکوموں کی خودداری کا حربہ ہے
لاوارث ہند کی فوجوں کو غربت میں وطن کی یاد آئی
اک خواب سا بن کر پیشِ نظر تصویرِ جہاں آباد آئی
خاموش اُداسی ان دیواروں کی اک نشتر بن کے چُبھی
جو پہلی چوٹ پلاسی میں کھائی تھی ہوئی سینوں میں ہری
اک نقشِ وفا اُبھرا دل میں کچھ آنکھوں سے پردے سرکے
پھر ہلدی گھاٹ کا خوں کھولا، پانی پت کے ذرّے چمکے
اک ہُوک سی اُٹھی سینوں میں پھر لڑ کے حکومت ہاتھ میں لو
ہر لب پہ پکار آئی دل کی، دہلی کو چلو، دہلی کو چلو
مجبوروں کی غیرت جاگی، جانبازیِ غیرت کیا کہیے
جس جرم پہ نیکی وجد کرے اس جرم کی عظمت کیا کہیے
اس جنگ میں اپنے نذرانے ہر خاکِ وطن نے پیش کیے
ہر گھر نے دیے اپنے موتی ہر گود نے اپنے پھول دیے
ہمّت کی روایاتِ ماضی میں روح و جوانی پھر آئی
میداں میں نکل کر تیغ بکف جھانسی کی رانی پھر آئی
آزاد وطن کے پرچم میں ہر رنگ کے رشتے سل ہی گئے

'جے ہند' کے مرکز پر آ کر جتنے خط تھے سب مل ہی گئے
'جے ہند' کے نعرے پہنچے ہیں پھر آج انھیں ایوانوں میں
جو پہلے پہل گونجے تھے ملایا کے خونی میدانوں میں
ان نعروں میں اُمید بھی ہے، پیغام بھی ہے اور عزم بھی ہے
فردا کا سازِ بزم بھی ہے، امروز کا عہدِ رزم بھی ہے
بجلی کی کڑک بھی ان میں ہے شعلوں کا مہیب آہنگ بھی ہے
اُٹھتے ہوئے سورج کی ہنستی کرنوں کا سنہرا رنگ بھی ہے
ہر پردۂ ظلمت چیر کے پھر صد جلوہ بداماں آتی ہے
اب اس میں تو کوئی شک ہی نہیں اک صبح درخشاں آتی ہے
پھر آزادی کا پرچم ان دیواروں پر لہرائے گا
وہ دن آئے گا جلد آئے گا اور یقیناً آئے گا

جنوری 1946

نذرِ بجنور

(یو۔ پی اسمبلی کے جنرل الیکشن میں بجنور سے حافظ محمدؐ ابراہیم صاحب کی شاندار کامیابی پر)

خاکِ بجنوری! تری عظمت مسلم آج ہے
تو وطن کی اک زیارت گاہِ اعظم آج ہے
اور سب شہروں سے اونچا تیرا پرچم آج ہے
لیگ کی گھائل صفوں میں تیرا ماتم آج ہے
تجھ میں کتنے اسودی سینوں کی عیدیں دفن ہیں
کتنی داغی کرم آلودہ امیدیں دفن ہیں

تیرا پرچم نغمائے حریّت گاتا ہوا
اُڑ رہا ہے تیرگی پر نور برساتا ہوا
چوٹیوں پر قصرِ آزادی کی لہراتا ہوا
دل میں کیا کیا اپنی خوش رنگی پہ اتراتا ہوا
دیکھ کر اس کی سہ رنگی ہر طرف چھائی ہوئی
قوس ہے بامِ فلک پر آج شرمائی ہوئی

یہ زبانِ حال سے دیتا ہے مسلم کو پیام
اے کہ تیرا سنگ بنیادی ہے اک جمہورِ عام!
بندگانِ خود پرستی اور ہوں تیرے امام؟
حافظانِ دین و ملّت طالبانِ جاہ و نام؟
تیرے باغیچہ میں گنجائش ببولوں کی نہیں
اس خزاں پر بھی کمی اتنی تو پھولوں کی نہیں

یہ نفاقِ باہمی اے کم نظر زندہ نہ کر
دیکھ یوں اپنی غلامی آپ پائندہ نہ کر
تجھ کو ہمت کی قسم کچھ خوفِ آئندہ نہ کر
اپنے اجمل خان و انصاری کو شرمندہ نہ کر
جنگِ آزادی ہو اور لڑنے پہ تو راضی نہ ہو
اب تجھے اتنا بھی پاسِ عظمتِ ماضی نہ ہو

کیا تجھے یاد اپنی تاریخِ کہن کچھ بھی نہیں
کیا ترے آئین میں حقِ انجمن کچھ بھی نہیں
آشیانہ ہی ہے سب کچھ اور چمن کچھ بھی نہیں
کیا مسلمانوں کے ایماں میں وطن کچھ بھی نہیں
بابِ قومی کون ہے جس میں نہیں عنواں ترا
اس زمیں کے چپہ چپہ میں ہے "پاکستاں" ترا

مارچ 1946

آخری سلام

(عاشق سماج سے مقابلہ کرنے کی تاب نہ لا کر محبوبہ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ محبوبہ اسے خط لکھتی ہے)

رخصت اے روحِ تمنا! الوداع اے جانِ شوق
جا رہے ہو کر کے ویراں تم مرا ایوانِ شوق
بھولنے والے مرے دے کر مجھے پیمانِ شوق
بیوفائی کا گلہ لیکن نہیں ایمانِ شوق
میں تمھیں جانے سے روکوں کون ہوں؟ کوئی نہیں
جاؤ جاؤ شوق سے میرا تو حق کچھ بھی نہیں

میں کسی ماں باپ کی بیچی ہوئی لڑکی نہیں
میں نے عہدِ عشق میں کوئی تجارت کی نہیں
اندھے گونگے دیوتاؤں کی گواہی لی نہیں
تم کو سب کچھ دیدیا قیمت کوئی مانگی نہیں
جس کو اپنا میں نے سمجھا اُس کو اپنا کر لیا
دو دلوں کا مل کے چار آنکھوں نے سودا کر لیا

دل کو سینہ میں نہ رکھا میں نے تربت کی طرح
آرزو کی قدر کی زندہ حقیقت کی طرح
اس سیہ خانہ میں جی معصوم فطرت کی طرح
تم سے کی میں نے محبت اور محبت کی طرح
یہ مثالی ہے اسی کو عشق جس کا کیش ہے
ہائے دنیا کس قدر نا عاقبت اندیش ہے

یوں مگر اُڑ جائیں جو سینوں کی تصویریں نہیں
مٹنے والی دفعتاً نظروں کی تحریریں نہیں
یک بیک گر جائیں جو الفت کی تعمیریں نہیں
ایک جھٹکے میں جو ٹوٹیں دل کی زنجیریں نہیں
خود بخود رہ رہ کے تم اک یاد میں کھو جاؤ گے
اور اتنی دیر کو تم پھر مرے ہو جاؤ گے

رفتہ رفتہ زندگی اپنا بناتی جائے گی
خون میں پانی کی آمیزش بڑھاتی جائے گی
عقل جاگے گی تو دل کو نیند آتی جائے گی
ایک جھوٹی مصلحت ہر شے پہ چھاتی جائے گی
تم بھی ہو جاؤ گے آخر کامیابِ زندگی
عشق کو سمجھو گے دیوانوں کا خوابِ زندگی

مرد کو سو مشغلے ہیں دل لگانے کے لیے
رزم و بزم زندگی جو ہر دکھانے کے لیے
دفتر و بازار قسمت آزمانے کے لیے
لیکن اک عورت کرے کیا غم بھلانے کے لیے
پھر بسا کر دل کو اپنے خانہ ویراں دیکھنا
جاگنا اور پھر وہی خوابِ پریشاں دیکھنا

یہ تو ممکن ہے کہ کم ہو جائے جوشِ اضطراب
آرزو پیدا کرے دنیائے دل میں انقلاب

پھر نظر آئے کسی صورت میں امّیدوں کا خواب
زندگی پھر زندگی ہے اور شباب آخر شباب
طبع لیکن سوچ کر یہ بھی سکوں پاتی نہیں
صبح کے خوابوں سے شب کی تیرگی جاتی نہیں

تم گئے اچھا کیا مجھ کو اب اس کا غم نہیں
یادِ عہدِ عشق عہدِ عشق سے کچھ کم نہیں
ہاں میں خوش ہوں میری بزمِ زیست میں ماتم نہیں
آہ ہونٹوں پر نہیں آنکھیں مری پُرنم نہیں
روشنائی پھیلی پھیلی سی جو خط میں ہے کہیں
یہ عرق کی بوندیں ٹپکی ہیں مرے آنسو نہیں

تیرگی میں زیست کی دو دل نبوت کر چکے
نامِ الفت لینے والے ترک اُلفت کر چکے
لب مرے جو کچھ بھی کرنا تھی شکایت کر چکے
ختم افسانہ ہوا ہم تم محبت کر چکے
بھیجتی ہوں اپنی مینا کا یہ جامِ آخری
جانے والے جا تجھے دل کا سلامِ آخری

اگست 1946

شیوۂ حسن

آگ لگائی آ کے پاس آگ لگا کے دُور دُور
شیوۂ حسن ہے یہی اپنا بنا کے دُور دُور
پائے نہ اضطرابِ عشق کوئی سکوں کسی طرح
دُور جا کے پاس پاس، پاس بھی آ کے دُور دُور

دسمبر 1946

1947

غزلیات

(1)

کچھ اس ادا سے آج وہ جلوہ دکھا گئے
ہر وادیِ نگاہ کو ایمن بنا گئے
ہر حسنِ ماسوا کے ستارے بجھا گئے
وہ مہربن کے آئے اور آنکھوں پہ چھا گئے
ہم ان سے کہہ سکے نہ کبھی داستانِ شوق
عنوان کیسے کیسے نگاہوں میں آگئے
اہلِ نظر نے اور بڑھا دی بہائے حسن
اک اک ادا پہ دل کے خزانے لٹا گئے
رُکتی نہیں کسی کے لیے موجِ زندگی
دھارے سے جو ہٹے وہ کنارے پہ آگئے
آج اک غرورِ حسن بھی شامل ہے حسن میں
شاید کسی نگاہ کا کچھ بھید پا گئے
گُم کتنے کارواں ہوئے ایماں کے نور میں
اچھے رہے جو سایہِ اُلفت میں آگئے
وہ دل پھر اس کے بعد نہ تاریک ہو سکا
جس میں دیے وہ اپنی نظر سے جلا گئے

جو اشک اشک تھے ہوئے صرفِ گدازِ دل
جو ننگِ خانداں تھے وہ آنکھوں میں آ گئے
ایام فصلِ گل کا پھر آنا تو کچھ نہ تھا
یہ آئے اور یاد کسی کی دلا گئے
واعظ نے یوں بیان کیں کوثر کی لذتیں
تھے جتنے رندِ خام وہ باتوں میں آ گئے
ملا کسی سے شکوۂ غفلت کرو گے کیا
سچ بات تو یہ ہے کہ تمھیں ہچکچا گئے

مارچ 1947

(2)

بھٹکے ہوئے انساں کو پھر سے آگاہِ رہِ منزل کر دے
اے دل کی حقیقت پردہ اٹھا ہر نقشِ خرد باطل کر دے
کانٹے چبھنے سے کیا حاصل اک بار مذاقِ سبزہ و گل
جس میں کانٹے جم ہی نہ سکیں وہ سیرتِ آب و گل کر دے
جس رنگ کی تہہ میں ہو نہ لہو تہذیب کا غازہ اس کو بنا
جس نور میں ہو شعلہ کی نہ خُو، اس سے روشن محفل کر دے
کب تک ہر ساحلِ ہستی کا اک رزمگہِ امواجِ فنا
ہر موج کے سینے میں پیدا آسودگیِ ساحل کر دے
اے گرم رویِ زیست ذرا آہستہ خرامی تھوڑی سی
یہ تیز تنفس ہی تیرا جینا نہ کہیں مشکل کر دے
ماضی کی شبِ تاریک میں گم ہو جائے یہ مہرِ تاباں بھی
اک صبحِ نو میں نور اپنا ہر ذرہ اگر شامل کر دے

ہر قوم سے لے کر رنگ اس کا اک قوسِ عالمگیر بنا
اس رنگیں قوس کو محرابِ دانش سرِ مستقبل کر دے
جنت کے مجاہد کی سوگند تجھے اے روحِ پاکِ بشر
اس دیر و حرم کی دنیا کو انساں کے کبھی قابل کر دے
ملا پہ جتا اپنی نہ عطا غیرت کو نہ اس کی ٹھیس لگے
ٹھکرا کے ترا ہر لطف و کرم انکار نہ وہ سائل کر دے

مارچ 1947

(3)

کسی کی زندگی کا رنج ہی حاصل نہ بن جائے
غم اچھا ہے مگر جب تک مزاجِ دل نہ بن جائے
دلوں کی بے حجابی ہی حجابِ دل نہ بن جائے
محبت بڑھ کے خود اپنے لیے قاتل نہ بن جائے
مقامِ بے خودی تک شوق کو لا پھر نہیں ممکن
قدم جس سمت بھی اُٹھے رہِ منزل نہ بن جائے
خرد کے ہاتھ میں دل کا سفینہ سونپنے والے
تری جو لانگہِ کشتی حدِ ساحل نہ بن جائے
بدلتی زندگی میں کیا حقیقت اور کیا باطل
حقیقت آج کی کل کے لیے باطل نہ بن جائے
خبر لے نغمۂ سازِ شکستہ چھیڑنے والے
ترا نغمہ ہی خود برہم زنِ محفل نہ بن جائے
نکل دیر و حرم سے طالبِ جنت مرادمہ
اگر پھر یہ جہاں خود جنتِ حاصل نہ بن جائے

ترا باطن اگر روشن نہیں بیکار ہیں آنکھیں
نظر بے نور ہے جب تک شعاعِ دل نہ بن جائے
مقامِ ترکِ اُلفت پر نہ جانے کب سے ہے ملا
یہی اس کی وفا کی آخری منزل نہ بن جائے
اپریل 1947

(4)

شکستِ غم کو دلِ کامیاب کیا جانے
یہ لُو یہ دھوپ شبِ ماہتاب کیا جانے
کرم کرم ہے حدّ و حساب کیا جانے
یہ شہر ہے وہ بیاباں سحاب کیا جانے
نیازِ شوق کوئی شرط جانتا ہے نہ عذر
زبانِ عشق سوال و جواب کیا جانے
اُلجھ کے رہ گئی حسنِ نقاب میں جو نظر
وہ حسنِ جلوۂ زیرِ نقاب کیا جانے
وہ با خبر تو ہے شاید مرے الم سے مگر
نفس نفس کا مرے اضطراب کیا جانے
بہک گیا کوئی پی کر تو مے کا کون قصور
کمی ظرف کو کیفِ شراب کیا جانے
ہوس کا وہ سخنِ پُر تکلف و رنگیں
خلوصِ عشق کا سادہ خطاب کیا جانے
بہے ہیں کتنے ستاروں کے اشک آخرِ شب
سحر کا ہنستا ہوا آفتاب کیا جانے

محبت آج بھی ہے حاصلِ حیاتِ بشر
حقیقتِ ابدی انقلاب کیا جانے
یہ سیر کاموں کی باتیں ہیں سب ارے ملا
نصیب تشنہ لبی اجتناب کیا جانے

اپریل 1947

(5)

اب اپنے دیدہ و دل کا بھی اعتبار نہیں
اُسی کو پیار کیا جس کے دل میں پیار نہیں
نہیں کہ مجھ کو طبیعت پہ اختیار نہیں
ہر اک جام سے پی لوں وہ بادہ خوار نہیں
ہر ایک گام پہ کانٹوں کی ہیں کمیں گاہیں
شباب آہ شگوفوں کی رہ گزار نہیں
بھری ہوئی ہے وہ کام و دہن میں تلخیِ زیست
کہ لب پہ جامِ محبت بھی خوشگوار نہیں
نہ میرے اشکوں سے دامن پہ تیرے آئیگی آنچ
یہ شعلۂ رُو ہیں مگر فطرتِ شرار نہیں
کہیں چھپائے سے چھپتی بھی ہے حقیقتِ غم
وہ غم ہی کیا جو مسّرت سے آشکار نہیں
میں تیری یاد سے بہکا چکا ہوں یوں دل کو
کہ اب مجھے تری فرقت بھی ناگوار نہیں
مرے سکوں کے لیے کیوں یہ کوششِ پیہم
قرار چھیننے والے تجھے قرار نہیں

جہان عقل کے نفرت کدوں میں بٹ جاتا
ہزار شکر محبت پہ اختیار نہیں
کسی کی لوٹ کے راحت، خوشی نہیں ملتی
خزاں کے ہاتھ میں سرمایہ بہار نہیں
نگاہِ دوست کو اس کی بھی ہے خبر لیکن
وہ راز جس کا ابھی دل بھی راز دار نہیں
توجہِ نگہہِ یار کا سبب معلوم
دل گرفتہ ملا ابھی شکار نہیں
ستمبر 1947

(6)

بشر کو مشعل ایماں سے آگہی نہ ملی
دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی
خوشی کی معرفت اور غم کی آگہی نہ ملی
جسے جہاں میں محبت کی زندگی نہ ملی
جگر نہ تھا کہ کوئی پھانس سی چبھی نہ ملی
جہاں کی خاک اُڑائی کہیں خوشی نہ ملی
یہ کہہ کے آخرِ شب شمع ہو گئی خاموش
کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی
لبوں پہ پھیل گئی ایک موجِ غم اکثر
بچھڑ کے تجھ سے ہنسی کی طرح ہنسی نہ ملی
طوافِ شمع پتنگوں کا جل کے بھی ہے وہی
جگر کی آگ سے آنکھوں کو روشنی نہ ملی

ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظامِ چمن
فسردہ غنچوں کو جس میں شگفتگی نہ ملی
فلک کے تاروں سے کیا دور ہوگی ظلمتِ شب
جب اپنے گھر کے چراغوں سے روشنی نہ ملی
ابھی شباب ہے کر لوں خطائیں جی بھر کے
پھر اس مقام پہ عمرِ رواں ملی نہ ملی
وہ قافلے کہ فلک جن کے پاؤں کا تھا غبار
رہِ حیات سے بھٹکے تو گرد بھی نہ ملی
وہ تیرہ بخت حقیقت میں ہے جسے ملا
کسی نگاہ کے سایے کی چاندنی نہ ملی
نومبر 1947

آ ہی گیا

ظلمِ معزولی بہ نامِ تیرگی آ ہی گیا
وادیِ شب میں پیامِ روشنی آ ہی گیا
روشنی ڈوبے ہوئے تاروں کی کام آ ہی گئی
آج ہر ذرّے میں نورِ کوکبی آ ہی گیا
چیرتا ظلمت کو تہہ در تہہ سحاب اندر سحاب
پھر اُفق پر آفتابِ زندگی آ ہی گیا
اک مہک دینے لگے کھلتے ہوئے سے برگِ گل
اب چمن میں ختمِ دورِ غنچگی آ ہی گیا
انجمن میں تشنہ کاموں کی بہ صد مینا و جام
آج ساقی لیکے اذنِ مے کشی آ ہی گیا
گھاؤ جن کانوں میں تھے آقا کے حرفِ تلخ کے
اُن میں اک نغمہ بہ لحنِ مادری آ ہی گیا
تیشۂ فرہاد بہرِ قصرِ خسرو تابہ کے
کوہکن کی زد پہ قصرِ خسروی آ ہی گیا
دورِ آہن، دورِ ایماں، دورِ شاہی، دورِ زر
روندتا ان سب کو دورِ آدمی آ ہی گیا
اے عروسِ ہند کے بکھرے ہوئے موتی کے ہار
گوندھنے پھر تجھ کو تیرا جوہری آ ہی گیا
شمع رکھتی جا رہی ہے ہندِ نو کے سامنے
نظمِ افرنگی کا شعرِ آخری آ ہی گیا
اک حقیقت بن کے ملا خوابِ ارمانِ وطن
اے زہے قسمت کہ اپنے جیتے جی آ ہی گیا

اگست 1947

صبحِ آزادی

شب مُردہ کی لیے لاش حسیں شانوں پر
گنگنا جس کا ابھی تک ہے بدن
رقص کرتا ہوا آتا ہے نیا طفلکِ صبح
صبحِ آزادیِ زندانِ وطن
لڑکھڑاتے ہوئے اس بارِ گراں کے نیچے
بہکے بہکے ابھی پڑتے ہیں قدم
پھر بھی اک خلدِ نظر جنّتِ کیف
مستیِ رقص سے ہر عضوِ حسیں نشہ میں چور
تن پہ زرتار سہ رنگی پوشاک
زعفراں، سبز و سفید
جو سرکتی ہے ہر اک جُنبشِ پا سے کچھ اور
نگہہِ گرم تمنا کے لیے اک مہیز
اور اندر سے فروزاں وہ دہکتا ہوا جسم
جیسے فانوس میں اک شعلہِ لرزاں کی تڑپ
رفتہ رفتہ جو اُبھرتا ہی چلا آتا ہے
گُلِ نورس کوئی جیسے چمنستان میں کھلے
شوخ، طرّار، جواں گام، سبک رو، مغرور
دلربائی پہ جسے اپنی بھروسہ پورا۔
لب پہ ہلکی سی وہ اک موجِ تبسم غلطاں

جس میں انگڑائیاں لیتا ہے امیدوں کا شباب
اور مچلتے ہوئے ارماں بیتاب
اس کی نظروں میں ہے اک خواب حیات
اس کی ہر جنبشِ پا ہے کہ ہے مضراب حیات
جس سے دیتا ہے گزرتے ہوئے انفاس پہ تال
گرم رو، برق خرام
موج صرصر میں اڑاتی ہوئی پرچم اک لو
اور تیزی سے بجاتا ہوا اپنے گھنگھرو
جس کے ہر بول کی گونجی ہوئی آواز میں ہے
قلبِ ہستی کے دھڑکنے کی صدا
شوق کی زندہ و تابندہ و پائندہ شبیہ
خوابِ ارماں کی سنہری تعبیر
لمحۂ حاصلِ زیست
جس کے سینہ میں نہاں ایک نشاطِ ابدی
اگست 1947

سجدۂ عقیدت

محفلِ دہر میں جتنے بھی نظام آئے ہیں　　لیکے سب مژدۂ بہبودیِ عام آئے ہیں
پھر بھی ہے قافلہ آلِ بشر دشت نورد　　گو چمن بن کے ہزاروں ہی مقام آئے ہیں
تشنہ انساں کے لیے جرعۂ شیریں کہہ کر　　قطرہ تلخ وہی جام بہ جام آئے ہیں
آہ! نادان پتنگوں کی تباہی کے لیے　　کتنی ہنستی ہوئی شمعوں کے پیام آئے ہیں
جلوۂ صبحِ مسرّت کی مناتے ہوئے عید　　کتنے ایّام سیہ بختیِ شام آئے ہیں
اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے زہر آبِ حیات　　بزم میں کتنے کھنکتے ہوئے جام آئے ہیں
کتنے طوفانِ جگر جوششِ صد موج لیے　　چشم تک آئے تو کچھ قطرۂ خام آئے ہیں
زندہ باد ابلہ فریبیِ جہانِ معصوم　　عقلِ کُل بن کے یہاں جہلِ تمام آئے ہیں
بھیس میں خضر کے آئے ہیں سکندر کتنے　　کتنے راون ہیں جو جپتے ہوئے رام آئے ہیں
آشیاں رنگ قفس لائے ہیں کتنے صیّاد　　کتنے شاہیں ہیں جو طاؤس خرام آئے ہیں
کتنے ظلمات کے پالے ہوئے سایۂ شب رنگ　　بن کے اک طور سر منظرِ عام آئے ہیں
اونچی کرتے ہوئے ہر سانس سے لَو نفرت کی　　کتنے تبلیغِ محبت کے امام آئے ہیں
آستینوں میں لیے خون سے تر دشنۂ تیز　　کتنے خوشبو بسے ہاتھوں کے سلام آئے ہیں
جن کی تلخی کے مقابل میں ہے حنظل بھی نبات　　آہ کتنے لبِ شیریں سے کلام آئے ہیں
آنکھ اُٹھتے ہوئے ڈرتی ہے سوئے بامِ فلک　　کتنے فردوس نشیمن تہہِ دام آئے ہیں
آہ کس دل سے یقیں آئے کسی جلوہ کا　　کتنے چڑھتے ہوئے سورج لبِ بام آئے ہیں
ابنِ آدم کے لیے جبر کے کتنے نئے دور　　لیکے انساں کی مساوات کا نام آئے ہیں
خلد سازی کے ارادوں کے حسیں نقش و نگار　　زینتِ طاقِ جہنّم ہی کے کام آئے ہیں

ہاں سمجھتا ہوں بلندی میں نہاں ہے جو نشیب
پھر بھی کھاتا ہوں میں آج اپنی تمنّا کا فریب
ایک سجدے کو شناسائے جبیں اور کروں
دل کا اصرار ہے اک بار یقیں اور کروں
اے وطن سر پہ نیا تاج مبارک تجھ کو
یومِ آزادیٔ ہند آج مبارک تجھ کو

ستمبر 1947

انسانی درندے

غارت و قتل کی ہے گرمیِ بازار وہی
ابھی انسان کی ہے فطرتِ خونخوار وہی

رائگاں سعیِ خرد، علم کی دولت بے سود
جہلِ آدم کا جو تھا ہے ابھی معیار وہی

سب سے قانون بڑا آج بھی قانونِ قصاص
سب میں مضبوط دلیل آج بھی تلوار وہی

سطحی ہے فقط اخلاص و محبت کی چمک
زیرِ آئینہ ابھی ہے تہہِ زنگار وہی

دیکھنے ہی کے لیے ہیں یہ خدوخالِ بشر
دل میں آباد ہے عفریتِ سیہ کار وہی

اُڑی چہرہ سے جہاں رنگِ تمدن کی نقاب
ہے نگاہوں کے دریچوں سے شرر بار وہی

ٹوٹی پتلی سی جہاں کھوکھلی تہذیب کی آڑ
نظر آتا ہے درندہ پسِ دیوار وہی

ایک سے ایک سوا کون کہے کس سے کہے
اہلِ تسبیح وہی، صاحبِ زنّار وہی

کس کو مظلوم کہیں، کس کو ستمگار کہیں
آج مظلوم وہی، کل ہے ستمگار وہی

جتنا ہی جو تھا روا دار کبھی اتنا ہی
آج ہم کیشِ لٹیروں کا طرفدار وہی

کتنے آباد ہیں نفرت کدۂ دیر و حرم
ہم پیالہ جو کبھی تھے یہ ہیں میخوار وہی

آج کس سطح پہ ہے ذہنیتِ عام افسوس
روکتا ہے جو خطاؤں سے خطاوار وہی

جو تشدّد کا کرے ذکر وہی قوم پرست
نام بھولنے سے جو لے امن کا غدار وہی

فرقہ وارانہ حکیموں کی دوا سے ہوشیار
بھیس میں آج معالج کے ہے بیمار وہی

وطن! اے میرے وطن! یوں مجھے مایوس نہ کر
شبھ گھڑی آئی ہے تیری اسے منحوس نہ کر

اکتوبر 1947

مشاعرہ

قدیم اسکول

حضرت پختہ:

سو شعر کی بھی غزل میں پڑھ سکتا ہوں
کوئی ہو زمین میں شعر گڑھ سکتا ہوں
اُستاد ہوں میں ہر ایک مضمونِ قدیم
سانچہ پہ نئی طرح کے مڑھ سکتا ہوں

حضرت مشّاق:

مضمون و زباں ہیں جیسے روح و قالب
ہوں اہلِ سخن سے داد کا میں طالب
کس رُخ سے لگا دیا ہے مصرعہ واللہ
جنت میں تڑپ رہی ہے روحِ غالب

حضرت زُعم:

ہاں عظمتِ ذاتی کا مجھے پاس تو ہے
اوروں کو نہ ہو خود مجھے احساس تو ہے
کرتا ہوں میں اپنے منہ سے اپنی تعریف
کچھ اور نہیں سر میں پہ آماس تو ہے

حضرت زباں:

الفاظ کی اس سلکِ رواں کو دیکھو
ترشے ہوئے ہیروں کی دکاں کو دیکھو
ڈھونڈو نہ مرے شعر میں مضمون و پیام
کوثر سے دُھلی میری زباں کو دیکھو

حضرت صوفی:

تو مجھ میں، مَیں تجھ میں، خُم میں مے، مے میں خُم
میں رازِ حیات کے معمے میں ہوں گم
ہر شعر مرا ہے جیسے اک دو منھا سانپ
دُم اس کی منھ ہے اور منھ اس کا دُم

حضرت فراری:

جام و مے و نغمہ و گل و ابر و بہار — ماہے بہ فرازِ چرخ و ماہے بہ کنار
میرے شعروں میں میرے خوابوں بہشت — دُنیا کے جہنم سے مجھے کیا سروکار

حضرت مبتذل:

بازارِ ہوس پہ سکّہ رانی میری — گلیوں میں کٹی ہے نوجوانی میری
کوٹھوں پہ لگی ہیں میرے دل کی مُہریں — میرے اشعار زندگانی میری

جدید اسکول

حضرت نغمہ:

نظروں کو مری اُترتے چڑھتے دیکھو — آواز کی لے کو گھٹتے بڑھتے دیکھو
پڑھنے کے لیے نہیں ہیں میرے اشعار — مجھ کو محفل میں شعر پڑھتے دیکھو

حضرت رُومانی:

اک حسن کے سانچہ میں جوانی ڈھالی — پھر عشق کے خوابوں کی نچوڑی لالی
کوئی مرے شعروں میں نہ پہچان سکا — میری دوشیزہ کی وہ صورت کالی

حضرت نوخیز:

رنگیں مری اچکن ہے تو بانکی ٹوپی — میری نظروں سے میرے شعروں کو پی
اک چشمۂ صہبا ہوں مجسم مستی — صورت میں کنہیا ہوں صفت میں گوپی

حضرت سارق:

وقت اور محل دیکھ کے بڑھتا ہوں میں	بے خوف پرائے شعر پڑھتا ہوں میں
گرتا ہوں خواص کی نگاہوں سے تو کیا	نظروں میں عوام کی تو چڑھتا ہوں میں

حضرت داخلی:

میری ہی حیات ہے مرا عرصۂ جنگ	میرے غم و عیش میری دنیائے تنگ
دل میں اپنے چبھو چبھو کر	میرے ہی لہو سے ہے مرے شعر میں رنگ

حضرت مزدور:

کچھ حسنِ تصوّر کی ضیا میں نے دی	کچھ رنگِ عبارت سے جلا میں نے دی
پھر اپنے ترنّم کا سہارا دے کر	مزدور کو قدسیوں میں جا میں نے دی

حضرت تاجر:

جیسا گاتا ہوں راگ ویسا سرگم	نبضِ محفل پہ ہاتھ میرا ہر دم
میں تاجرِ شعر ہوں اداکار سخن	سب سے اعلیٰ مرا "چنا جھور گرم"

ترقی پسند اسکول

حضرت آزاد نظم:

آزاد ہے نظم میری مانندِ خیال	لے دل کی کہاں، کہاں عروضی سم تال
جی میں ہے اڑوں میں مثلِ طیارہ مگر	لڑھیا سے مری ادب کی راہیں پامال

حضرت خام:

مُبہم ہو زباں خلوصِ احساس تو ہے
ترشا نہ سہی نہ ہو پہ الماس تو ہے
آزاد تو فکر ہے نہ ہو حسنِ بیاں
گو شعر نہیں شعر کی بوباس تو ہے

حضرت افادی:

یہ حسن و محبت اک فسانہ ہے فقط
دنیا کی حقیقت آب و دانہ ہے فقط
ہوگا یہ آبشار سامانِ نشاط
میرے لیے بجلی کا خزانہ ہے فقط

حضرت عریاں:

سر کے ہوئے آنچلوں سے پھٹتی ہوئی پو
بھیگی ہوئی ساریوں سے اُٹھتی ہوئی لو
جلتی ہوئی سانسوں کی مہکتی سی پھوار
ہر شعر مرا طِلا کا اک نسخۂ نو

حضرت نعرہ خواں:

ہے خون و عرق کی میرے شعروں میں مہک
جلوہ تو ہے کم سوا ہے شعلہ کی لپک
میرے نغموں کی زیرِ لب دھیمی نوا
سننے نہیں دیتی مرے پیروں کی دھمک

حضرت انقلابی:

اک ابرِ سیاہ ہے سواری میری
برق و طوفاں پہ شہر یاری میری
اک قطرۂ آب بھی نہیں مجھ میں تو کیا
ہے کشتِ ادب پہ ژالہ باری میری

حضرت اشتراکی:

نکلی ہر پھانس سُرخ جھنڈے کے تلے
امرت ہر سانس سُرخ جھنڈے کے تلے
پھر دشتِ ادب کو کر رہا ہوں گلزار
دے دے کے میں پانس سُرخ جھنڈے کے تلے

شاعرِ حقیقی

حضرت شاعر:

عمرِ گزراں کا میرے ہونٹوں پہ سرود　　میرے اشعار ہیں کہ بہتی ہوئی رود
طفلِ انساں کا دوست، ہمدرد، مشیر　　راحت میں نوید، غم میں تسکین کی گود

سامعین:

ہر شعر پہ اپنے سر کو دُھننے والے　　ہر خار کو گل سمجھ کے چُننے والے
خوش ذوقیِ اہلِ بزم ماشاء اللہ　　پڑھنے والے وہ اور یہ سُننے والے

نومبر 1947

1948

غزلیات

(1)

ترا لطف آتشِ شوق کو حدِ زندگی سے بڑھا نہ دے
کہیں بجھ نہ جائے چراغ ہی اسے دیکھ اتنی ہوا نہ دے
ترا غم ہے دولتِ دل تری، اسے آنسوؤں میں لٹا نہ دے
وہی آہ نقدِ حیات ہے جسے لب پہ لا کے گنوا نہ دے
مری زندگی کی حقیقتوں کو نہ پوچھ اور میں کیا کہوں
مرا دوست آج وہی ہے جو مجھے زندگی کی دعا نہ دے
یہی زندگی نے سبق دیا کہ کبھی فریبِ کرم نہ کھا
یہ امید رکھ نہ کسی سے تو کہ مٹا سکے تو مٹا نہ دے
مجھے غم ہی دے خوشی نہ کرم سہی تو ستم سہی
مگر اتنا کم بھی کرم نہ ہو کہ ترا ستم بھی مزا نہ دے
مرے دل کی خود یہ مجال تھی کہ وہ شامِ غم کو سحر کرے
تری یاد آ کے گھڑی گھڑی اگر آنسوؤں کو ہنسا نہ دے
ترے دل پہ حق ہے جہاں کا بھی یہ فرارِ عشق روا نہیں
غمِ دوست خوب ہے جب تلک غمِ زندگی کو بھلا نہ دے
وہ خدائے حسن ہی کیوں نہ ہو کوئی شے ہے غیرتِ عشق بھی
جو تری صدا پہ کھلے نہ در وہ کھلے بھی جب تو صدا نہ دے
مرے دشمنوں کے لبوں پہ تھی جو ہنسی، وہ ملا اب اُڑ چلی
انھیں ڈر ہے اب یہی غم مرا مری زندگی کو بنا نہ دے

اگست 1948

(2)

زہرِ غم ہنس ہنس کے پینا آگیا
ہاں مگر دانتوں پسینا آگیا

کینہ جو کا وار ہے پھر کامیاب
تیرے دل میں بھی جو کینا آگیا

دے رہا ہے آنکھ میں آنسو بہار
جیسے خاتم پر نگینا آگیا

مجھ سے غفلت اور سب سے ہنس کے بات
دل ربائی کا قرینا آگیا

ہونے پائے تھیں ابھی آنکھیں نہ خشک
اک نئے غم کا مہینا آگیا

بحرِ غم بھی مرحبا اے مشقِ چشم
قطرہ قطرہ کر کے پینا آگیا

پھر چلی بادِ موافق بھی تو کیا
جب کنارے پر سفینا آگیا

تھم ذرا اے خشت باریِ خرد
زد پہ دل کا آبگینا آگیا

وار کیوں تیار ہے کیا پھر کوئی
بزمِ نابینا میں بینا آگیا

غم پہ غم اور قہقہوں پر قہقہے
آگیا ملاؔ کو جینا آگیا

اکتوبر 1948

(3)

مرے دل میں ہے تو وہ روشنی کہ جو ظلمتوں کو سنوار دے
مگر اتنی فرصتِ تاب و تب بھی مذاقِ لیل و نہار دے
کسی برگِ زرد کا ذکر کیا مری آنکھ میں ہے وہ جوشِ گل
مرے دشمنوں کی خزاں کو بھی جو نویدِ ابرِ بہار دے
سپہِ الم کے ہیں مورچے ابھی ہر محاذِ حیات پر
مجھے ہے یقینِ خوشی مگر، مجھے زک پہ زک یہ ہزار دے
انھیں ظلمتوں میں کہیں نہاں ہیں نشاطِ صبح کی چوٹیاں
کوئی غم کی وادیٔ شام میں مرا نام لے کے پکار دے
کسی موجِ یاس میں ڈوبنا نہ تو یہ جنوں ہے نہ یہ خرد
نہ یہ کیفِ جہدِ حیات دے نہ سکونِ مرگ کنار دے
یہ خزاں بدوشِ سموم تو ہے گلوں کے ظرف کا امتحاں
وہی گل ہے گل جو فسردہ ہو تو فسردگی بھی بہار دے
کسی آسماں پہ ارم لیے کوئی منتظر ہے تو مجھ کو کیا
وہ مرا خدا ہے جو خُلد کو اسی خاکداں پہ اُتار دے
ابھی غم نصیبِ حیات ہے ترے بس میں پھر بھی یہ بات ہے
اسے اپنے غم میں گزار دے کہ جہاں کے غم میں گزار دے
کسے عذر اس میں کہ ہوش پر ہو بنا رواقِ حیات کی
اسے دے ستونِ خرد مگر اسے دل کے نقش و نگار دے
یہ سحابِ غارت و قتل و خوں یہ ہوائے نفرت و خوف و شک
یہی فصلِ گل ہے؟ نہیں نہیں! مجھے لا کے میری بہار دے
ترے آنسوؤں کی تجلیاں کہیں ملا یونہیں نہوں فنا
انھیں عرشِ چشم سے توڑ کر کسی آسماں پہ اُتار دے

اکتوبر 1948

دوسرا رُخ

سیاہیوں کی تہوں میں شعاعِ آب بھی دیکھ — سحاب دیکھنے والے پسِ سحاب بھی دیکھ
فضا کا تیرگیِ نیم شب سے کر نہ قیاس — اُفق کی گود میں ننھا سا آفتاب بھی دیکھ
غروبِ مہر پہ رو رو کے کر نہ آنکھیں سُرخ — طلوعِ ذرّۂ خاکی کی آب و تاب بھی دیکھ
جمالِ سرو سے سینکے گا کب تلک آنکھیں — بہارِ سبزۂ پامال کا شباب بھی دیکھ
حقوقِ باغ پہ کب تک اجارۂ برگ — نسیمِ صبح سے کانٹوں کو فیضیاب بھی دیکھ
شکستِ انجمنِ چرخ کا نہ کر ماتم — اُگل رہی ہے جو مٹی وہ آفتاب بھی دیکھ
اسیرِ پنجۂ شاہیں میں کب تلک کنجشک — شکستِ بال و پرو بازوئے عقاب بھی دیکھ
سُنا کلامِ خدا یانِ دو جہاں تو بہت — اب اس پہ بندوں کی اصلاح کامیاب بھی دیکھ
فسردہ ہوتے ہوئے گل جو ہیں نظر میں تری — تو شاخِ خار پہ کھلتے ہوئے گلاب بھی دیکھ
نہ دیکھ صرف زر و سیم ہی کا چہرۂ فق — جبینِ مس پہ دمکتی ہے جو وہ تاب بھی دیکھ
فسانہ پڑھ چکا شاہوں کے اب اُلٹ کے ورق — حدیثِ دہر میں ابنِ بشر کا باب بھی دیکھ
قسم ہے ضربتِ شمشیرِ خسروی کی تجھے — کہ آج تیشۂ مزدور کا جواب بھی دیکھ
اک انہدام تو ظاہر ہے ہر تعمیر میں — جو دیدہ ور ہے تو تعمیرِ انقلاب بھی دیکھ

حقیقتوں سے ملانا نظر تو کچھ بھی نہیں
ملا کے آنکھ مزا جب ہے کوئی خواب بھی دیکھ

فروری 1948

مہاتما گاندھی کا قتل

مشرق کا دیا گُل ہوتا ہے مغرب پہ سیاہی چھاتی ہے
ہر دل سُن سا ہو جاتا ہے ہر سانس کی لَو تھرّاتی ہے
اُتر دکھن، پورب پچھم، ہر سمت سے اک چیخ آتی ہے
نوعِ انساں شانوں پہ لیے گاندھی کی ارتھی جاتی ہے
آکاش کے تارے بجھتے ہیں، دھرتی سے دھواں سا اُٹھتا ہے
دنیا کو یہ لگتا ہے جیسے سر سے کوئی سایا اُٹھتا ہے
کچھ دیر کو نبضِ عالم بھی چلتے چلتے رُک جاتی ہے
ہر ملک کا پرچم گرتا ہے ہر قوم کو ہچکی آتی ہے
تہذیب جہاں تھرّاتی ہے، تاریخِ بشر شرماتی ہے
موت اپنے کیے پر خود جیسے دل ہی دل میں پچھتاتی ہے
انساں وہ اُٹھا جس کا ثانی صدیوں میں بھی دنیا جن نہ سکی
مورت وہ مٹی نقاش سے بھی جو بن کے دوبارہ بن نہ سکی
دیکھا نہیں جاتا آنکھوں سے یہ منظرِ عبرت ناک وطن
پھولوں کے لہو کے پیاسے ہیں اپنے ہی خس و خاشاکِ وطن
ہاتھوں سے بجھایا خود اپنے وہ شعلۂ روحِ پاکِ وطن
داغ اس سے سیہ تر کوئی نہیں دامن پہ ترے اے خاکِ وطن
پیغامِ اجل لائی اپنے اُس سب سے بڑے محسن کے لیے
اے لے طلوعِ آزادی! آزاد ہوئے اس دن کے لیے

جب ناخنِ حکمت ہی ٹوٹے دشوار کو آساں کون کرے
جب خشک ہوا ابرِ باراں ہی شاخوں کو گل افشاں کون کرے
جب شعلۂ مینا سرد ہو خود جاموں کو فروزاں کون کرے
جب سورج ہی گل ہو جائے تاروں میں چراغاں کون کرے
ناشاد وطن! افسوس تری قسمت کا ستارہ ٹوٹ گیا
انگلی کو پکڑ کر چلتے تھے جس کی وہی رہبر چھوٹ گیا

اس حسن سے کچھ ہستی میں تری اضداد ہوئے تھے آ کے بہم
اک خواب و حقیقت کا سنگم مٹی پہ قدم نظروں میں ارم
اک جسمِ نحیف و زار مگر اک عزمِ جوان و مستحکم
چشمِ بینا، معصوم کا دل، خورشید نفس، ذوقِ شبنم
وہ عجز غرورِ سلطاں بھی جس کے آگے جھک جاتا تھا
وہ موم کہ جس سے ٹکرا کر لوہے کو پسینہ آتا تھا

سینہ میں جو دے کانٹوں کو بھی جا اُس گل کی لطافت کیا کہیے
جو زہر پیے امرت کر کے اُس لب کی حلاوت کیا کہیے
جس سانس سے دنیا جاں پائے اس سانس کی نکہت کیا کہیے
جس موت پہ ہستی ناز کرے اس موت کی عظمت کیا کہیے
یہ موت نہ تھی قدرت نے ترے سر پر رکھا اک تاجِ حیات
تھی زیست تری معراجِ وفا اور موت تری معراجِ حیات

یکساں نزدیک و دور پہ تھا بارانِ فیضِ عام ترا
ہر دشت و چمن، ہر کوہ و دمن میں گونجا ہے پیغام ترا
ہر خشک و ترِ ہستی پہ رقم ہے خطِ جلی میں نام ترا
ہر ذرّہ میں تیرا معبد، ہر قطرہ تیرتھ دھام ترا
اس لطف و کرم کے آئیں میں مر کر بھی نہ کچھ ترمیم ہوئی
اس ملک کے کونے کونے میں مٹی بھی تری تقسیم ہوئی

تاریخ میں قوموں کی اُبھرے کیسے کیسے ممتاز بشر
کچھ ملکِ زمیں کے تخت نشیں کچھ تختِ فلک کے تاج بسر
اپنوں کے لیے جام وصہبا اوروں کے لیے شمشیر وتبر
نردِ انساں بٹتی ہی رہی دنیا کی بساطِ طاقت پر
مخلوقِ خدا کی بن کے سپر میداں میں دلاور ایک تو ہی
ایماں کے پیمبر آئے بہت، انساں کا پیمبر ایک تو ہی

بازوئے خرد اُڑ اُڑ کے تھکے تیری رفعت تک جا نہ سکے
ذہنوں کی تجلّی کام آئی خاکے بھی ترے ہاتھ آ نہ سکے
الفاظ و معانی ختم ہوئے عنواں بھی ترا اپنا نہ سکے
نظروں کے کنول جل جل کے بجھے پرچھائیں بھی تیری پا نہ سکے
ہر علم و یقیں سے بالا تر تو ہے وہ سپہرِ تابندہ
صوفی کی جہاں نیچی ہے نظر، شاعر کا تصور شرمندہ

پستیِ سیاست کو تو نے اپنے قامت سے رفعت دی
ایماں کی تنگ خیالی کو انساں کے غم کی وسعت دی
ہر سانس سے درسِ امن دیا، ہر جبر پہ دادِ اُلفت دی
قاتل کو بھی گو لب ہل نہ سکے آنکھوں سے دُعائے رحمت دی
'ہنسا' کو 'اہنسا' کا اپنی پیغام سنانے آیا تھا
نفرت کی ماری دنیا میں اک "پریم سندیسہ" لایا تھا

اس "پریم سندیسے" کو تیرے سینوں کی امانت بننا ہے
سینوں سے کدورت دھونے کو اک موجِ ندامت بننا ہے
اس موج کو بڑھتے بڑھتے پھر سیلابِ محبت بننا ہے
اس سیلِ رواں کے دھارے کو اس ملک کی قسمت بننا ہے
جب تک نہ بہے گا یہ دھارا شاداب نہوگا باغ ترا
اے خاکِ وطن دامن سے ترے دُھلنے کا نہیں یہ داغ ترا

جاتے جاتے بھی تو ہم کو اک زِیست کا عنواں دے کے گیا
بجھتی ہوئی شمعِ محفل کو پھر شعلۂ رقصاں دے کے گیا
بھٹکے ہوئے گامِ انساں کو پھر جادۂ انساں دے کے گیا
ہر ساحلِ ظلمت کو اپنا مینارِ درخشاں دے کے گیا
تو چُپ ہے لیکن صدیوں تک گونجے گی صدائے ساز تری
دنیا کو اندھیری راتوں میں ڈھارس دے گی آواز تری

مارچ 1948

میری شاعری

کچھ اپنی باتیں کچھ ذکرِ دوراں
کچھ اشک و شبنم کچھ برق و طوفاں
میرے خد و خال شعروں میں میرے
گاہے نہفتہ گاہے نمایاں
بکھری پڑی ہے ان وادیوں میں
میری حدیثِ عمرِ گریزاں
میری منازل اور میرے جادے
میرے چمن اور میرے بیاباں
میری خزاں اور میری بہاریں
میری شبِ غم میرے چراغاں
کچھ خواب ہنستے اور جگمگاتے
کچھ زندگی کے تاریک عنواں
آلودہ خاک میری جبیں ہے
آنکھوں میں لیکن تارے درخشاں
مجھ کو خطا کار کہہ لے زمانہ
میری خطائیں ہیں میرا ایماں
اوروں سے پوچھو میں کیا بتاؤں
ہوں دودِ محفل یا شمعِ سوزاں
یوں دل کی دولت ملا نے بانٹی
کچھ نذرِ خوباں کچھ نذرِ انساں

دسمبر 1948

1949

غزلیات

(1)

نگاہ و دل کا افسانہ قریب اختتام آیا
ہمیں اب اس سے کیا آئی سحر یا وقتِ شام آیا
زبانِ عشق پر اک چیخ بن کر تیرا نام آیا
خرد کی منزلیں طے ہو چکیں دل کا مقام آیا
اُٹھانا ہے جو پتھر رکھ کے سینہ پر وہ گام آیا
محبت میں تری ترکِ محبت کا مقام آیا
اسے آنسو نہ کہہ اک یادِ ایّامِ گزشتہ ہے
مری عمرِ رواں کو عمرِ رفتہ کا سلام آیا
ذرا لو اور دل کی تیز کر سیلا سایہ شعلہ
نہ روشن کر سکا گھر کو نہ محفل ہی کے کام آیا
نظامِ میکدہ ساقی بدلنے کی ضرورت ہے
ہزاروں ہیں صفیں جن میں نہ مے آئی نہ جام آیا
ابھی تک صیدِ یزداں و صنم اولادِ آدم ہے
بشر انساں نہیں رہتا جہاں ایماں کا نام آیا
بہار آتے ہی خونریزی ہوئی وہ صحنِ گلشن میں
خجل کانٹے تھے یوں پھولوں کو جوشِ انتقام آیا
کھلائے آبلہ پاؤں کو بیٹھے تھے چمن والے
گرجتی آندھیاں آئیں کہ صحرا کا سلام آیا

سحر کی حور کے کیا کیا نے دیکھے خواب دنیا نے
مگر تعبیر جب ڈھونڈی وہی عفریتِ شام آیا
کبھی شاید اسی سے رنگ فردوسِ بشر پائے
ابھی تک تو لہو انساں کا شیطاں ہی کے کام آیا
مکمل تبصرہ کرتا ہوا ایّامِ رفتہ پر
نگاہِ بے سخن میں ایک اشکِ بے کلام آیا
توانا کو بہانہ چاہیے شاید تشدّد کا
پھر اک مجبور پر شوریدگی کا اتہام آیا
نہ جانے کتنی شمعیں گل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا
برہمن آبِ گنگا شیخ کوثر لے اُڑا اس سے
ترے ہونٹوں کو جب چھوتا ہوا ملا کا جام آیا
جنوری 1949

(2)

غموں کا بھی آتا ہے اکثر زمانا
خوشی کا بجاتا ہوا شادیانا
نہیں کرنے والے ترا مسکرانا
محبت کو ہے اور اک تازیانا
اسی میں کدورت، اسی میں محبت
یہی دل قفس ہے، یہی آشیانا
تکلف، تکلّم، تبسّم، توجّہ
مزے پر اب آنے لگا ہے فسانا

مگر شورِ ہستی میں گم ہو گیا وہ
مرے دل نے چھیڑا تو تھا اک ترانا
اُن آنکھوں نے دل کو بہت گد گدایا
ہمیں بھولے بیٹھے ہیں کچھ مسکرانا
متاعِ جہاں کی یہ تقسیم کب تک
اِسے خوشہ خوشہ اُسے دانا دانا
ہر اک منظرِ زیست بے کیف دھندلا
یہ کس موڑ پر آگیا ہے زمانا
محبت دھڑکتے دلوں کی زباں ہے
نگاہیں ملیں اور مرتب فسانا
بساطِ جہاں سے مٹے گا بھی آخر
کبھی دھوپ سایے کا یہ چار خانا
ہر اساں ہے آج اپنی طاقت سے دنیا
کہیں بن نہ جائے خود اپنا نشانا
مرا کیشِ اُلفت بس اتنا ہے ملا
کرم یاد رکھنا، ستم بھول جانا
جنوری 1949

(3)

فقط اپنی صداہی کو نہ آوازِ جہاں سمجھو
حدودِ آشیاں ہی کو نہ صحنِ گلستاں سمجھو
تمھارے ذوق پر یہ منحصر ہے دیکھنے والو
اسے آنسو سمجھ لو یا اسی کو داستاں سمجھو

خروشِ بزم میں بھی سازِ دل چھیڑے ہی جاتا ہوں
اکیلا ہوں ابھی لیکن مجھی کو کارواں سمجھو

محبت کرنے والو دیکھنا دھوکا نہ کھا جانا
توجہ کو تغافل سے بھی بڑھ کر امتحاں سمجھو

وفا کیشی بغاوت بن نہ جائے کب تلک آخر
قفس کو دل پہ پتھر رکھ کے اپنا آشیاں سمجھو

مری نظروں میں جو کچھ ہے ارے اس کو تو سچ مانو
مری باتوں کو تم چاہے مرا حسنِ بیاں سمجھو

فلک والو فلک پر رہ کے سمجھے ہو نہ سمجھو گے
زمیں کا درد کیا ہے آ کے زیرِ آسماں سمجھو

یہ دردِ جاوداں والا تصوّر عشق کا کب تک
غمِ ہستی میں اب اس کو نشاطِ ناگہاں سمجھو

کہیں تیغ و قلم سے بھی مٹے ہیں تفرقے دل کے
مٹاتا ہیں تو پہلے رکھ کے ساغر درمیاں سمجھو

شعور و فکر کی ہے تربیت اور پختگی اس سے
الگ چلتے رہو لیکن مذاقِ کارواں سمجھو

سبب میری خموشی کا مجھی سے پوچھتے کیا ہو
خموشی کیا نہیں کہتی محبت کی زباں سمجھو

لبِ مادر نے ملا لوریاں جس میں سنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

فروری 1949

(4)

جو سطحِ خاک سے اونچی نگاہ کر نہ سکے
وہ تیرہ بخت ستاروں میں راہ کر نہ سکے

دلوں میں خلق کے قول اُن کے راہ کر نہ سکے
جو اپنی زیست کو اپنا گواہ کر نہ سکے

انھیں خوشی کا بھی عرفاں نصیب ہو نہ سکا
جو زندگی کسی غم میں تباہ کر نہ سکے

نبردِ عشق کے آداب میں ہے شرط عجیب
کہ اس میں چوٹ جو کھائے وہ آہ کر نہ سکے

جمالِ حُسن میں تھا اک جلالِ عفت بھی
گناہگار خیالِ گناہ کر نہ سکے

کمی ہوئی تری اُلفت میں اتنی ہم سے ضرور
کہ آڑ لیکے تبسّم کی آہ کر نہ سکے

وہی نہ اشک کے قطروں میں ڈھل گئی ہو کہیں
جس التجا کو شریکِ نگاہ کر نہ سکے

نہیں تمیزِ گل و خار، نسل و رنگ پہ کچھ
وہ خار ہے جو چمن سے نباہ کر نہ سکے

خبر نہیں کہ ہے کیا وجہِ پارسائی شیخ
گناہ ہو نہ سکا یا گناہ کر نہ سکے

وہ شعر شعر نہیں اور کچھ بھی ہو ملاؔ
دلوں میں تیر کی صورت جو راہ کر نہ سکے

مارچ 1949

(5)

اب بے نیاز ہیں ترے جور و جفا سے ہم
آگے نکل گئے ہیں مقامِ فنا سے ہم
آفت سہی نہ کون؟ بچے کس بلا سے ہم؟
اب تک تو جی رہے ہیں تمھاری دعا سے ہم
اب وہ بھی اجنبی سے ہیں نا آشنا سے ہم
کس انتہا پہ آئے ہیں کس ابتدا سے ہم
اپنے رہِ ادب میں ہیں خود رہنما سے ہم
بچ کر گزر رہے ہیں ہر اک نقشِ پا سے ہم
اتنا مہیب لہجہ انساں ہے ان دنوں
سہمے سے جا رہے ہیں خود اپنی صدا سے ہم
ہاں تم نے اعتراف محبت نہیں کیا
نیچی کیے ہوئے ہیں نظر کیا حیا سے ہم؟
پھر بھی تری نقاب کو چلمن بنا دیا
کرتے اب اور کیا نگہہِ نار سا سے ہم
پیشِ نظر ہے ایک گروہِ شکستہ پا
پوچھیں گے راہ اب نہ کسی رہنما سے ہم
ہنس لو جنونِ خاک پہ تم آج اہلِ چرخ
اک دن خدائی لیکے رہیں گے خدا سے ہم
ہرگام پر صدائے جرس ہو رہی ہے کم
شاید بھٹک چلے ہیں رہِ مدّعا سے ہم
ملا یہ اپنا مسلکِ فن ہے کہ رنگِ فکر
کچھ دیں فضائے دہر کو کچھ لیں فضا سے ہم

مارچ 1949

سروجنی نائڈو

چمن کا موجِ شمیمِ چمن سلام تجھے
گلوں کا روحِ گل و یاسمن سلام تجھے

(1)

ترے سخن کے سنوارے ہوئے دماغوں کا
تری نظر کے جلائے ہوئے چراغوں کا
تری ہی یاد سے روشن جگر کے داغوں کا
فروغِ گمشدہ انجمن سلام تجھے

(2)

اُڑا کے لے گئے تارے ترے حسیں نغمے
ترے گدازِ جگر کے وہ آتشیں نغمے
سنے گی ایسے کہاں اب یہ سر زمیں نغمے
سرورِ رفتہ سازِ وطن سلام تجھے

(3)

نظر میں مرہم زخمِ جگر چھپائے ہوئے
سیاہیوں کو تبسم سے جگمگائے ہوئے
کدورتوں میں محبت کی لے بڑھائے ہوئے
دیارِ تلخ کی شیریں دہن سلام تجھے

(4)

خزاں کی فصل میں بھی نکہتِ بہار رہی
وطن کے دورِ جنوں میں بھی ہوشیار رہی
خروشِ بزم میں بھی تو ترانہ بار رہی
چمنوں میں نسیمِ عدن سلام تجھے

(5)

نگاہ و دل تھے محبت سے سر بسر معمور
طہارتِ نفس آلائشوں سے کوسوں دور
جو نام کو بھی نہیں شعلہ خو وہ خالص نور
طلوعِ صبح کی سیمیں کرن سلام تجھے

(6)

جمالِ شمع بھی پروانہ کا گداز بھی تھی
ادائے ناز میں کیفیتِ نیاز بھی تھی
ادب کی جان تھی خود اور ادب نواز بھی تھی
سخن طراز عروسِ سخن سلام تجھے

(7)

جہاں ملی ہے حدِ کعبہ و صنم خانہ
جہاں پہ ختم ہے ہر تفرقہ کا افسانہ
وہاں تھی تو مترنم دلوں کی سلطانہ
زبانِ شیخ و لبِ برہمن سلام تجھے

(8)

خیال و فکر کی دنیا تری اسیرِ کمند
صفِ حیات میں انسانیت کا قدِ بلند
نباتِ لب میں سموئے سی شرق و غرب کے قند
شکر فروشِ جدید و کہن سلام تجھے

(9)

غرورِ قومیت و دیں کے کو ہساروں میں
نفاقِ نسل و تمدّن کے ریگزاروں میں
الگ الگ سے حیاتِ جہاں کے دھاروں میں
ترانۂ دلِ گنگ و جمن سلام تجھے

(10)

نئے پیامِ وطن کو نئے رسول ملے
نئی نظر، نئے مقصد نئے اصول ملے
ہر ایک کیاری سے گلشن کو اپنے پھول ملے
وطن کے تاج کے "لعلِ دکن" سلام تجھے
چمن کا موجِ شمیم چمن سلام تجھے
گلوں کا روحِ گل و یاسمن سلام تجھے

اپریل 1949

ارتقا

اہلِ دل بڑھتے رہے اور تیر چلتے ہی رہے
طور جلتے ہی رہے موسیٰ نکلتے ہی رہے
آہنی پنجہ ستم کا منھ دباتا ہی رہا
سینۂ انساں میں کچھ نغمے مچلتے ہی رہے
باغ پر ٹوٹا ہی کیں گھِر گھِر کے کالی آندھیاں
چھپکے پھولوں میں دیے شبنم کے جلتے ہی رہے
زندگی دیتی رہی گو ہر نفس پیغامِ مرگ
پھر بھی کچھ شوریدہ سر خوابوں پہ پلتے ہی رہے
اوپر اوپر سِل پہ سِل رکھتے گئے احکامِ جبر
تہہ بہ تہہ سوتے بغاوت کے اُبلتے ہی رہے
دیر تک رہتی نہیں اک جام میں صہبائے زیست
اس میں وہ تندی ہے پیمانے پگھلتے ہی رہے
شاخِ گل کے زخم بھرتا ہی رہا جوشِ نمو
اور گلچیں توڑ کر کلیاں مسلتے ہی رہے
لاکھ چاہا اہل طاقت نے کہ جم جائیں قدم
زندگی کے ڈھال پر لیکن پھسلتے ہی رہے

تیرگی بڑھ بڑھ کے تاروں کو بجھاتی ہی رہی
تیرگی کو چیر کر تارے نکلتے ہی رہے
حرفِ آخر بن کے اُترا ہر نیا آئینِ دہر
پھر بھی بابِ زیست کے عنواں بدلتے ہی رہے
ارتقا کی راہ میں رکنا ہی ہے انساں کی موت
ہیں وہی زندہ جو اس رستے پہ چلتے ہی رہے
مل سکی جن کو نہ اس دنیا میں جا ملا وہ خواب
اشک بن کر دیدہ شاعر میں ڈھلتے ہی رہے

مئی 1949

جادۂ امن

لیے نویدِ امن و مژدۂ اماں بڑھے چلو
علَم لیے شہیدِ قوم کا نشاں بڑھے چلو

جو خستہ پا وطن کو پھر خرامِ امن دے گیا
تھکی فسردہ لب صفوں کو جامِ امن دے گیا
فسادِ کائنات کو نظامِ امن دے گیا
ہر اک محاذِ جنگ کو سلامِ امن دے گیا
اُسی کے نقشِ پا پہ اہلِ کارواں بڑھے چلو
علَم لیے ــــــــــــــــــــــــــــــــ

ابھی تو تیلیوں سے ہے قفس کی سازِ آشیاں
ابھی تو اس جہاں پہ ہے خدائے جبر حکم راں
بشر کے واسطے نہیں کوئی بھی گوشۂ اماں
ہر اک طرف ہیں ظلمتیں، ہر ایک سمت ہے دھواں
دھویں میں لیکے اُس کی شمعِ ضوفشاں بڑھے چلو
علَم لیے ــــــــــــــــــــــــــــــــ

لہو سے ہیں حدیثِ زندگی کی سُرخیاں ابھی
بٹا ہوا ہے جنگجو صفوں میں یہ جہاں ابھی
زمیں کی فوج ہے ابھی سپاہِ آسماں ابھی
حسیں اُفقِ حیات کا نظر سے ہے نہاں ابھی

کہیں تو خاک سے ملے گا آسماں بڑھے چلو
علم کیے ______________

بدل بدل کے رنگ اُبھر رہا ہے فتنۂ جہاں
فن و ادب کو بھی پنہائی جا رہی ہیں وردیاں
گرج رہی ہیں بدلیاں، کڑک رہی ہیں بجلیاں
اِدھر سیاہ آندھیاں اُدھر ہیں سُرخ آندھیاں
ان آندھیوں کے درمیاں ہی درمیاں بڑھے چلو
علم کیے ______________

بشر ابھی اسیرِ دامِ دین و نسل و رنگ ہے
ابھی تو حل ہر اک نزاعِ زندگی کا جنگ ہے
قدِ حیات پر ابھی قبائے امن تنگ ہے
ابھی صدائے دوستی پہ ہر طرف سے سنگ ہے
ابھی خصومتیں دلوں میں ہیں جواں بڑھے چلو
علم کیے ______________

ابھی مذاقِ جبر کی وہی ہیں چیرہ دستیاں
وہی غرض کے طاق ہیں وہی ہوس پرستیاں
وہی نشہ غرور کا وہی سیاہ مستیاں
ابھی تو گرد و پیش و پس ہیں پستیاں ہی پستیاں
نہاں انھیں میں نور کی ہیں چوٹیاں بڑھے چلو
علم کیے ______________

ابھی ابھی تو تم کھڑے ہوئے ہو اپنے پیر پر
ابھی تو راہ سخت ہے ابھی ہے دور کا سفر

نگاہِ پاک ہیں و ہمتِ جواں رہی اگر
تمھیں بنو گے میرِ کاروانِ ایشیا۔ مگر
ابھی تو گردِ کارواں کا ہے گماں بڑھے چلو
علَم لیے ________________

مفادِ عام پر ہر ایک گام تولتے ہوئے
شبِ حیات میں سحر کا رنگ گھولتے ہوئے
جھگّیوں پہ خُلد کے دریچے کھولتے ہوئے
بشر کے آنسوؤں کو برگِ گل سے رولتے ہوئے
مسرّتوں سے پاٹتے غمِ جہاں بڑھے چلو
علَم لیے ________________

جہانِ مردہ میں پھر ایک روح ڈالتے چلو
سموم کو نسیمِ جاں فزا میں ڈھالتے چلو
دلوں کے زنگ خوردہ آئینے اُجالتے چلو
ہر ایک نقشِ پا سے اک چراغ بالتے چلو
رہِ حیات کو بنا کے کہکشاں بڑھے چلو
علَم لیے ________________

فنا کے ریگزار میں بھی جوئے زندگی لیے
خروشِ عقل میں نوائے دل کی بانسری لیے
شبِ بلا کشاں میں چشمِ تر کی چاندنی لیے
دیارِ سنگ و خشت میں بھی گُل کی پنکھڑی لیے
غمِ جہاں میں چھیڑتے سرودِ جاں بڑھے چلو
علَم لیے ________________

وہ دیکھو دور سامنے ہیں زرنگار وادیاں
اک آخری سے موڑ پر ہے زندگی کا کارواں
نگاہِ کائنات میں ہیں پھر نئی تجلّیاں
تبسّمِ افق میں ہیں خموش کچھ کہانیاں
اِنھیں خموشیوں کو سونپتے زباں بڑھے چلو
علم کیے ________________
لیے نویدِ امن و مژدۂ اماں بڑھے چلو

اگست 1949

رُباعیات

رُباعیات

(1)

یہ نور ترا ہے یا کہ ہے جامِ حیات یہ تیری کرن ہے یا ہے پیغامِ حیات
خورشید سے کہہ رہی تھی شبنم دمِ صبح تو میری حیات ہے کہ انجامِ حیات

(2)

ویرانے میں پھر بنائے تعمیر سی ہے پھر شوق میں اک نمو کی تاثیر سی ہے
تیرے قبضہ میں اے گزرتے ہوئے وقت وہ کون سی چیز ہے جو اکسیر سی ہے

(3)

کیوں اب وہ سرورِ بادہ و جام نہیں کیوں صبح کو لطفِ محفلِ شام نہیں
کیا میرے جگر میں گرمیِ خوں وہ نہیں یا تیری نظر میں اب وہ پیغام نہیں

(4)

بلبل ہے ابھی تو زندگانی باقی کیوں تیری نہیں وہ نغمہ خوانی باقی
مایوس نہ ہو ابھی جفائے گُل سے ہے بادِ سحر کی خوش بیانی باقی

(5)

جب اس کو کسی نے یہ خبر لاکر دی اللہ اللہ حسن کی بے دردی
شیریں کو یہ غم تو ہے کہ فرہاد مرا لیکن یہ خوشی سوا ہے جاں مجھ پر دی

(6)

ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے ضرور　　پیارے اُلفت کا بھی یہی ہے دستور
گر گل کی مہک نہیں چمن میں باقی　　یہ اُس کی خطا نہیں خزاں کا ہے قصور

(7)

پھر سوئے عدم چلے جہاں میں رہ کر　　آرام اُٹھا کے اور صدمے سہہ کر
اک شب کے لیے جما کے بزم ہستی　　سب سو گئے اپنے اپنے قصّے کہہ کر

(8)

عشرت گہہِ صیّاد کا ساماں لے کر　　گلچیں کے لیے دولتِ داماں لے کر
پھولو! کب تک بہار غیروں کے لیے　　غیرت ہے تو مت جاؤ گلستاں لے کر

(9)

کب رودِ خیال ایک رُخ بہتی ہے　　اک رنگ پہ آرزو کہاں رہتی ہے
ہر سانس میں دل سے زیست کی نیرنگی　　افسانۂ شوق نو بہ نو کہتی ہے

(10)

تریاق بنے گا نہ کبھی زہر کا جھاگ　　کڑوے بولوں کی گونج چھیڑے گی نہ راگ
تلوار کے پانی سے بُجھے گی نہ کبھی　　نفرت کی ہواؤں کی لگائی ہوئی آگ

(11)

ساقی! پھر غم کی ہیں سپاہیں تیار　　لانا میری بھی ارغوانی تلوار
یہ حربۂ عیش دے مرے ہاتھ میں جلد　　اب غم کی مجال ہو تو رو کے مرے وار

(12)

آنکھوں سے سبک حباب ٹپکیں نہ کہیں   نظریں ڈرتی ہیں ان کی چھو لیں نہ کہیں
تارے شبنم کے جیسے برگِ گل پر   اُنگلی لگتے ہی ٹوٹ جائیں نہ کہیں

(13)

فن کی دیوی کو مُسکراتے دیکھا   اک اور بلندی سے بلاتے دیکھا
پہونچا فن کار جب کسی چوٹی پر   زینہ اوپر کو اور جاتے دیکھا

(14)

ملنا کتنا کوئی ملاقات نہیں   باتیں کیا کیا مگر کوئی بات نہیں
یارانِ جہاں کی دوستی کیا کہیے   ہونٹوں پہ گھٹا دلوں میں برسات نہیں

(15)

ٹھکرا کے محبت کو نہ پچھتاؤ کہیں   معصومیت اچھی مگر اتنی بھی نہیں
بڑھ جائے نہ آگے کہیں ساقیِ حیات   تم جام لیے کے لیے رہ جاؤ یونہیں

(16)

طائر چپ، گُل اداس سہمی سی نسیم   چھائی ہوئی اک مہیب خاموشی بیم
لٹتی جاتی ہیں پتیاں شاخوں سے   آنے والا ہے کوئی طوفانِ عظیم

(17)

اس سے بھی نہ مٹ سکے گی تاریکیِ غم   اس میں بھی تفنّد کا وہی ہے دم خم
اس لال سویرے میں بھی دنیا کے لیے   لالی ہے سوا سوا سویرا کم کم

(18)

یہ دیو سماج خوں پیتا جائے   پی پی کے لہو دلوں کا جیتا جائے
انساں سے کہو منائے جشنِ فطرت   اور اس کے لیے کفن بھی سیتا جائے

(19)

گر مثلِ نسیم کوئی گلزار میں آئے   جھکیں کانٹے بھی یوں کہ سبزہ شرمائے
لیکن جو چمن پہ آنکھ ڈالے کوئی   ہر برگِ گیاہ تن کے بھالا بن جائے

(20)

قطرے مل مل کے بحرِ ذخار بنے   ذرّے پاس آکے قدِ کوہسار بنے
صدیاں گزریں بشر نہ لڑنے سے تھکا   ہر صلح میں جنگِ نو کے ہتھیار بنے

(21)

ہر دورِ کہن کی دورِ نو اک تجدید   کب تک انساں فریبِ راحت کا شہید
تقدیرِ بشر کے باب تک بھی دو   پہلے امید پھر شکستِ امید

(22)

یوں اہلِ کمال و فن سے نا اہلِ ہنر   ملتے ہیں ابھر کے روشِ بد ذوقی پر
اترا اترا کے جیسے ٹیلے کی گھاس   ڈالے سرو چمن پہ جھک جھک کے نظر

(23)

شمعیں گل کر کے خوابِ راحت تو نہیں   تاروں کو بجھا کے صبحِ عشرت تو نہیں
چڑھنے والے منارۂ ہستی پر   پیروں کے تلے جہاں کی میت تو نہیں

(24)

یہ تیرہ و تار غم کی راتیں کب تک — خوابوں سے سجائے گا براتیں کب تک
گھر کی شمعوں سے اُٹھ چراغاں کرلے — تاروں سے کیا کرے گا باتیں کب تک

(25)

یہ سلطنتِ غیر مقامی کب تک — اے خاک! فلک کی یہ غلامی کب تک
اک بار تو اے محبِ زمیں جوش میں آ — اک ساکنِ گردوں کی سلامی کب تک

(26)

یہ جذبۂ قومیت ہے اصلی رہزن — انساں کا یہی ہے آج جانی دُشمن
امنِ دُنیا کی بھولی سیتا کو کہیں — ہر لے نہ فریب دے کے پھر یہ راون

(27)

پھولوں کے مزاج میں یہ دیکھا اکثر — کانٹوں پہ تو ان کی ہے حمایت کی نظر
سینہ میں کھٹک رہا ہے لیکن کیا کیا — اک دوسرے گُل کا حسن نشتر بن کر

(28)

نازل ہوتی رہے گی یوں ہی یہ بلا — دنیا سے نہ جائے گی یہ جنگوں کی وبا
بزمِ انساں نہ ہو سکے گی ترتیب — جب تک بُتِ قوم کی ہے گھر گھر پوجا

(29)

مزدور پہ سیٹھ جی بگڑ کر گرجے — محسن کُش ناٹ کے کمینے ٹکڑے
میں بھلے تو وہی آستاں پہ اپنے تجھے جا — تو نے تلووں میں میرے چھالے ڈالے

(30)

ہر شب تری آغوش میں کی میں نے سحر   ہر اشک و تبسم کی مرے تجھ کو خبر
تجھ سا کوئی محبوب و وفادار نہیں   اک عمر کے ساتھی مرے پیارے بستر

(31)

آزادی کی ہے آج بھی مجھ کو تلاش   یہ خواب بنے جلد حقیقت اے کاش
شاید ترے تیشہ سے کچھ اُبھریں خد و خال   پتھر ہے ابھی تو یہ صنم سنگ تراش

(32)

معمارِ حیات کر نہ کچھ اس کا غم   ڈھانا ہی پڑے گا تجھ کو یہ قصرِ ستم
مسمار کیے بغیر جانے کا نہیں   بنیادِ غلط کا ہے جو تعمیر میں خم

(33)

دل جیسے کہیں کچھ اور کہتے ہی نہیں   دھارے دنیا میں اور بہتے ہی نہیں
بس اپنی زبان و قوم و تہذیب کا راگ   انسان کہیں اور جیسے رہتے ہی نہیں

(34)

منعم تھا نالشی حضورِ باری   اس بانٹ پہ بھی نہیں ہے مفلس راضی
لی میں نے فقط دوروزہ راحت مالک   اور اس کو غمِ دوام نعمت دی

(35)

ہو جائے حیات کیوں لطافت سے نہ دور   روحیں بیمار، دل بُجھے، ذہن ہیں چور
سونی بزمِ ادب تو ویراں رہِ عشق   ہر جرعۂ زیست ہے بہ ظرفِ مزدور

(36)

ڈھلتی ہوئی عمر آنکھ اٹھاتی ہے جدھر   برچھی لگتی ہے جیسے اک سینہ پر
کیا کیا پچھلے پہر ستم ڈھاتی ہے   اک شام کی یاد اور اک خوفِ سحر

(37)

نظروں کو ملا کے مسکرا دو تو کہوں   دل کو تھوڑا سا آسرا دو تو کہوں
ہونٹوں میں پھنسی ہوئی ہے کب سے اک بات   ماتھے سے شکن ذرا ہٹا دو تو کہوں

(38)

ویراں کشتِ حیات ہوتا ہی رہا   لیکن میں دلوں میں پیار بوتا ہی رہا
طوفاں کی مہیب سیٹیوں کی لے میں   ساحل کے ترانوں کو سموتا ہی رہا

سوزِ ناتمام

مجھے سمجھ نہ کسی دیدہ غریب کا اشک   جو لب تک آ نہ سکی ہے وہ التجا ہوں میں

موسمِ گل میں جو محروم لبِ رند رہے   آہ اُس جامِ لبالب کے مقدر کے لیے

ابرو و چشم و رُخ میں نہ مُو و کمر میں ہے   کہتے ہیں حُسن جس کو فریبِ نظر میں ہے

دل کہیں کامراں نہ ہو جائے   زندگی رائگاں نہ ہو جائے

وہ اک زمانہ کو اپنے ناز و ادا کے جلوے دکھا رہے ہیں
مری نظر سے جو لے گئے ہیں وہی خزانے لٹا رہے ہیں

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے
فرد انسان کو انساں سے لڑوانے میں
اور کچھ بھی نہیں کعبہ میں نہ بتخانے میں
چشمِ رنگیں کی بہاریں بھی تصدق اس پر
وہ جو لذت سی ہے اک اشک کے پی جانے میں

جہاں میں مرد وہی ہے جو یہ شعار کرے   چھپائے غم کو مسرت کو آشکار کرے

نیازِ عشق کے آداب سے واقف مرا دل ہے   غنی ہے اور کیسا کچھ مگر انداز سائل ہے

زیست کو زیست کی معراج پہ لانے کے لیے
غم ہے انسان کو انسان بنانے کے لیے
دے چکا میں تو تمھیں دل میں مقامِ محبوب
تم ہو کچھ اور تو وہ ہو گے زمانے کے لیے
حرفِ ارماں مرے دل نے بھی چنا ہے لیکن
لوحِ امّید پہ لکھ لکھ کے مٹانے کے لیے

فسردہ ہوتے ہوئے ڈالیوں پہ پھولوں کو   خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور خزاں میں نہیں

تاریک کتنی راتیں کتنی سیاہ گھڑیاں   غم میں ترے کٹی ہیں اشکوں کی چاندنی میں

چھڑی ہے جنگ صیادوں میں پھر تقسیمِ گلشن پر
نہ جانے کس کی کس کی آنکھ ہے اپنے نشیمن پر
کسی منظر پہ بھی وہ دل کشی آنے نہیں پاتی
قفس اپنا نہیں اک داغ ہے گلشن کے دامن پر

غضب ہے یوں کسی کا زیست سے بیزار ہو جانا   سمجھنا موت کیا ہے اور پھر تیار ہو جانا

آج دنیا سے اُٹھا ناکام وہ ملا جسے   کامیابِ زیست بن جانا کوئی مشکل نہ تھا

میں اپنی خامیِ اُلفت پہ ہوں خجل کیا کیا   وہ یاد آئے تو ان کی جفا بھی یاد آئی

صیقلِ راحت سے اس کی آب ہو جاتی ہے کم　　اک شعاعِ غم کے آتے ہی چمک اُٹھتا ہے دل

اپنے دل کی صدا نہ سن پائے
اتنے اقوال دوسروں کے رٹے
اُس نظر کا فریب کیا کہئے
ماں کی چھاتی سے شیر خوار ہٹے
جوشِ تقسیم وارثوں کا نہ پوچھ
ضد یہ ہے ماں کی لاش کٹ کے بٹے

خیال لے تو گیا مجھ کو تا بہ رفعتِ شوق　　مگر حیات تھی غدار پھر ڈھکیل دیا

ہے رازِ نیازِ عشق یہی ٹوٹے نہ فریبِ حسن کبھی
لیلےٰ جو اٹھائے بھی پردہ نظروں کو پسِ محمل کر دے

مایوسیاں ہی جب زیست بنیں دنیا سے الگ جینا اچھا
جب بادہ دل سم بن جائے تنہائی میں پینا اچھا

ہر سطحِ غم کو چیر کے دل میں اُتر گیا　　یوں نشترِ حیات کہ ہنسنا پڑا مجھے

ستم پر ستم کر رہے ہیں وہ مجھ پر　　مجھے شاید اپنا سمجھنے لگے ہیں

یوں دل بھی کہیں ہوتے ہیں جدا ملا کیسی یہ نادانی　　ہر رشتۂ ظاہر توڑ دیا زنجیرِ نہانی بھول گئے

نہ بن سکے گا نیا شوالہ جُویں گی ہرگز نہ دل کی اینٹیں
نظامِ حاضر کے سُرخ خوں کی پڑیں گی جب تک نہ گرم چھینٹیں

جن کے دل آزاد ہیں اُن سے قفس آباد ہیں
آج گلشن میں فقط ہم سے غلام آزاد ہیں
بلبلِ ناداں ذرا رنگِ چمن سے ہوشیار
پھول کی صورت بنائے سینکڑوں صیّاد ہیں
آشیاں والوں کی اب گلشن میں گنجائش نہیں
آج صحنِ باغ میں یا صید یا صیّاد ہیں

اپنی قوت آزما کر اپنے بازو تول کر　　عرصۂ ہستی میں اُڑنا ہے تو اُڑ پر کھول کر

تڑپنے کو تڑپ اے موجِ دریا جتنا جی چاہے
تجھے رہنا ہے لیکن عمر بھر آغوشِ ساحل میں

وسعتِ بزمِ جہاں میں ہم نہ مانیں گے کبھی　　ایک ہی ساقی رہے اور ایک پیمانہ رہے

تڑپ اٹھتا ہوں کوئی یادِ پیشیں جب دلاتا ہے　　مری خاکسترِ دل میں ہیں کیسی بجلیاں باقی

یوں تم اس دل کے مالک ہو ہاں یاد رہے یہ نازک ہے
اک بار جو یہ ٹوٹا ٹوٹا پھر کھیل نہیں جو جوڑ دیا

موجزن دل میں رہے اچھا ہے جوئے آرزو　　سینکڑوں دریا تنک آبی سے صحرا ہو گئے

زاہد سے اس صنم کی نظر آج مل گئی	بنیاد ایک عمر کے تقویٰ کی ہل گئی
کیسا غبار چشمِ محبت میں آگیا	ساری بہار حسن کی مٹی میں مل گئی

اپنی جانب تیری نظروں کو مخاطب خود کیا	راہ میں اپنی نہیں ہوتا ہے یوں کانٹے کوئی

یہ کہہ کے طور پہ بیہوش ہو گئے موسیٰ	مری حدیثِ تمنا ابھی تمام نہیں
ستم شعار زباں تک نہ آئے گی فریاد	مزاج عشق میں سودائے انتقام نہیں

دل دُکھے جس سے وہ ہنسی کیا ہے	جو رُلا دے وہ دل لگی کیا ہے
عشق ہے اب کسادِ بازاری	اک تجارت ہے دوستی کیا ہے

کیسے کیسے گل رعنا کلبۂ شوق میں ہیں	نہ کہو قصۂ کوتاہی داماں ہم سے

جو اپنی موت سے دنیا میں کچھ کمی نہ ہوئی	تو زیست مستحقِ نامِ زندگی نہ ہوئی

ہنستے تھے زمانہ کو ہمدرد سمجھ کر ہم	اب اپنے عقیدہ پر ہنسنے کا زمانہ ہے

عشق کی دنیا میں قیودِ مذہب و ملت نہیں	کوئی پابندی بجز پابندیٔ فطرت نہیں

وہ زیست کی بے کیف روانی تو نہیں ہے	خوں آگ ہے میرا تو ہو پانی تو نہیں ہے

مرتے دم مَیں ہوں پشیمانِ جہاں یہ منظور	میرے مالک مجھے کرنا نہ پشیمانِ وطن

تعدد کو تعدد سے دبا لیں یہ تو ممکن ہے	مگر شعلہ کو شعلہ سے بُجھایا جا نہیں سکتا

دکھا سکے گی نہ ہرگز جہاں کو امن کی راہ   ستمگری کی وہ مشعل جو دود سے ہے سیاہ

انساں کی جہالت کا ابھی ہے وہی معیار   ہے سب سے سوا پختہ دلیل آج بھی تلوار

مقطع جب کسی کی شکلِ ایماں دیکھ لیتا ہوں   اُٹھا کر طاق سے تصویرِ شیطاں دیکھ لیتا ہوں

اک جنوں الفت سہی اور حسن اک دھوکا سہی   یہ سمجھ کر بھی جوانی کی مہم آساں نہیں

جل کے بھی اندھے پتنگوں کو نہ کچھ عقل آئی   آج بھی شمع کی ہے گرمی بازار وہی

کبھی موجِ دریا نے مڑ کر نہ دیکھا   سفینہ لگا کون تھک کر کنارے

زندگی یہ کہہ کے دی روزِ ازل اُس نے مجھے   یہ حقیقت غم کی لے اور راحتوں کے خواب دیکھ

میں اب بھی منصبِ الفت کے اہل ہوں کہ نہیں   عدو کو میں نے ترا نام لیکے پیار کیا

حریف بن کے مقابل میں آسکا نہ جہاں   تو دوست بن کے پسِ پشت آکے وار کیا

محبت گرایا ہی کی دل پہ پردے   وہ خود آگئے سامنے چھپتے چھپتے

نہ جانے کتنے دلوں کے چراغ گُل کر کے   تری نگاہ ستاروں کو نور دیتی ہے

میکدے پر نہیں کوئی موقوف   دیر و کعبہ میں گُل کھلے کیا کیا
خود تو جینے کی تاب لا نہ سکے   اور دُنیا سے ہیں گلے کیا کیا

کبھی ملا سے روٹھ کر سونچا اس کے دل میں بھی ہیں گلے کیا کیا

ہر راہ آکے ختم ہوئی اس مقام پر یہ آستانِ عشق علیہ السلام ہے

تری جفا کو بھی سمجھا نگاہِ در پردہ کہاں کہاں دلِ شیدا نے آسرا ڈھونڈا

محبت اک پیامِ مرگ اوروں کے لیے ہوگی مجھے تو زندگی ہی زندگی معلوم ہوتی ہے

خوشی کے سینکڑوں خاکے بنائے اہلِ دُنیا نے مگر جب خد و خال اُبھرے وہی تصویرِ غم آئی

رُخِ صنم خانہ تمتمایا شکن جبینِ حرم پہ آئی
ادھر جہاں کے الم کدے میں کسی نے راحت کا خواب دیکھا

خلوصِ فن کا ہر فن کار سے پہلا تقاضا ہے
نظر اک دل کی جانب بھی ہو جب سوئے جہاں دیکھے
سہارا لے کے اپنے ذوق کا ملا ہوا راہی
نہ ہو خود اعتمادی جس میں راہِ کارواں دیکھے

مرتے مرتے جی اُٹھے شاید کوئی
تم ملا کر آنکھ حامی بھر تو دو
رفتہ رفتہ راہ پر آجائیں گے
شیخ جی کو شربتِ کوثر تو دو
عشق کے کب تک یونہی دیکھو گے خواب
آؤ ملا اوکھلی میں سر تو دو

کچھ ذرّے کچھ تارے

(1959)

وادیِ شعر یہ جادو ملا تو نہیں
اک الگ ہٹ کے نشانِ کفِ پا ہے تو سہی

اپنے پیروں پہ ہمیشہ سے کھڑا ہے مُلا
اُس کے قد میں کوئی حصہ کسی شانہ کا نہیں

☆

غزل محفل میں تیری پینے والوں کی کمی کب تھی
مگر ان پینے والوں میں مری شائستگی کب تھی

تری چھوٹی سی نے میں یوں تو نغمے بھی تھے نالے بھی
مگر آفاق جس سے گونج اٹھیں وہ راگنی کب تھی

دلِ خوں گشتہ کی تانیں تو تھیں اشکوں کے تاروں پر
تری لے میں مگر سوزِ جہاں کی تھرتھری کب تھی

لب و رخسار کے قصے نگاہ و دل کے افسانے
ترے ہونٹوں پہ لیکن آیتِ پیغمبری کب تھی

فرارِ ذہن کے خاکے تصوف کے کہیں گوشے
کبھی تو نے حقائق سے نظر یوں چار کی کب تھی

رباب و بربط و ساقی شراب و قلقلِ مینا
مگر یہ چشمۂ حیواں کی تجھ میں نغمگی کب تھی

تری مشاطگی عارض و گیسو تو تھی لیکن
کرن اک نور کی تیری جبیں سے پھوٹتی کب تھی

ترے عشاق نے پوشاک دی زیور دیے تجھ کو
کسی نے مانگ تیری یوں ستاروں سے بھری کب تھی

کسی چوٹی پہ اک شعلہ لپک اٹھتا تو تھا لیکن
غبارِ خاک کی منزل بہ منزل رہبری کب تھی

کہیں ابہام کی بدلی میں دھندلا سا کوئی تارا
یہ عرضِ مدعا کی صاف نکھری چاندنی کب تھی

کہیں جذبات کی شدّت تخیل کی کہیں رفعت
مگر یوں دل کے شیشے میں تخیل کی پری کب تھی

کبھی اک نغمۂ بے صوت، گاہے صوتِ بے نغمہ
یہ حسنِ امتزاجِ ذہن و دل کی ساحری کب تھی

شعورِ اجتماعی ثبت جس پر خاص مہریں تھیں
تری حد تھی تجھے حاصل یہ انساں آگہی کب تھی

غزل ایک نام تھا ناکامیوں پر سینہ کوبی کا
مرے پہلے یہ بانگِ کاروانِ زندگی کب تھی

~~~~~
~~~~~

غزلیات

☆

فائدہ کچھ گلۂ جور سے ہوتا بھی نہیں
اور مردانِ محبت کا یہ شیوا بھی نہیں
قصرِ بیداد کو ڈھادے ابھی ایسا بھی نہیں
آج مزدور مگر مُنہ کا نوالا بھی نہیں
شب وہ آئی ہے کہ تاروں کا دھندلکا بھی نہیں
آج دنیا کو محبت کا سہارا بھی نہیں
مجھ کو گرنے کا نہیں غم مگر اس کا ہے ملال
میں تو گرتا ہی مگر تم نے سنبھالا بھی نہیں
اب تو میں تم سے بہت دور کہیں ڈوب چکا
تم نے دیکھا ہی نہ جب میں نے پکارا بھی نہیں
یہی انصاف ہے اے خالقِ بزمِ مہ و مہر
خاک کی گود میں ننھا سا ستارا بھی نہیں
تو نے اس بزم میں اے شمعِ فروزاں چھوڑا
شمعِ کشتہ کے لیے ایک پتنگا بھی نہیں
غم کی کس منزلِ عرفاں پہ ہیں اب دل کے قدم
لطف کا شکر نہیں جور کا شکوا بھی نہیں
کرمِ شب تاب کو کے بار ستارہ سمجھا
اب مجھے اپنی نگاہوں پہ بھروسا بھی نہیں
خشک آنکھوں پہ نہ جا عشق ہے شائستہ مرا
غم کی رُت دل میں نگاہوں میں شگوفا بھی نہیں

غمِ دنیا، غمِ دل اپنی جگہ ہیں دونوں
بھول جاؤں غمِ دل وہ غمِ دنیا بھی نہیں
اُس جگہ آئی ہے اب کشتیِ عمر ملا
کہ جو منجدھار نہیں ہے تو کنارا بھی نہیں

~~~~~
~~~~~

☆

یہ جفائیں تو حقیقت میں عطائیں ہو گئیں
اور مستحکم محبت کی بنائیں ہو گئیں

کتنی کرنیں جو افق پر نور کا بنتی تھیں جال
اک ذرا اُبھریں افق سے اور گھٹائیں ہو گئیں

بندگی کی حد بھی ہے اہلِ فلک اب ہوشیار
ہو چکیں ساری نمازیں سب دعائیں ہو گئیں

خاک کے ذرّوں سے ہے شبخوں کا خطرہ چرخ کو
جاگتے رہنے کی گردوں پر صدائیں ہو گئیں

حرفِ مطلب تو لبوں میں پھنس کے جیسے رہ گیا
کتنی باتیں اور آئیں بائیں شائیں ہو گئیں

عقل کے مینارِ بابل میں انھیں سنتا ہے کون
دل کی تانیں آج صحرا کی صدائیں ہو گئیں

اچھے اچھوں کی نہیں چلتی ہے پیشِ حسن کچھ
ہم تو انساں ہیں فرشتوں سے خطائیں ہو گئیں

زندگی سے جہد میں ہارا بھی دل جیتا بھی دل
کچھ خطائیں ہو نہ پائیں کچھ خطائیں ہو گئیں

یہ عوامی دور ہے ملا وہی بینا ہے آج
جس کے حق میں کچھ سوا اندھوں کی رائیں ہو گئیں

~~~~~
~~~~~

☆

انساں کے لیے اس دنیا میں دشنام سے بچنا مشکل ہے
تقصیر سے بچنا ممکن ہے الزام سے بچنا مشکل ہے
طائر کے لیے دشوار نہیں صیّاد و قفس سے دُور رہے
لیکن جو شکلِ نشیمن ہے اُس دام سے بچنا مشکل ہے
دامن کو بچا بھی لیں شاید صحرا کے نکیلے کانٹوں سے
گلشن کے مگر گلہائے شرر اندام سے بچنا مشکل ہے
اس حادثہ گاہِ ہستی میں ٹکرائیں گے دو دل کچھ بھی کرو
پریوں کے لیے وہ لاکھ اُڑیں گلفام سے بچنا مشکل ہے
اوہام کی تاریکی تو مٹا سکتے ہیں جلا کر شمعِ خرد
لیکن خود عقل کے زائیدہ اوہام سے بچنا مشکل ہے
اے ارضِ سحر کے راہرو! منزل پہ پہنچنے سے پہلے
ہر قافلہ جس نے لوٹ لیا اُس شام سے بچنا مشکل ہے
کچھ قطرہ سے اوپر اوپر پھر دُرد ہی دُرد اندر اندر
آغازِ محبت خوب مگر انجام سے بچنا مشکل ہے
اک خوں اور گوشت کے انساں کا معبود تری جنت کی قسم
حوروں سے چرانا آنکھ آساں اصنام سے بچنا مشکل ہے
انسان کی ہے اولاد اگر وہ ملا ہو یا اور کوئی
ہنگامِ جوانی فلسفۂ خیام سے بچنا مشکل ہے

~~~~~
~~~~~

☆

دلوں کو دل نہ بننے دے گا آزارِ جہاں کب تک
محبت رائگاں ہے آج لیکن رائگاں کب تک
لبِ خاموش ضبطِ غم کی سعیِ رائگاں کب تک
تمنا بے صدا کب تک محبت بے زباں کب تک
بہارِ باغ اک بدلی ہوئی شکلِ خزاں کب تک
قفس کی تیلیوں ہی پر بنائے آشیاں کب تک
زمیں کی پستیاں ہی رفعتیں ہیں آسمانوں کی
اُبھر اے خاک، شانوں پر یہ بارِ آسماں کب تک
بشر کے وہم کے سائے ہیں گہوارے خدائی کے
ڈرے گا دیکھ کر اپنی ہی یہ پرچھائیاں کب تک
قدم رکھ راہِ اُلفت میں اکیلا ہے تو ڈر کیا ہے
تلاشِ کارواں تجھ کو امیرِ کارواں کب تک
چلے گی کب تلک بندوں کے برتے پر خداوندی
اُڑا کر نور ماتھوں کا فروغِ آستاں کب تک
اُلٹ کر رند بھی کچھ کہہ نہ دیں واعظ نہ چھیڑ ان کو
یہ شغلِ سنگ ساری اور شیشے کا مکاں کب تک
کبھی ذرّاتِ خاکی بھی تو تاریخِ جہاں لکھیں
مہ و انجم کے قصوں پر مدارِ داستاں کب تک
نسیم و سبزہ و گل کے سنہرے خواب دکھلا کر

یہ برق وباد وباراں ہی نصیبِ آشیاں کب تک
اُٹھو گھر کے دیوں ہی کو جلا کر روشنی کر لو
ستاروں سے تجلّی کا سوالِ رائگاں کب تک
فریبِ لطف کھا کر غم نہ لے لینا کہیں ملا
یہ مانا مہرباں ہیں وہ مگر وہ مہرباں کب تک

~~~~~
~~~~~

☆

درد آہنگِ جاں نہ ہو جائے
زندگی اک فغاں نہ ہو جائے
پھر قفس کی کوئی حسیں تیلی
پرچمِ آشیاں نہ ہو جائے
اور دنیا میں کوئی جرم نہیں
بس کوئی ناتواں نہ ہو جائے
رہنماؤں کی انتہا ہی نہیں
گم کہیں کارواں نہ ہو جائے
ہو گیا تھا جہاں ہلاکِ خرد
دل اگر درمیاں نہ ہو جائے
آہ و گریہ کو دل غنیمت جان
غم کہیں بے زباں نہ ہو جائے
موت اس سے بھلی کوئی طائر
خوگرِ آشیاں نہ ہو جائے
غم سے ہوتی ہے تربیت دل کی
اگر آزارِ جاں نہ ہو جائے
پھر نمودِ سحر کے پردے میں
خونِ سیارگاں نہ ہو جائے
کون لائے جفا کی تاب اگر
کرم درمیاں نہ ہو جائے

نہیں ممکن ملیں نگاہیں دو
اور اک داستاں نہ ہو جائے
زخمِ دل کو نہ اس طرح دیکھو
خوں کہیں پھر رواں نہ ہو جائے
شیخ اس غم میں سو نہیں پاتا
کوئی دل شادماں نہ ہو جائے
مے دل اور تلخ کر ملا
نذرِ شیریں لباں نہ ہو جائے

~~~~~
~~~~~

☆

خود اپنی چشمِ تر ہی کو بنا لیتے ہیں جام اکثر
جہاں میں تشنہ کاموں کا یوں ہی چلتا ہے کام اکثر

پلٹ کر لے لیا کرتی ہے فطرت انتقام اکثر
فرشتوں کے بھی لکھ جاتے ہیں انسانوں میں نام اکثر

ذرا یہ دورِ گلچیں جائے پھر تم پوچھے سننا
ابھی تو نغمہ سنجانِ چمن ہیں زیرِ دام اکثر

یہ میخانے کی جنت ہے یہاں دل، دل سے ملتے ہیں
یہاں کے رند پینے میں بدل لیتے ہیں جام اکثر

سنا جاتا ہے کچھ نغمے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں
مرے ہونٹوں سے دیتا ہے کوئی اپنا پیام اکثر

بھٹک جاتے ہیں اس منزل پہ آکر اہلِ دل کتنے
شکستِ عشق لے لیتی ہے رنگِ انتقام اکثر

نہ گھبرا دل گزر ہنستے ہوئے کوے ملامت سے
محبت پر تو آیا ہی کیا ہے اتہام اکثر

مجھے یا رب اٹھا لے ان نکو کاروں کی دُنیا سے
یہاں تقصیر کہلاتا ہے اُلفت کا سلام اکثر

کچھ اشکوں کی ہیں تحریریں تو کچھ نظروں کی تقریریں
کہانی دو دلوں کی ہو گئی ہے یوں تمام اکثر

ابھی دنیا میں جلووں کو بھی سایوں کی ضرورت ہے

نگاہِ خاص آتی ہے برنگِ لطفِ عام اکثر
اگر آئینِ ضبطِ عشق میں تقصیر ہے یہ بھی
میں مجرم ہوں دعاؤں میں لیا ہے تیرا نام اکثر
نہ ہو جائے کہیں محفل پہ ظاہر اپنی محرومی
تہی ہے پھر بھی ہونٹوں سے لگا لیتا ہوں جام اکثر
مبارک ہو تجھے ملا سناٹے میں راتوں کے
سنا ہے گنگناتا ہے کوئی تیرا کلام اکثر

~~~~~
~~~~~

☆

نگاہوں سے کسی کی پھر مری ملا پکار آئی
میں سمجھا تھا خزاں کا دور ہے لیکن بہار آئی
دلِ یخ بستہ سے پھر آبشارِ زندگی پھوٹا
بیاباں میں پھر اک جوے رواں مستانہ وار آئی
خدایانِ چمن کی توڑ کر حد بندیاں ساری
لیے گل پھر قریب شاخسار اک شاخسار آئی
دبا پایا نہ جوشِ گل کو کوئی جبرِ صیادی
ہر اک تیلی قفس کی توڑ کر مجھ تک بہار آئی
محبت کی حقیقت جملہ سامانِ طرب لے کر
خود آئی اور جتنے خواب تھے سب کو پکار آئی
میں سمجھا تھا مرا دورِ تبسم جا چکا لیکن
پھر اشکوں ہی کے تاروں پر تمنا نغمہ بار آئی
مرے نغموں کو سن کر خلدِ گم گشتہ پکار اٹھی
میں آئی اے مرے روٹھے ہوئے پروردگار آئی
پھر آیا ایک نخلستاں رہِ ہستی کے صحرا میں
پھر اک طوفاں زدہ کشتی بہ آغوشِ کنار آئی

گزر کر شب کی ہر پر ہول اور تاریک منزل سے

سحر کی وادیِ خنداں میں شامِ سوگوار آئی
دعائیں دل کی پھر کچھ یوں اثر میں ڈوب کر نکلیں
کہ ہونٹوں پر مہ و انجم کے "آمیں" بار بار آئی
وہی دیوانہ ملا جو کبھی روتا ہی رہتا تھا
ہنسی آئی اُسے اب تو یوں ہی بے اختیار آئی

~~~~~
~~~~~

☆

ستم اکثر بہ عنوانِ کرم ایجاد ہوتا ہے
چمن میں باغباں کے بھیس میں صیاد ہوتا ہے
جہاں میں کون کس کے درد پر ناشاد ہوتا ہے
فسانہ جس کا ہوتا ہے اُسی کو یاد ہوتا ہے
کبھی ہارا ہے جوشِ گل بھی دستِ جورِ گلچیں سے
نشیمن جلتے جاتے ہیں چمن آباد ہوتا ہے
نہ ہو جب تک سکت بازو میں یکساں قید و آزادی
قفس کے ٹوٹنے سے بھی کوئی آزاد ہوتا ہے
ابھی ہر بام پر اُس حسنِ ارزاں کے نظارے ہیں
کہ جن کو دیکھ کر ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے
وہ لمحہ جب اچانک جگمگا اٹھتی ہیں دو نظریں
نظر جب بجھ بھی جاتی ہے تو دل کو یاد ہوتا ہے
سمجھ کر جس کو اک غم کی امانت رکھ لیا دل میں
وہی خاموش نالہ حاصلِ فریاد ہوتا ہے
فقط تیشہ اٹھا لینے سے منصب مل نہیں جاتا
جو جوئے شیر لاتا ہے وہی فرہاد ہوتا ہے
نہیں ہے صید بھی معصوم صیادی کی دنیا میں
جب اس کا داؤں چلتا ہے یہی صیاد ہوتا ہے

جہاں چاہے بہا لے جائے سیلِ زندگی اس کو

مگر بچھڑی ہوئی کشتی کو ساحل یاد ہوتا ہے
دھرے رہ جاتے ہیں سب ہوش کے احکام اُلفت میں
وہیں خود صید جاتا ہے جہاں صیاد ہوتا ہے
کھنڈر اکثر جہاں دیر و حرم کے پائے جاتے ہیں
وہیں دیکھا گیا ہے میکدہ آباد ہوتا ہے
اُلجھ کچھ اور جاتے ہیں یہ پھندے ٹوٹ جانے سے
محبت کرنے والا بھی کہیں آزاد ہوتا ہے
غرض مندوں کی تحسیں سننے والے یہ بھی سنتا جا
وفا کیشوں کی خاموشی سے کیا ارشاد ہوتا ہے
خوشی کیا ہے فسانہ روزِ رفتہ کا بھلا سکنا
وہی غمگیں ہے جس کو یہ فسانہ یاد ہوتا ہے
چمن کو برق و باراں سے خطر اتنا نہیں ملا
قیامت ہے وہ شعلہ جو نشیمن زاد ہوتا ہے

~~~~~
~~~~~

☆

مدّت سے لب پہ کوئی سرود و فغاں نہیں
شاید نگاہ و دل میں کوئی داستاں نہیں

اُلفت کا اس جہانِ غرض میں نشاں نہیں
اور یوں تو چشم و دل کا یہ سودا کہاں نہیں

کمزور کے لیے کوئی جائے اماں نہیں
گلشن میں ناتواں کے لیے آشیاں نہیں

رفتار میں ابھی کوئی ترتیب ہے نہ ربط
اک بھیڑ ہے ضرور مگر کارواں نہیں

اب امتیازِ ساحل و دریا نہیں رہا
طوفاں اگر اٹھا تو قیامت کہاں نہیں

دیکھا تھا ایک خوابِ سحر آنکھ کھل گئی
آنکھیں کھلیں تو کوئی سحر کا نشان نہیں

مدت سے اڑ رہا ہے افق پر غبار سا
اے وائے شوق یہ بھی اگر کارواں نہیں

یہ اپنے اپنے ذوقِ نظر کا سوال ہے
ورنہ وہ بام کون ہے جلوہ جہاں نہیں

ملا خروشِ بزم میں چھیڑے ہی جا سرود
دنیا میں کوئی سعیِ عمل رائگاں نہیں

~~~~~
~~~~~

☆

جفائے دوست پر آزردگی کب تھی
نظر بجھتی تھی لیکن دل کے شعلوں میں کمی کب تھی
نہ بہ پائیں جو دھارے پر وہ خود آئیں کنارے پر
کسی کشتی سے موجِ زندگی کو دشمنی کب تھی
خُم مینا نے مل کر چھین لی جاموں کے حصّہ کی
تری محفل میں ساقی ورنہ صہبا کی کمی کب تھی
ہمیشہ تھیں جہاں میں رہزنی ورہبری دونوں
مگر یہ رہزنی پہلے بہ نامِ رہبری کب تھی
جفا کاروں کی ضامن تھی ستم کش کی وفا کیشی
زمیں جب تک زمیں تھی آسمانوں کی کمی کب تھی
کبھی تھک کر کہیں دم چھاؤں میں لینا ہی پڑتا تھا
مصافِ زیست میں لیکن محبت زندگی کب تھی
کہیں حق اور دلیلوں پر ہوئے ہیں فیصلے دل کے
جہانِ حسن و الفت میں سلیماں گستری کب تھی
کسی شب کے سہارے تھی یہ ساری جلوہ آرائی
فلک کے ان ستاروں میں خود اپنی روشنی کب تھی
سوالِ اہلِ ساحل پر نہ چپ رہتے تو کیا کرتے
ہمیں اپنی تباہی کی کہانی یاد ہی کب تھی
تمھاری شاعری میں زندگی ملتی نہیں ملا
ہماری زندگی لیکن برائے شاعری کب تھی

~~~~~
~~~~~

☆

غرورِ فتح میں جتنی جفائیں ہوتی جاتی ہیں
یہ سب کل کی لڑائی کی بنائیں ہوتی جاتی ہیں

نہ جانے کون ہیں کرتے ہیں جو تو بہ خطاؤں پر
ہم ایسوں سے خطاؤں پر خطائیں ہوتی جاتی ہیں

سرِ محفل سے جاتے ہیں، دیوانوں کے لب لیکن
در و دیوارِ زنداں میں صدائیں ہوتی جاتی ہیں

نزاعِ زیست ذہنوں میں ابھی گو غیر واضح ہے
محاذوں پر صف آرا پھر بھی رائیں ہوتی جاتی ہیں

وہ ساری مشکلیں جو راستہ روکے ہیں رہرو کا
قدم اُٹھنے لگے جب دائیں بائیں ہوتی جاتی ہیں

یہ بزمِ ہوش اک شہرِ خموشاں بن چکی ہوتی
غنیمت ہے کہ مستوں کی صدائیں ہوتی جاتی ہیں

طلوعِ صبح کی تاخیر پر یہ بے دلی کیوں ہے
یہ کیا کم ہے رو پہلی سی گھٹائیں ہوتی جاتی ہیں

بشر کو سانس لینا بھی کہیں مشکل نہ ہو جائے
کچھ اتنی آج زہریلی فضائیں ہوتی جاتی ہیں

جنابِ شیخ نے اپنا لیے دونوں جہاں ملا
نمازیں پڑھتے جاتے ہیں خطائیں ہوتی جاتی ہیں

☆

اعلانِ زندگی ہے بغاوت کبھی کبھی
اس کفر نے بھی کی ہے نبوّت کبھی کبھی

تھیں پیشِ حسن جرم کبھی بے گناہیاں
بخشے گئے خطا کی بدولت کبھی کبھی

ہشیار راہرو! کہ پکاریں گے راہزن
لے لے کے نام پیرِ طریقت کبھی کبھی

اس زندگی میں اور مصیبت کوئی نہیں
خود زندگی ہوئی ہے مصیبت کبھی کبھی

پوچھو نہ کشتگانِ تغافل کا حالِ زار
چشمِ عتاب بھی ہے غنیمت کبھی کبھی

تاریخ ہے گواہ گلستاں ہوئے تباہ
اک خوش دمیدہ گل کی بدولت کبھی کبھی

یہ رمز عاشقی ہے کہ عرضِ وفا کے ساتھ
ہوتی رہے کسی سے شکایت کبھی کبھی

مظلوم کو ملی ہے مصافِ حیات میں
اپنے لہو کو چاٹ کے طاقت کبھی کبھی

لگتا ہے یہ طہارتِ گفتارِ شیخ سے
پائی ہے اہلِ جام کی صحبت کبھی کبھی

دونوں ہیں ایک شدتِ احساس ہی کے رُخ
نفرت کے بھیس میں ہے محبت کبھی کبھی
رندانِ خوش عقیدہ میں ملا نہیں مگر
کی ہے مغاں کے ہاتھ پہ بیعت کبھی کبھی

~~~~~
~~~~~

☆

ہر لب پہ شعلہ نوائی ہے لیکن دلِ سوزاں کتنے ہیں
گفتار کا انساں کون نہیں کردار کے انساں کتنے ہیں
کیا تجھ سے کہیں ہم تیرے لیے اے دوست پریشاں کتنے ہیں
اور اس غمِ ظاہر پر اپنے خود دل میں پشیماں کتنے ہیں
اے ابرِ بہاراں باغ ہی پر یہ بارشِ رنگ و نکہت کیوں
محروم توجہ سے تیری صحرا و بیاباں کتنے ہیں
آبادِ دیارِ نعرہ زنی میدانِ عمل میں سناٹا
ڈھونڈے نہیں ملتے آبلہ پا اور چاک گریباں کتنے ہیں
للچائی نگاہیں جاتی ہیں پھر جہلِ گزشتہ کی جانب
آج اپنے علم کی طاقت سے انسان ہراساں کتنے ہیں
یہ ریگِ رواں ہے آب نہیں منزل ہے مسافر دور تری
اس رہ میں نہ جانے دشت ابھی ہمرنگِ گلستاں کتنے ہیں
یہ رُت راس آئی ہے تجھ کو نفس لے لیکن جب فرصت ہو
آبادِ بہاراں سوچ ذرا برباد بہاراں کتنے ہیں
دشوارئ ہستی کیا کہیے جتنے مُنھ ہیں اُتنی باتیں
ہے غم کا فسانہ ایک مگر افسانے کے عنواں کتنے ہیں
جو ہٹ گئے راہِ انساں سے اے شیخ و برہمن سوچا بھی
اُس قافلۂ گمراہاں میں گم کردہ ایماں کتنے ہیں

آزادی کس کو حاصل ہے ہر اقلیم جہاں اک زنداں ہے
بس فرق ہے اتنا کس زنداں میں روزنِ زنداں کتنے ہیں
ہر دیر و حرم کو کترا کر ملا آیا ے خانے میں
ملا کے سے لیکن دنیا میں سلجھے ہوئے انساں کتنے ہیں

~~~~~
~~~~~

☆

خموشی ساز ہوتی جا رہی ہے
نظر آواز ہوتی جا رہی ہے
نظر تیری جو اک دل کی کرن تھی
زمانہ ساز ہوتی جا رہی ہے
کسی کی ہر نگاہِ جلوہ ساماں
دلوں کا راز ہوتی جا رہی ہے
نہیں آتا سمجھ میں شورِ ہستی
بس اک آواز ہوتی جا رہی ہے
محبت جو کبھی تھی قدرِ اعلیٰ
نظر انداز ہوتی جا رہی ہے
ٹھہر مطرب! مرے سینے کی دھڑکن
شریکِ ساز ہوتی جا رہی ہے
قفس کے دائرے ہی دائرے میں
ابھی پرواز ہوتی جا رہی ہے
خموشی جو کبھی تھی پردۂ غم
یہی غماز ہوتی جا رہی ہے
محبت سے کسی کی بے نیازی
بہ حدِ ناز ہوتی جا رہی ہے

نگاہوں میں فسانے آ چلے ہیں
حقیقت باز ہوتی جا رہی ہے
الٰہی خیر تو ہے کیوں یہ دُنیا
مری دم ساز ہوتی جا رہی ہے
بشر کی عقل خود اب رفتہ رفتہ
جنوں پرداز ہوتی جا رہی ہے
لبِ واعظ پہ ہے مے کی مذمّت
نظر شیراز ہوتی جا رہی ہے
بدی کے سامنے نیکی ابھی تک
سپر انداز ہوتی جا رہی ہے
غزل ملاّ ترے سحرِ بیاں سے
عجب اعجاز ہوتی جا رہی ہے

~~~~~
~~~~~

☆

ملے گی سب کو مے، سنتے ہیں محفل میں خبر آئی
ابھی تک تو مگر ہم تک نہ ساقی کی نظر آئی

فلک پر حشر برپا نوریوں کی آنکھ میں شعلے
کسی خاکی کی شاید پھر کوئی اُمید بر آئی

خرد کو کروٹیں لیتے ہی گزری فرشِ گل پر بھی
جنوں کو نیند آئی اور اکثر دار پر آئی

بشر کی سادہ لوحی تجربوں سے بھی نہیں جاتی
ذرا شب مسکرائی اور یہ سمجھا سحر آئی

پرندِ پر شکستہ کو قفس میں کون رکھتا ہے؟
اسیری جب بھی آئی ہے بہ فیضِ بال و پر آئی

مرا سینہ مرے شعلے کسی کو کیوں شکایت ہو
نظر تک جب بھی آئی ہے شعاعِ بے ضرر آئی

نہ اُٹھ آتے کسی کی انجمن سے ہم تو کیا کرتے
نہ آدابِ سخن آئے نہ تہذیبِ نظر آئی

وہ اندازِ تبسم ہے کہ چہرہ جگمگا اُٹھا
کرن جیسے کوئی نظروں کی ہونٹوں پر اُتر آئی

ابھی تک تو بشر کے واسطے اِس ارضِ خاکی پر
وہی اک رات پھر پھر کر بہ اعلانِ سحر آئی

قدم نظروں سے آگے پڑ رہے ہیں اُف ری بیتابی
دیارِ دوست کی نزدیک شاید رہ گزر آئی

خرد کی دوپہر میں زیست اپنی کٹ گئی ملا
نہ شامِ مے فروش آئی نہ صبحِ چشمِ تر آئی

~~~~~
~~~~~

☆

روشنی صبح کی ڈوبے ہوئے تاروں میں نہیں
زندگی ڈھونڈ، مگر جا کے مزاروں میں نہیں

کیف نظروں میں نہیں حسن نظاروں میں نہیں
بات ابھی کوئی بہاروں کی بہاروں میں نہیں

کشتیِ دل کے مقدر میں یہ طوفاں کب تک
کیا کوئی جا تری نظروں کے کناروں میں نہیں

دل بجھائے ہوئے بیٹھے ہیں نگاہوں کے چراغ
روشنی آج محبت کے دیاروں میں نہیں

راستے بند ہیں ہر سمت ہے نفرت کی فصیل
قافلہ کوئی رواں راہ گزاروں میں نہیں

آرزو دل کی بھلا جی بھی سکے گی ان پر
غلط انداز نگاہیں تو سہاروں میں نہیں

ابرِ بے آب سہی دھوپ کی تیزی تو گئی
میں نے مانا کہ ابھی کیف بہاروں میں نہیں

بن کے اک کوہ اُڑاتے ہیں وہ طوفاں کا مذاق
ذرّے جو خاک کی دولت ہیں غباروں میں نہیں

زد پہ موجوں کی نہ ہو کون ہے ساحل ایسا
امن موجوں میں نہیں ہے تو کناروں میں نہیں

غازۂ گرد و عرق میں ہیں رُخ اُن کے پنہاں
میرے پیارے ابھی دنیا ترے پیاروں میں نہیں

عکسِ خورشید سے جلوے ہیں ترے چرخِ حیات
ابھی ذرّوں کی شعاعیں ترے تاروں میں نہیں
جبر کی بند فضا امن کو آتی نہیں راس
گل یہ راہوں پہ مہکتا ہے حصاروں میں نہیں
عرصۂ شعر میں ہے شاہ سوارِ یکتا
نام ملا کا مگر پانچ سواروں میں نہیں

~~~~~
~~~~~

☆

فلک کے نہ ان ماہ پاروں کو دیکھو
جو مٹی میں ہیں اُن ستاروں کو دیکھو

کبھی کارواں بھی نمودار ہوگا
نگاہیں جمائے غباروں کو دیکھو

نکل کر کبھی شہرِ سود و زیاں سے
محبت کے اُجڑے دیاروں کو دیکھو

چمن میں یہ کس چال سے چل رہے ہو
نہ پھولوں کو دیکھو نہ خاروں کو دیکھو

زباں حسن کی معتبر کب ہوئی ہے
کنایوں کو سمجھو اشاروں کو دیکھو

مصلّح قطاریں اِدھر بھی اُدھر بھی
ذرا امن کی رہ گزاروں کو دیکھو

چمن کی خزاں پر نہ آنسو بہاؤ
نظر ہے تو کل کی بہاروں کو دیکھو

نہ دیکھو درختوں کی دوری چمن میں
لپٹتی ہوئی شاخساروں کو دیکھو

ذرا جھانک کر غرفۂ میکدہ سے
ترستے لبوں کی قطاروں کو دیکھو

کسی کے ستم کو بھی سمجھے توجہ
ارے ان تغافل کے ماروں کو دیکھو

وہ دورِ حیات جہاں آگیا ہے
بھنور میں رہو اور کناروں کو دیکھو
بڑھو اور ہاتھوں کا اک پل بنا لو
کناروں سے کب تک سواروں کو دیکھو
بنائے بقا دھمکیوں پر فنا کی
نئے جگ کے پروردگاروں کو دیکھو
کبھی نام ملا نہ آیا زباں تک
یہ دُنیا ہے ملا کے یاروں کو دیکھو

~~~~~~
~~~~~~

☆

کیوں زیست کا ہر ایک فسانہ بدل گیا
یہ ہم بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا

صیّاد یاں وہی وہی طائر وہی ہیں دام
لیکن جو زیرِ دام تھا دانہ بدل گیا

بازیِ حسن و عشق میں کچھ ہار ہے نہ جیت
نظریں ملیں دلوں کا خزانہ بدل گیا

بختِ بشر وہی ہے بساطِ جہاں وہی
ہر دورِ نو میں مات کا خانہ بدل گیا

طاقت کے دوش پر ہے ازل سے بشر کی لاش
بس تھوڑی تھوڑی دور پہ شانہ بدل گیا

محفل کے حسبِ ذوق ہے مطرب کا ساز بھی
محفل بدل گئی تو ترانہ بدل گیا

ان داغہائے دل میں کوئی زخم نو نہیں
شاید کسی نظر کا نشانہ بدل گیا

ملا کا زورِ طبع ہوا فیصلوں کی نذر
دریا ابھی وہی ہے دہانہ بدل گیا

~~~~~
~~~~~

☆

نرمی دلوں سے لب سے حلاوت بھی چھین لی
اس دور نے نظر سے مروت بھی چھین لی

تیوری چڑھا کے پہلے تو کہنے دیا نہ کچھ
پھر مسکرا کے دل سے شکایت بھی چھین لی

میں کر رہا تھا صبر سے غم کا مقابلہ
کی اک نگاہ اور یہ طاقت بھی چھین لی

پہلے تو ہر خطا سے کیا منع شوق کو
اور پھر ہر اِک ثواب سے لذت بھی چھین لی

صیاد نے بہ عذرِ ہوا خواہیِ چمن
سبزہ سے رنگ پھول سے نکہت بھی چھین لی

با حیلۂ درستیِ اخلاق رند سے
وقتی سی زر خرید مسرت بھی چھین لی

کیا کہیے حشر گاہیِ رفتارِ کارواں
تلووں سے خار چننے کی فرصت بھی چھین لی

عمرش دراز باد! کلاہِ سفید نے
سر میں لطیف شے کی ضرورت بھی چھین لی

دُنیا امیر چھین چکا تھا غریب سے
جنت بچی تھی شیخ نے جنت بھی چھین لی

معتوب شمعِ اُردو کو تربت پہ رکھ دیا
پروانے پھر بھی آئے تو تربت بھی چھین لی

ملا کو بامِ شعر پہ یاروں نے جا نہ دی
پھر اُس سے یہ عبادت خلوت بھی چھین لی

~~~~~
~~~~~

☆

نگاہیں پھیر لینے کا اگر دل کو شعار آئے
وہ جلوہ سامنے خود آئے اور دیوانہ وار آئے

بہار آنے کا آسانی سے کیسے اعتبار آئے
ہزاروں فتنۂ شب صورتِ ابرِ بہار آئے

کسی غم میں نہ تپ کر جب تلک دل پر نکھار آئے
نہ جینے ہی کا ڈھنگ آئے نہ مرنے کا شعار آئے

جہاں کی داستاں میں معرکے ایسے ہزار آئے
اِدھر سے اہلِ سیف اُٹھے اُدھر سے اہلِ دار آئے

زمیں کے شہر یار آئے فلک کے تاجدار آئے
بشر کے واسطے لیکن وہی لیل و نہار آئے

یہ فصلِ گل تو سب کی ہے کوئی افسردہ دل کیوں ہے
نہیں ممکن چمن کے ایک گوشے میں بہار آئے

ہر اک طائر کا حق ہے آشیاں پرواز اور نغمے
کوئی میری طرف سے یہ گلستاں میں پکار آئے

بس اتنی فرصتِ الفت ہے جہدِ زیست میں جیسے
کسی ساحل پہ دم لینے کو موجِ بیقرار آئے

یہ رشتہ دو دلوں کے ربطِ باہم کا ہے ناممکن
کہ اک دل میں تو شک ہو دوسرے میں اعتبار آئے

دیارِ اہلِ دل ہے یہ یہاں درویش بستے ہیں
یہاں جو آئے پہلے اطلس و دیبا اُتار آئے

کسی کی بارگاہِ لطف سے آواز آتی ہے
یہاں سے سرخ رو اُٹھے وہی جو شرم سار آئے
یہ سارے کوہ ٹکرا کر جہاں کو خاک کر ڈالیں
اگر ان کو جدا کرتی نہ جوئے نغمہ بار آئے
مرے دشمن کو دے الطاف خوباں جشن میخانہ
مجھے توفیق دے دل میں مرے انساں کا پیار آئے
مجھے اے خالق نطق و زباں خاموش کر دینا
مرے لب پر نہ جس دن دردِ انساں کی پکار آئے
میں نخل شعر کو دیتا تھا جو کچھ دے چکا ملا
خدا جانے مری ڈالی پہ گل آئے کہ خار آئے

~~~~~
~~~~~

☆

دل کو شاید اب محبت کا سلیقہ آگیا
مات کھاتا جائے ہے بازی لگاتا جائے ہے
کچھ نہ کچھ ننھے سے ہر تارے کی لو دیتی ہے نور
گو بہ ظاہر اُس پہ شب کی تیرگی چھا جائے ہے
شاخِ گل گلپوش ہو اس کو نہیں کہتے بہار
جب یہ رُت آئے ہے کانٹے پر کلی آجائے ہے
خوگرِ طرزِ تغافل ہو چکا ہے یوں یہ دل
کوئی رسمی بات بھی پوچھے تو گھبرا جائے ہے
ہو چکے ہیں خشک سب احساس کے سوتے فقط
قلب شاعر ہے جو تھوڑی سی نمی پا جائے ہے
مہر کی کرنیں بجھا دیتی ہیں تاروں کے چراغ
عقل جاگے ہے تو دل کو نیند سی آجائے ہے
برق بھی ہے باد بھی اور گھات میں صیاد بھی
پھر بھی یہ سچ ہے چمن پر رنگ آتا جائے ہے
حاصل دنیا و دیں ہے شیخ کا طرزِ حیات
ہر خطا کے بعد اک سجدہ بھی ہوتا جائے ہے

محنتکی و تشنگی و رہزن و ریگ و سراب
کتنی صدیاں ہو گئیں انسان چلتا جائے ہے
اس طرف امن و بقا اور اُس طرف جنگ و فنا
دیکھیے یہ کارواں کس سمت ملا جائے ہے

~~~~~
~~~~~

☆

دل! حرفِ ستائش ہے یہ دشنام نہیں ہے
الزامِ محبت کوئی الزام نہیں ہے

مدّت سے کوئی جلوہ سرِ بام نہیں ہے
کیا دیدہ و دل میں کوئی پیغام نہیں ہے

محرومیِ تقدیر کی شکلیں ہیں ہزاروں
اب شام جو آئی تو مے و جام نہیں ہے

اک میٹھی سی رہ رہ کے کھٹک ہوتی ہے دل میں
اک درد کہ جس کا ابھی کچھ نام نہیں ہے

ہے عشق ترا خام ابھی نالہ کشِ یاس
جس دل میں محبت ہے وہ ناکام نہیں ہے

یہ محفلِ ساقی ہے یہاں دور میں ہے جام
اس جا گزرِ گردشِ ایام نہیں ہے

ہے اہلِ وفا ہی پہ جفا اور زیادہ
کیا کہیے اسے یہ اگر انعام نہیں ہے

پہونچے گا ضرر کچھ نہ تمھیں میری نظر سے
یہ نور کا شعلہ شرر اندام نہیں ہے

بڑھ کر نہ کہیں چھین لوں ساقی نہ مجھے چھیڑ
اب مجھ سے بہت فاصلۂ جام نہیں ہے

دم بھر کی خوشی بھی نہ اُڑا لے کہیں کوئی
دنیا کو مگر اور کوئی کام نہیں ہے

بے لوث ہے اب تک تو مری چشمِ نظارہ
بس سجدۂ دل ہے کوئی پیغام نہیں ہے
آسان نہیں چھیڑ کو خوباں کی سمجھنا
الزام ہے اور نیتِ الزام نہیں ہے
شائستگیِ زیست سے وہ دل ہے ابھی دور
جس میں ہے غم اپنا، غمِ ایام نہیں ہے
مظلوم کی اس سے نہیں ہوتی ہے تسلی
سنتے ہیں کہ ظالم کو بھی آرام نہیں ہے
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے فنکاریِ صیاد
دانہ جو تھا اب وہ بھی تہہِ دام نہیں ہے
یا خیرگیِ روز ہے یا تیرگیِ شب
اب نرمیِ نورِ سحر و شام نہیں ہے
جینے کے لیے کون سی ساعت نہیں اچھی
پابندیِ اوقاتِ مے و جام نہیں ہے
شہرت سے فضیلت نہیں، کتنے ہی ستارے
روشن ہیں سوا مہر سے اور نام نہیں ہے
آساں نہیں چلنا یہاں رکھ پاؤں سنبھل کر
یہ جادۂ ملا ہے رہِ عام نہیں ہے
کچھ بات ہے ملا میں کہ نقادوں کے باوصف
وہ انجمنِ شعر میں گمنام نہیں ہے

~~~~~
~~~~~

☆

رفتہ رفتہ ایک آہنگِ فغاں بنتا گیا
غم ہی آخر غمگسارِ بے کساں بنتا گیا

ایک غم تو وہ ہے جو آزارِ جاں بنتا گیا
اور اک وہ ہے جو دنیا کی زباں بنتا گیا

زندگی ہے اک مسلسل جزر و مد ہر روز و شب
ساحلِ ہستی پہ موجوں کا نشاں بنتا گیا

آشیانے باغ میں صیاد پھونکا ہی کیے
سینۂ ہر برگِ گل میں آشیاں بنتا گیا

دردِ انساں مشترک تھا اہلِ غم خود آئے پاس
خضر لڑتے ہی رہے اور کارواں بنتا گیا

آستاں دیتا رہا بندوں کی پیشانی کو داغ
نور ماتھوں کا فروغِ آستاں بنتا گیا

حسرتِ تعمیرِ انساں کی کہیں کیا داستاں
اک قفس ہی آشیاں در آشیاں بنتا گیا

زیست کا آئیں ہے شاید جبر ہر مشتِ غبار
خاک سے اُبھرا ذرا اور آسماں بنتا گیا

برق و شبنم، باد و باراں خار و گل سب آئے کام
رفتہ رفتہ اک مزاجِ گلستاں بنتا گیا

کارخانے سنگ و آہن کے ہر اک سو گرمِ کار
اور دُنیا کا یہ شیشے کا مکاں بنتا گیا

ہر نفس عمرِ رواں کا ہے غذائے مرگ و زیست
اک جہاں مٹتا گیا اور اک جہاں بنتا گیا
زیست کی تلخی تو الفت سے نہ مٹ پائی مگر
جامِ سم پر ایک خطِ ارغواں بنتا گیا
اک نظر سوئے جہاں اک سوئے دل ہر گام پر
اور یوں ملا کا اندازِ بیاں بنتا گیا

~~~~~
~~~~~

☆

کیوں نہ ہو ذکر محبت کا مرے نام کے ساتھ
عمر کاٹی ہے اسی دردِ دل آرام کے ساتھ
مجھ کو دنیا سے نہیں اپنی تباہی کا گلہ
میں نے خود ساز کیا گردشِ ایام کے ساتھ
اب رہ زیست میں ہے یہ مرے دل کا عالم
جیسے کچھ چھوٹتا جاتا ہے ہر اک گام کے ساتھ
تجھ سے شکوہ نہیں ساقی تری صہبا نے مگر
دشمنی کوئی نکالی ہے مرے جام کے ساتھ
جو کرے فکرِ رہائی وہی دشمن ٹھہرے
اُنس ہو جائے نہ طائر کو کسی دام کے ساتھ
زیست کے درد کا احساس کبھی مٹ نہ سکا
سن خوشی کے بھی کٹے اک غمِ بے نام کے ساتھ
منع تقصیر کہوں دعوت تقصیر کہوں؟
نگہ نرم بھی ہے گرمیِ الزام کے ساتھ
اپنی اس آج کی طاقت پہ نہ یوں اتراؤ
مہر اُٹھا تھا ہر اک صبح شب انجام کے ساتھ
میں تجھے بھول چکا ہوں مگر اب بھی اے دوست
آ سی جاتی ہے نگاہوں میں چمک شام کے ساتھ

اب بھی کافی ہے یہ ہر شور پہ چھانے کے لیے
کوئی الفت کی اذاں دے تو ترے نام کے ساتھ

آ گیا ختم پہ صیاد ترا دورِ فسوں
اب تو دانہ بھی نہیں ہے قفس و دام کے ساتھ

کاخ و ایواں یہی گزرے ہوئے دوروں کے نہ ہوں
گرد سی آئی ہے کچھ دامنِ ایام کے ساتھ

میں ترا ہو نہ سکا پھر بھی محبت میں نے
جب بھی دُنیا کو پکارا تو ترے نام کے ساتھ

خلد اجڑی ہے تو اب اپنے فرشتوں سے بسا
ہم سے کیا ہم تو نکالے گئے الزام کے ساتھ

حجرہ خلد ہے حورِ شرر اندام نہیں
ساقیا آتشِ رنگیں بھی ذرا جام کے ساتھ

ذکر ملا بھی اب آتا تو ہے محفل میں مگر
پھیکی تعریف میں لپٹے ہوئے دشنام کے ساتھ

میری کوشش ہے کہ شعروں میں سمو دوں ملا
صبح کا ہوش بھی دیوانگیِ شام کے ساتھ

دو کناروں کے ہوں مابین میں اک پل ملا
رکھتا جاتا ہوں ستوں ایک ہر اک گام کے ساتھ

~~~~~
~~~~~

☆

دل کی دل کو خبر نہیں ملتی
جب نظر سے نظر نہیں ملتی

نکہَ نیش زن ہزار کوئی
نکہَ بخیہ گر نہیں ملتی

نکل آتے تو ہیں قفس میں بھی پر
طاقتِ بال و پر نہیں ملتی

سحر آئی ہے دن کی دھوپ لیے
اب نسیمِ سحر نہیں ملتی

دلِ معصوم کی وہ پہلی چوٹ
دوستوں سے نظر نہیں ملتی

یا تو آتی ہے خود وہ چشمِ کرم
یا کسی دام پر نہیں ملتی

جتنے لب اُتنے اُس کے افسانے
خبرِ معتبر نہیں ملتی

جھٹے موتی اڑا تو لیتے ہیں تاب
مگر آبِ گہر نہیں ملتی

ہے مقامِ جنوں سے ہوش کی راہ
سب کو یہ رہ گزر نہیں ملتی
زیست کی تیرگی میں شمع کوئی
دل سے تابندہ تر نہیں ملتی
نہیں ملا یہ اس فغاں کا اثر
جس میں آہِ بشر نہیں ملتی

~~~~~
~~~~~

☆

وہ چارۂ ستمِ روزگار کر نہ سکے
جو زندگی کو غمِ خوشگوار کر نہ سکے

وہ گل پرست گلستاں سے پیار کر نہ سکے
جو خار کو بھی گلوں میں شمار کر نہ سکے

بس ایک پھیکی ہنسی لب پہ تھی سو دے ڈالی
کچھ اور خدمتِ فصلِ بہار کر نہ سکے

جو ہارے وہ بھی جیے حیف ہے تو اُن پر ہے
جو نقدِ دل سے کوئی جیت ہار کر نہ سکے

نہ تو رہے گا نہ تیرا یہ میکدہ ساقی
یہ تشنہ کام اگر انتظار کر نہ سکے

انھیں کے دل کی دبی آگ سے ڈر اے محفل
جو کھل کے بات سرِ رہ گزار کر نہ سکے

بشر ہے بندۂ اُلفت غلامِ جبر نہیں
جو اہلِ دل نے کیا تاجدار کر نہ سکے

وہ اُس کے عشق کا منصب نہ پا سکے ملا
جو اُس کے نام پہ دشمن کو پیار کر نہ سکے

~~~~~
~~~~~

نظمیات

بنے نفرت کدے اُلفت کدہ تعمیر کر ساقی
جہنم بن چکے جنت کدہ تعمیر کر ساقی
حرم اور دیر تو شیخ و برہمن نے بنا ڈالے
بیادِ میکشاں رحمت کدہ تعمیر کر ساقی

☆

اشارے

آزاد ہیں نئے ہیں چارے نئے نئے
ملتے ہیں زندگی کو سہارے نئے نئے
جب بھی گھری ہے موجوں میں کشتی حیات کی
اُبھرے ہیں موج ہی سے کنارے نئے نئے
لائے گی تیرگی ہی مداوائے تیرگی
یہ رات خود جنے گی ستارے نئے نئے
یہ خار زار آپ ہی اُگلے گا لالہ زار
پھوٹیں گے تہ سے دشت کی دھارے نئے نئے
ہونے دو ہر منارۂ ماضی کو بے چراغ
وہ جگمگا رہے ہیں منارے نئے نئے
عزمِ جواں ہے دل میں تو راہیں نئی نئی
نظروں میں تاب ہے تو نظارے نئے نئے
منزل بہت قریب ہے اب گام گام پر
رہرو کو مل رہے ہیں اشارے نئے نئے

~~~~~
~~~~~

☆

بھول

مجھ سے ہاں بھول ہوئی اور بڑی بھول ہوئی
اشکِ ناپاک کو میں آنکھ کا تارا سمجھا
دیش بھگتوں کو غریبوں کا سہارا سمجھا
بحر کی تہ سے اُبھر آئی تھی طوفاں میں جو ریت
اُس کو میں جوشِ عقیدت میں کنارا سمجھا
اُف ری مسحور نگاہی کہ ہوس کی لَو کو
جذبۂ خدمتِ انساں کا شرارا سمجھا
حرص کی آگ میں دہکے ہوئے انگاروں کو
عرشِ گاندھی کا چمکتا ہوا تارا سمجھا
پسِ 'نہرو' تو تھی مٹی کے کھلونوں کی قطار
اور میں لشکرِ قومی کو صف آرا سمجھا
مہر کی آڑ میں تھے کالی گھٹاؤں کے پرے
میں شفق کا جنھیں رنگین نظارا سمجھا
خس و خاشاک کی گوبر سے لپی اک تعمیر
جس کو فولادِ وطن کا میں منارا سمجھا
وہی کم ظرفی و نخوت، وہی خود کامی و جبر

اس نئے درد کو میں درد کا چارا سمجھا
موج در موج تعفّن ہی تعفّن نکلا
میں جسے عطر کا بہتا ہوا دھارا سمجھا
مجھ سے ہاں بھول ہوئی اور بڑی بھول ہوئی

~~~~~
~~~~~

☆

سردار پٹیل

(1)

غرق ساحل پہ ہوئی کشتیِ طوفاں اک اور
مل گیا خاک میں پھر گوہرِ داماں اک اور
رات کی نذر ہوا مہرِ درخشاں اک اور
آج دنیا سے اُٹھا نازشِ دوراں اک اور
مقتلِ زیست میں پھر چوٹ یہ کاری آئی
قوم روتی ہے کہ سردار کی باری آئی

(2)

کون سردار وہی راہ نمائے کامل
رزم میں شیر صفت، بزم میں سازِ محفل
پیکرِ سنگ میں پگھلے ہوئے فولاد کا دل
جس کے ناخن سے لرزتی تھی کوئی ہو مشکل
مادرِ ہند مجھے تجھ پہ ترس آتا ہے
آج یہ لعل بھی ہاتھوں سے ترے جاتا ہے

(3)

ساتھ گاندھی کے تو پہلے تری تقدیر گئی
تیری عظمت، تری طاقت، تری توقیر گئی
بلبلِ ہند لیے شوخیِ تقریر گئی
آج سردار گیا یا تری شمشیر گئی
اب تری بزم میں نالے کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک 'نہرو' کے اُجالے کے سوا کچھ بھی نہیں

(4)

فرد فانی تو ہے اور انجمنیں زندہ ہیں
کچھ مگر سرخیِ افسانۂ آیندہ ہیں
جن کے کردار درخشندہ و تابندہ ہیں
جو کسی قوم کی تاریخ میں پایندہ ہیں
جس کو سینوں سے مٹادیں وہ ترا نام نہیں
موت تیری ترے افسانہ کا انجام نہیں

~~~~~
~~~~~

☆

قطعہ

اور چھٹکارا نہیں اس حلقۂ آلام سے
آؤ لمحے چھین لیں کچھ گردشِ ایّام سے
آسماں سے خاک پر کب تک بلاؤں کا نزول
رُخ ذرا اِن کا بدل دیں لڑکے صبح و شام سے

☆

عجزِ اظہار

سرودِ دل کو کوئی ساز دوں تو کیوں کر دوں
پیامِ چشم کو الفاظ دوں تو کیوں کر دوں
کسی خطاب میں آتی نہیں ہے شوق کی بات
تمھیں کہو تمھیں آواز دوں تو کیوں کر دوں

~~~~~
~~~~~

☆

شرنارتھی

راہِ غم و بلا میں راہی نکل کے گھر سے
اک قافلہ اِدھر سے اک کارواں اُدھر سے
ٹھہریں گے وہ وہاں کیا دیکھے جہاں اُنھوں نے
نظارے وہ کہ اب تک شرمندہ ہیں نظر سے
شامِ تنک کا اُن کو کیوں کر یقین آئے
دیکھی سحر جنھوں نے شعلوں کی رہ گزر سے
جڑ سے اُکھڑ چکے جو پودے جمیں گے پھر کیا
شق ہو چکی ہے مٹی اب ابر لاکھ برسے

~~~~~
~~~~~

☆

سوغات

(لاہور جاتے ہوئے)

پھر اک تجدیدِ اُلفت کا ترانہ لے کے آیا ہوں
میں کیا آیا ہوں اک گزرا زمانہ لے کے آیا ہوں

بہ نامِ خطۂ اقبال، خاکِ میر و غالب سے
سلامِ شوق و نذرِ دوستانہ لے کے آیا ہوں

قفس دو ہو چکے تعمیر اک خاکِ نشیمن پر
میں دونوں کے لیے پھر آشیانہ لے کے آیا ہوں

کڑکتی بجلیوں میں گم نہ ہونے دو مرے نغمے
برستی بوندیوں کا اک ترانہ لے کے آیا ہوں

بہ نامِ ساقیِ دوشیں بہ یادِ بزمِ میخانہ
حرم میں دیر سے جامِ شبانہ لے کے آیا ہوں

مرے اوراقِ دل کو اب نہ یوں برباد ہونے دو
کہ میں ان میں تمھارا بھی فسانہ لے کے آیا ہوں

کبھی تو اِس کی بازارِ خرد میں کچھ بہا ہوگی
لٹانے کے لیے دل کا خزانہ لے کے آیا ہوں

مری نذرِ محبت کو نہ ادنیٰ کہہ کے ٹھکراؤ
سمجھ لو اک چراغِ آستانہ لے کے آیا ہوں

مٹالو یوں جو ختا ہو مذاقِ ناوک اندازی
اُٹھاؤ تیر میں دل کا نشانہ لے کے آیا ہوں
مجھے ٹھکرانہ پاؤ گے تمھیں اپنا بنا لوں گا
محبت کی شکستِ فاتحانہ لے کے آیا ہوں
خصومت کیا کدورت تک کہیں اس میں نہ پاؤ گے
تلاشی دل کی میں خانہ بہ خانہ لے کے آیا ہوں
ذرا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو مری جانب
میں سچ کہتا ہوں یا کوئی بہانہ لے کے آیا ہوں
فقط تھوڑا سا زمزم اس کے بدلے میں مجھے دے دو
میں گنگا کے دہانہ کا دہانہ لے کے آیا ہوں
پھر اک تجدیدِ الفت کا ترانہ لے کے آیا ہوں
میں کیا آیا ہوں اک گزرا زمانہ لے کے آیا ہوں

~~~~~
~~~~~

☆

مجبوری

کروں میں کیا جو نہ آنکھوں کو شعلہ بار کروں
کہاں سے لاؤں وہ دنیا کہ جس کو پیار کروں
گلوں کی پھیکی ہنسی سے کروں قیاسِ چمن
کہ جوشِ گریۂ شبنم کا اعتبار کروں
مرے نصیب میں آئی ہے یہ بہارِ چمن
شگوفے دیکھ لوں پھولوں کا انتظار کروں
مصافِ زیست میں کب تک سپر پہ دار و مدار
یہ جی میں ہے کہ پلٹ کر جہاں پہ وار کروں
ستم کی آگ بجھے گی نہ آنسوؤں سے کبھی
قرار چھیننے والوں کو بے قرار کروں
یہ میرے بس میں نہیں دور وسطِ صحرا سے
گلوں کو دیکھ لوں اور شکرِ کردگار کروں
مرا بھی حق ہے بہاروں پہ کچھ یوں ہی کب تک
قفس کی آڑ سے نظارۂ بہار کروں

میں بچ کے جاؤں کہاں جبر زندگی ہے یہی
شکار آپ بنوں ورنہ خود شکار کروں
میں اپنے شوق سے شعلوں کی رہ گزر پہ نہیں
جو اور راہ کوئی ہو تو اختیار کروں
حسین خوابوں سے نظریں سجا تو سکتا ہوں
حقیقتوں سے کہاں تک مگر فرار کروں

~~~~~
~~~~~

☆

دوبارہ پائمالی

مجھ کو کچھ اور پر ملال کیا
تم نے ناحق مرا خیال کیا
میں کبھی شکوہ سنج جور ہوا؟
کبھی تم سے کوئی سوال کیا؟
میں تو جا بھی چکا تھا تم سے دور
میری دوری پہ کیوں ملال کیا
مسکراتے ہوئے گزر جاتے
کیوں رکے کیوں سوالِ حال کیا
تم کو دل جوئی کی یہ کیا سوجھی
پھر وہی میرے جی کا حال کیا
زخم سے پھر ہوا لہو جاری
تم نے اچھا یہ اندمال کیا
یوں بھی کرتا ہے کوئی ہمدردی
اور جی کو مرے نڈھال کیا
آب سے اور بجھے گی رند کی پیاس؟
تم نے اس کا نہ کچھ خیال کیا

عشق کی بے کلی مٹانے کو
دوستی لائے ہو کمال کیا
پہلے ٹھکرا کے دل کو روند گئے
پھر ترحم سے پائمال کیا

~~~~~
~~~~~

☆

گھنا برگد

لٹایا نقدِ جاں اور کاغذی سکے ہی ہاتھ آئے
نہ جانے دل کی بربادی میں کتنے شکریے پائے
ہمیں محبوب سب کچھ دے کے اور وہ پا کے بھی نازاں
ہمیں ان سے اچانک مل گئیں نظریں تو شرمائے
مگر محفل کی رائج قیمتوں کی رُو سے اِس پر بھی
وہی ہشیار ٹھہرے اور ہمیں دیوانہ کہلائے
چمن کے اس گھٹے ماحول میں کیا سانس لیں غنچے
کسی بجلی کا جلدی اس گھنے برگد پہ دل آئے

~~~~~
~~~~~

☆

ضبط

دل کے شعلے ہم نگاہوں میں بجھا کر رہ گئے
لب تک آئے کچھ سخن ہونٹوں پہ آ کر رہ گئے
سن کے تنقیدِ حریفاں سب ہوئے آتش بہ پا
حضرتِ ملا ہی تھے جو مسکرا کر رہ گئے

~~~~~
~~~~~

☆

مریمِ ثانی

(ایک خط کا جواب)

مجھ سے ناراض ہو کیوں کچھ مجھے معلوم تو ہو؟
دل تمھیں دے بھی چکا تم اُسے ٹھکرا بھی چکیں
اب تمھیں میری خموشی سے شکایت کیا ہے؟
جس کے ہر تار کو خود چھیڑ کے تم توڑ چکیں
بے صدائی پہ اب اُس ساز کی حیرت کیا ہے؟

اور جو سوچو تو خموشی مری کہتی نہیں کیا
کتنے رنگوں کو چھپائے ہے یہ بے رنگیِ لب
مضطرب دن ہیں تڑپتی ہوئی راتیں اس میں
شوق کے خواب ہیں اور زیست کی ماتیں اس میں
کتنی سانسوں کے ہیں کھوئے ہوئے نغمے اس میں
کتنی نظروں کے ہیں سوکھے ہوئے چشمے اس میں
کتنی بے برسی ہوئی دل کی گھٹائیں اس میں
کتنی باتوں کی سلگتی ہیں چتائیں اس میں
یہ خموشی نہیں جیسے مرے لب تک آ کر
جم گئی ہے مرے ترسے ہوئے دل کی آواز
مجھ کو تسلیم مگر میری خموشی ہے خطا

مجھ میں یہ ظرف نہ تھا چوٹ سہوں اور ہنسوں
ہاں مگر پھر بھی تمھارے لیے زیبا تو نہ تھا
تم کرو میری خموشی کا گلا
تم نے سوچا بھی کبھی وجہ خموشی کیا ہے
جس کی نظروں سے جل اٹھتے تھے شبستاں میں چراغ
جس کے نغموں سے ہر اک ساز میں جاں آتی تھی
وہی خود شمعِ فسردہ کی طرح چپ کیوں ہے!
اور مرے ماضیِ رنگیں کی درخشاں تصویر
یک بہ یک جھاڑ کے گزرے ہوئے ایام کی گرد
آ گئی پیشِ نظر
جیسے کہرے کی سیاہی کی تہوں سے اُبھرے
کانپتی اور ٹھٹھرتی ہوئی دُھندلی دھندلی
پوس کی چاندنی رات
آ گئے سامنے ایامِ گزشتہ میرے
وہ مرا دورِ تبسّم وہ مرا عہدِ سخن
جب تعاون تھا لب و دل میں کھلی تھیں راہیں
دل کی ہر وادی سے جب تا بہ حدِ دیدہ ولب
قافلے شوق کے بے خوف چلے آتے تھے
اور نگاہوں کی تمھاری کسی لے میں ڈھل کر
میرے گیتوں میں بدل جاتے تھے
اور تمھیں دیکھ کے ہنستے ہوئے دیپک جیسے
خوں کی ہر بوند میں جل جاتے تھے
وہ امیدوں کا زمانہ وہ تمناؤں کے دن
جب تمھیں اپنی ہر اک سانس میں شامل پا کر
میں نے محسوس کیا تم سے محبت ہے مجھے

مجھ کو معلوم نہیں عشق کسے کہتے ہیں
یہ اگر قیس کے آزار کا ہے دوسرا نام
مجھ کو منظور مرے عشق کا دعویٰ باطل
مگر اک زیست کے ہر خواب تمنا کی اگر
کسی اک آنکھ سے تعبیر کا خواہاں ہونا
اپنے ہر شوق کے افسانۂ رنگین کی اگر
کسی اک نام سے زیبائشِ عنواں ہونا
دل کی ہر مہکی ہوئی ڈال سے چن چن کے اگر
اپنی امیدوں کی وہ ادھ کھلی نیلی کلیاں
اپنے ارمانوں کے وہ سرخ دہکتے ہوئے پھول
اور اک ہار میں اِن سب کو پرو کر اک بار
کسی گردن میں حمائل کرنا
اور بے مانگی نذر پہ اپنی پھر بھی
آنکھ مل جائے کسی سے تو پشیماں ہونا
اور اک جسم کے بے چین تقاضوں کے لیے
کسی آغوش کی نرمی میں تسلی کی تلاش
موجِ بے تاب کی اک امن کے ساحل کی تلاش
دل ہم درد سے آسودگیِ دل کی تلاش
اور اس زیست کے پر خار بیابانوں میں
ہاتھ اک ہاتھ میں لے کر کسی منزل کی تلاش
یہ محبت ہے تو کی میں نے محبت تم سے
اور اگر تم اسی جذبہ کو ہوس کہتی ہو
ہاں مجھے ناز ہے اس پر کہ ہوس مند ہوں میں
تم نہ مانو کہ ہے حوا کا لہو تم میں رواں
مجھ کو تسلیم کہ آدم کا جگر بند ہوں میں

اور اس جستجوئے دل کا ہوا کیا انجام
مجھ کو تم سے بھی یہ کہنا کوئی آسان نہیں
اپنے زخموں کو دکھاتے ہوئے شرم آتی ہے
تم یوں ہی خوش ہو تو کہہ لو اسے میری ہی خطا
(میں تو مدت سے ہوں اُس یاس کے عالم میں کہ اب
کسی انکار کا دم بھی مرے ہونٹوں میں نہیں)
میری تقصیر کہو یا مری تقدیر کہو
میں خیالوں میں تمھارے کوئی جا پا نہ سکا
مجھ کو محسوس ہوا جیسے تمھارے دل میں
میرے نذرانۂ اُلفت کی بہا کچھ بھی نہیں
مجھ کو دیتی ہے فقط میری تمنا دھوکا
جس کو سمجھا تھا نگاہوں میں توجہ کی چمک
وہ مرے حسن توہم کے سوا کچھ بھی نہ تھا
دل پر شوق کے ہر شوخ تقاضے کا جواب
ایک پھیکے سے تبسم کے سوا کچھ بھی نہ تھا
میرے احساس کی شدت پہ تمھارے دل میں
ایک وقتی سے ترحم کے سوا کچھ بھی نہ تھا
شک سا ہوتا تھا مجھے جس پہ گدازِ دل کا
نرم لہجے کے ترنم کے سوا کچھ بھی نہ تھا
اور جو باتوں میں تمھاری تھی وہ ہلکی سی مٹھاس
وہ بھی اک طرزِ تکلم کے سوا کچھ بھی نہ تھا

جب محبت ہو مگر ایک طرف
بے قراری ہو مگر ایک طرف

آنکھ پیمانہ لبریز مگر ایک طرف
ہر نفس نشترِ سر تیز مگر ایک طرف
آگ سینے میں دہکتی ہو مگر ایک طرف
رات آنکھوں ہی میں کٹتی ہو مگر ایک طرف
اس محبت کا جو انجام ہے وہ ہو کے رہا
اور آخر مجھے یہ بات سمجھنا ہی پڑی
تم پرستش کی طلبگار تھیں اُلفت کی نہیں
تم کسی دل کا سکوں چھین تو سکتی تھیں مگر
اپنے سینے میں خلش ہو تمھیں منظور نہ تھا
کھیل سکتی تھیں کسی اور کے شعلوں سے مگر
اپنے دل میں بھی تپش ہو تمھیں منظور نہ تھا

اور یہ جان کے جو کچھ مرے دل پر گزری
سن سکو گی نہ اُسے تم نہ میں کہہ پاؤں گا
یہ سمجھ لو کہ وہ دن اور یہ ہے آج کا دن
جب کبھی مل گئی خالق سے مرے آنکھ مری
وہ جو کچھ جھک سی گئی سوئے زمیں شرما کر
وہ نظر میری نہ تھی
خیر جیسے بھی ہوا میں نے یہ صدمہ بھی سہا
اور جیسے کسی جنگل میں درندہ کوئی
جس کو آ جاتے ہیں کچھ گھاؤ سے گہرے کاری
اور کسی غار کی تاریکی و تنہائی میں
اپنے زخموں کا لہو چاٹنے چھپ جاتا ہے
سب کی نظروں کو بچاتے ہوئے اُس محفل سے
جس کو کل تک میں سمجھتا تھا کہ دنیا ہے مری

اپنی خلوت میں دبے پاؤں چلا آیا میں
اور سو عیب سہی مجھ میں مگر میں نے کبھی
اپنے ہونٹوں کو شکایت سے نہ آلودہ کیا
تم کرو میری محبت پہ اگر شک تو کرو
ہاں جنوں میں بھی رہا پاسِ گریباں مجھ کو
میں نے اک چپ سے ہر اک آہ کا مُنہ بند کیا
دل کے ہر نالے کو دل ہی میں نظر بند کیا
اپنی نظروں کے دریچوں پہ گرائے پردے
اپنے ارمانوں کی ہنستی ہوئی شمعیں گل کیں
اور اس ظلمت و محرومی و تنہائی میں
میں نے دل سے یہ کہا بھیڑ لے سب اپنے کواڑ
اب نہ آئے گا ترے حجرۂ زنداں میں کوئی
اب جلے گا نہ دیا خانۂ ویراں میں کوئی
اپنی چھاتی پہ رکھا صبر کا بھاری پتھر
اور یہ مان لیا تم مری قسمت میں نہیں

پہلے تم اس کو مرا خبطِ دو روزہ سمجھیں
اور احباب میں ہنس ہنس کے اُڑایا بھی مذاق
میں نے اس کو بھی محبت کی سزا ہی جانا
اور خاموش رہا
کٹ رہے تھے مرے اُس وادیِ تاریک میں دن
کہ کسی اور سیاہی کے اضافے کی مجھے
اب کوئی فکر نہ تھی
شاید احساس ہوا پہلے پہل تب یہ تمھیں
تم نے برتاؤ مرے ساتھ کچھ اچھا نہ کیا

اور کچھ اپنی جفاؤں پہ پشیمان ہو کر
تم نے چاہا کہ مرے غم کی کسک دور کرو
اور پھر آ کے مرے پاس بڑی نرمی سے
میری وارفتگیٔ ہوش بجھائی مجھ کو
میری دیوانگیٔ شوق بتائی مجھ کو
اور ایامِ جہالت کی وہ بوسیدہ کتاب
دھرم کہتے ہیں جسے
جس نے انساں کو بنایا ہے خداؤں کا غلام
اُس کی ہر آیتِ فرسودہ پڑھائی مجھ کو
اور اخلاق کی دفعات میں رائج اب تک
چلی آتی ہے جو نیکی کی غلط سی تعریف
جھوٹ اور مکر پہ اس کی ہیں بنائیں قائم
اُس کا ہر تنگ نظر درس سنایا مجھ کو
اور پیروں میں پڑی ہے جو سماجی زنجیر
اُس کا ہر حلقۂ آہن بھی دکھایا مجھ کو
ان دلیلوں سے مجھے کچھ بھی تسلی نہ ملی
بلکہ اُلٹا ہی ہوا نرم ہواؤں کا اثر
تم نے جتنی ہی بجھائی بڑھتی اُتنی ہی یہ آگ
اور محسوس ہوا مجھ کو یہ رفتہ رفتہ
جیسے اب تم بھی مری آگ سے محفوظ نہیں
آخر اک روز نگاہوں میں تمھاری میں نے
تم اُسے لاکھ دباتی ہی چھپاتی ہی رہیں
پیشتر اس سے کہ پلکوں سے بجھا پاؤ اُسے
اک چمکتی سی تڑپتی ہوئی لو دیکھ ہی لی
دل کو مل ہی گئی قیمت اپنی

اب تو کچھ اور بھی گھبرا کے خود اپنے دل سے
کہیں میری ہی طرح تم بھی گنوا دو نہ سکوں
اپنے شانے سے سرکتے ہوئے ترکش سے وہیں
آخری تیر نکالا تم نے
روح کی پاک محبت کا فسانہ چھیڑا
عشق معصوم کی عظمت کے ترانے گائے
اور اُلفت کو مری جسم کا آزار کہا

تم نہ دیتیں مری اُلفت کا محبت سے جواب
گو کہ ایسا اسی دُنیا میں ہوا ہے تو سہی
مگر الزامِ ہوس تو نہ لگاتیں اس پر
جیسے فطرت کا تقاضا ہے کوئی جرمِ عظیم
جیسے دنیا ہے کسی اور کی انساں کی نہیں
عشق کے چوکھٹے میں ہو جو ہوس کی تصویر
پھر تو وہ حسن کی معراج ہے تاجِ آدم
جانِ تخلیق کی فطرت کا درخشاں مینار
عمرِ فانی کو جو دیتی ہے دوامی قدریں
ایک شہکارِ حیات
جس کے جلوؤں سے مجل ہو کے ہر اک خلدِ بریں
ٹمٹماتے ہوئے تاروں کے دیے گل کر کے
کھا کے حوروں کی عرق ریز جبینوں کی قسم
کسی تاریکیٔ افلاک میں چھپ جاتی ہے

ورثۂ آدم و حوا کا کریں گی سودا
کب تلک دھرم اور اخلاق کی جھوٹی قدریں

کب تک انسان کی لاشوں پہ یہ تعمیرِ سماج
دیے جائیں گے یوں ہی اپنے لہو کی نذریں
ابنِ آدم کی نہ جانے ابھی کتنی نسلیں
خوف و اوہام کی خود اپنے شکار
اپنے اس مورثِ اعظم سے بغاوت کر کے
اور بے رحم خداؤں کی خوشامد میں یوں ہی
ڈالتی جائیں گی اولاد کی گردن میں وہ طوق
جس سے خود جسم پہ اپنے ہیں ہزاروں نیلیں
اور یہ جرأتِ مردانہ نہ آئے گی کبھی
کہ ان افلاک کے مغرور ستم رانوں سے
چھین لیں لڑ کے وہ کھوئی ہوئی میراث اپنی
وہی فردوسِ بریں
اور پھر گاڑ دیں گردوں پہ زمیں کا پرچم
عشقِ معصوم پہ ایماں میں کبھی لا نہ سکا
بھوک انساں کی فرشتوں کی غذا سے نہ مٹی
اپنی فطرت کی یہ توہین گوارا نہ ہوئی
اک تصور کی حسیں اور سنہری دنیا
تیرگیِ دلِ مضطر کا مداوا نہ ہوئی
اور روحوں کی ملاقات سے خوابوں میں فقط
جسمِ بیدار کی تسکینِ تمنا نہ ہوئی
اور ایسا مجھے محسوس ہوا
جیسے اک کوزہ گرِ پیر نے از راہِ مذاق
تم کو چینی سے تو مٹی سے بنایا مجھ کو
تم مرے رنگِ گِل سے متنفر ہی رہیں
اور نظروں سے اُجل کر بھی تمہاری افسوس

اپنے اِس پیکرِ خاکی کو میں چمکا نہ سکا
گل رنگیں کہیں دُھلنے سے بھی ہوتا ہے سفید
تم اُتر کر نہ کبھی میری زمیں پر آئیں
میں تمھارے فلکِ پاک تلک جا نہ سکا
خوں کی ہر بوند میں فطرت کے پیامات اِدھر
عظمتِ ترکِ تمنا کی حکایات اُدھر
گرمیِ شوق اِدھر اور خنک آیات اُدھر
دل کے نالے اِدھر اور روح کے نغمات اُدھر
اک ترازو میں یہ دونوں کہیں تُل سکتے تھے
یہ وہ سکے تھے جو تبدیل نہ ہو سکتے تھے

آخر اس کرب کی جب لا نہ سکا تاب میں اور
اپنی ناکامیِ پیہم سے میں خود ڈر سا گیا
اور آیا یہ خیال
مجھ کو یہ ضبطِ مسلسل ہی مٹا دے نہ کہیں
سانس رُک رُک کے نفس ہی کو جلا دے نہ کہیں
شوق بجھ بجھ کے نظر ہی کو بجھا دے نہ کہیں
خون جم جم کے رگوں ہی کو گلا دے نہ کہیں
اور یہ سوچ کے ناچار بہ صد حسرت و یاس
اپنے شانوں پہ لیے اپنی تمناؤں کی لاش
پھر اُسی کلبۂ احزاں کے سیہ خانے میں
پھر اُسی وادیِ خاموش کے ویرانے میں
منحرف ہو کے امیدوں کی بہاروں سے بھی ہاں
پھیر کر آنکھ خود اپنے ہی ستاروں سے بھی ہاں
دُور اُس نور سے جو شعلہ ہی شعلہ تھا فقط

اپنی تاریکیٔ خلوت میں پلٹ آیا میں
تم نے اُس دن سے نہ لی آج تلک میری خبر
نہ کبھی حال ہی پوچھا، نہ کوئی خط نہ پیام
میں یہ سمجھا کہ مجھے بھول گئیں

اور اب اتنے برس بعد یکایک اک بار
اپنے بیمار محبت کی تمھیں یاد آئی
اور کچھ شکوۂ بے مہری و خاموشی بھی
طنزیہ تم نے کیا
جیسے یہ گردشِ ایام کوئی چیز نہیں
اور اُن سالوں کا جو دُور گزارے تم سے
کٹ گئیں لمحوں میں جب صدیوں کی صدیاں اکثر
دل کی دنیا پہ اثر کچھ بھی نہیں
مجھ سے عمرِ گزراں لے بھی چکی اپنا خراج
خاکِ دل ہو بھی چکی ریت میں کب کی تبدیل
اب کوئی گل ہے نہ غنچہ نہ کوئی برگ نہ بار
نہ تمنا کی گھٹا ہے نہ امیدوں کی نسیم
نہ نگاہوں میں فسانے ہیں نہ ہونٹوں پہ سرود
دل پہ ہر وقت ہے اک عالمِ ہو سا طاری
اک دھندلکا سا جو شب ہے نہ سحر اور جس میں
چند ٹوٹی ہوئی قبروں کے سرہانے خاموش
یاد بیٹھی ہے مگر پونچھ چکی ہے آنسو
کیا سے کیا ہو گیا میں اور تصور میں مرے
تم بھی اب وہ نہ رہیں
اور اِس مدتِ مجبوری و تنہائی میں

دل میں جو نقشِ تمنا تھے مٹائے میں نے
بیل پتر اپنی عقیدت کے چڑھا کر تم پر
پھول سب اپنی محبت کے ہٹائے میں نے
اور اب
دل کے مندر کا دیا بن نہ سکیں تم تو تمھیں
کسی آکاش کے تاروں میں جگہ دے بھی چکا
ایک عورت کے سنگھاسن سے گرا کر تم کو
کسی دیوی کی طرح طاق پہ بٹھلا بھی چکا
مجھ سے اب پہلی اُلفت کا تقاضا نہ کرو
شاخِ افسردہ سے پھولوں کی تمنا نہ کرو
دل میں اب کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں

اور اب تم کو محبت کی ضرورت کیا ہے؟
تم تو موجوں سے نظر پھیر چکی ہو تو تمھیں
کسی طوفاں کے نظارے کی تمنا کیوں ہے؟
جب کہ پہلو میں دبائے ہو تم اک دل کی جگہ
کسی کیلاش پہ صدیوں کا جما پارۂ برف
کیوں کسی مہر کی کرنوں سے حرارت مانگو
جب عوض خوں کے رگوں میں ہے رواں گنگا جل
آرتی کیوں کسی آلودہ نظر سے چاہو
تم تو روحوں کی فضاؤں میں ہو اُڑنے والی
مجھ سے اک خاک نشیں سے تمھیں نسبت کیا ہے
تم ہو اس دور کی جب مریمِ ثانی تو تمھیں
اک گنہگار کے سجدوں کی ضرورت کیا ہے
دل تمھیں دے بھی چکا تم اُسے ٹھکرا بھی چکیں

اب تمھیں میری خموشی سے شکایت کیا ہے

آؤ تصویر کو اب میری نظر سے دیکھو
دل میں اب تک جو دبی تھی وہ صدا بھی سن لو
تم نے چھیڑا ہے یہ قصہ تو سناتا ہوں تمھیں
اپنے احساس کا اظہار ہے شکوا یہ نہیں
اور شکوا بھی اگر ہے تو کوئی بات نہیں
جس نے کھو کر تمھیں سب کھو دیا اُس کے لب سے
ہو سکے تم سے تو تھوڑا سا گلہ بھی سن لو

تم نے خود پھونک کے اک شمعِ فروزاں گُل کی
تم نے خود چھین لی ہنستے ہوئے ہونٹوں سے ہنسی
تم نے نغموں کا گلا گھونٹ کے بے دردی سے
میرے جلتے ہوئے ہونٹوں پہ لگا دی خود مہر
اب میں خاموش اگر ہوں تو شکایت کیا ہے
جس کے بس میں ہو کہ اک دل کی تڑپ دور کرے
شمعِ کشتہ کو جو چاہے تو فروزاں کر دے
آنسوؤں کو جو ستاروں سے بدل سکتا ہو
مگر ایسا نہ کرے
اور اک جھوٹے سکوں کے لیے قرباں کر دے
وہی دل جس نے کہ مٹ کر بھی اُسے یاد کیا
پھر وہ اس دہر کی چھائی ہوئی تاریکی کا
پھر وہ اس زیست کی بے کیفی و بے رنگی کا
پھر وہ اک خاطرِ مایوس کی خاموشی کا

آہنی قلب میں جس کے نہیں کچھ بھی نرمی
وہ کسی اور کی بے مہری کا چرچا نہ کرے
دل تمھیں دے بھی چکا تھا تم اسے ٹھکرا بھی چکیں
اب تمھیں میری خموشی سے شکایت کیا ہے؟
مجھ سے ناراض ہو کیوں۔ کچھ مجھے معلوم تو ہو!

~~~~~
~~~~~

☆

"دوستانہ مشورہ"

جناب ملا کروں میں کچھ عرض آپ اس کی جو دیں اجازت
کلام اپنا بہ لحن پڑھنے کی کیوں اٹھاتے ہیں آپ زحمت
گلے میں ہے آپ کے جو سرگم کوئی نہیں اِن سروں سے واقف
سمجھنے والا ہی جب نہیں ہے تو فن دکھانے کی کیا ضرورت

"خاتمہ"

زندگی آہی گئی ختم پہ اپنی ملا
اب میں خاموش ہوں نغموں کا مرے دَور نہیں
یا مرے دل میں نہیں کوئی نیا افسانہ
یا مرے ہونٹوں میں کہنے کی سکت اور نہیں

~~~~~
~~~~~

☆

"شکایت"

مرے پھولوں کو جو رونده وه میرا کارواں کیوں ہو
مرے تارے نہیں جس میں وه میرا آسماں کیوں ہو
کہیں بھولے سے جس میں نام تک میرا نہیں آتا
تمھاری ہو تو ہو لیکن وه میری داستاں کیوں ہو
مرے 'صم صم' سے کھلتے ہیں دلوں کے بند دروازے
تمھارے در پہ پھر مشقِ سجودِ رائگاں کیوں ہو
مرے گوہر سلامت ہیں تو گاہک آپ آئیں گے
غمِ کج بینی و بد ذوقیِ بازارگاں کیوں ہو
پیامِ دل مرا ملا سا پاتا نہیں جس میں
وه اک محفل کی ہو چاہے مگر میری زباں کیوں ہو

~~~~~
~~~~~

☆

"ایک دوست کے نام"

تم سے مل کر وہ سکوں مجھ کو ملا دیر تلک
یاد اک بھولنے والے کی بھی تڑپا نہ سکی

تم ہو چھائے ہوئے اُس گوشۂ دل پر میرے
جس کے پھولوں کو ہوا غم کی بھی کمھلا نہ سکی

"قانون کی تعریف"

یہ حق کا تحفظ ہے نہ آئیں کا اجارا
مجرم کے لیے قہر نہ بے کس کا سہارا

قانون کی تعریف حکومت کی لغت میں
طاقت کے نشے میں کوئی بہکا سا اشارا

☆

"شبیہ دارا"

کل مجھ سے یہ فرمانے لگے ایک منسٹر
طاقت ہے مری اور ہے قانون تمھارا
لہجے میں رعونت کی کھنک سی دمِ گفتار
جس طرح کہ ذرّے سے مخاطب ہو ستارا
پھر نرگسِ سرشار کو چمکا کے یہ بولے
قانون بھی میرے خمِ ابرو کا اشارا
یہ سن کے جو تھی قبلِ ملاقاتِ سکندر
نظروں میں مری پھر گئی وہ صورتِ دارا

~~~~~
~~~~~

☆

آہٹ

نہ کوئی طائر ہی نغمہ زن ہے نہ کوئی پتی ہی ہل رہی ہے
فضا میں جیسے کسی بڑی سانحہ کی آہٹ سی مل رہی ہے
دلِ بشر پر خود اپنی طاقت سے ایک ہیبت سی چھا رہی ہے
سکوت اک خوف کا ہے طاری حیات سہمی سی جاری ہے
نہ مسکراہٹ نہ لب پہ نغمہ نہ ہم نوائی نہ غم گساری
دلوں پہ تالے سمجھ پہ پردے نظر میں تلخی زباں میں ترشی
ہر ایک آئینہ جگر پر غلاف شک کی چڑھی ہوئی ہے
ہر ایک راہِ حیات پر اک فصیلِ نفرت کھڑی ہوئی ہے
بشر میں نرمی نہیں تو اُس کی تباہ کاری کی حد نہیں ہے
خرد جدا ہو گئی جو دل سے تو پھر جنوں ہے خرد نہیں ہے
حیات اور مرگ کے دوراہے پہ آج پھر لشکرِ بشر ہے
کدھر قدم اب اٹھیں گے اس کے یہ منحصر اس سوال پر ہے
نمو کی طاقت ابھی دلوں میں ہے یا اسے زیست کھو چکی ہے
ضمیرِ انساں میں آنچ باقی ہے یا یہ لو سرد ہو چکی ہے

~~~~~
~~~~~

☆

نقادوں سے

کہیں ہے احباب کی پرستش کہیں ہے پاسِ گروہ بندی
ادب میں ہم عصر ناقدوں کی نظر کبھی مستند نہیں ہے
پیمبر شعر کس طرح مان لے کسی ہرزہ گو کو ملا
ابھی بجا ہیں حواس اُس کے ابھی زوالِ خرد نہیں ہے
خلوصِ دل سے وہ اہل فن کے کمال کا معترف رہا ہے
خراجِ تحسیں دیا ہے سب کو کسی سے اُس کو حسد نہیں ہے
مگر وہ رکھتا ہے رائے اپنی وہ خود پرکھتا ہے اہلِ فن کو
نظر میں اُس کی کسی کی شہرت کمالِ فن کی سند نہیں ہے

تازہ غزلیں

☆

ساحل نہ صدا دے مجھ کو کہ میں آسودۂ طوفاں ہو بھی چکا
اے چشمِ کرم تکلیف نہ کر دل خوگرِ حرماں ہو بھی چکا
ہر سبزہ و گل کی نس نس میں اک ریشۂ جنباں ہو بھی چکا
اب کون مٹا سکتا ہے مجھے میں خاکِ گلستاں ہو بھی چکا
بے رنگیِ گلشن کیا تجھے دیں سینہ خالی نظریں ویراں
جو کچھ بھی نگاہ و دل میں تھا تاراجِ بہاراں ہو بھی چکا
مُنہ زور ہیں کچھ گندے نالے اور خاکِ چمن سوکھی سوکھی
کیا جانے کہاں برسی یہ گھٹا سنتے ہیں کہ باراں ہو بھی چکا
اک آخری ماتم باقی ہے یہ بھی کر لے بزمِ ہستی
تاریخِ جہاں میں خاتمۂ افسانۂ انساں ہو بھی چکا
پیمانِ وفا پھر باندھیں گے دو دل اور پھر توڑیں گے اسے
سو بار یہ پیماں ہوگا ابھی سو بار یہ پیماں ہو بھی چکا
اہلِ گلشن کی تسکیں کو یہ نعرۂ نو ہے گلچیں کا
پھولوں کی بھی باری آئے گی کانٹوں پہ تو احساں ہو بھی چکا
یہ منزلِ غم طے ہو بھی چکی اے دیدۂ نم بس رہنے دے
وہ سیرِ چراغاں کر بھی چکے، میں لالہ بداماں ہو بھی چکا
اظہارِ تمنا مشکل ہے تو سب کے لیے مشکل ہوتا
یہ کیا کہ مجھے مشکل ہی رہا دنیا کو یہ آساں ہو بھی چکا

لوہے کی سلاخیں ویسی ہی، دیوارِ زنداں اب بھی وہی
اک جامِ رہائی پی بھی چکے اور جشنِ اسیراں ہو بھی چکا
انسان کے دل کی لو کو مگر راس آتی نہیں نیکی کی ہوا
جنت میں دیا تک جل نہ سکا دوزخ میں چراغاں ہو بھی چکا
کیوں بیٹھے ہو ملا جاؤ محفل میں تمھارا کوئی نہیں
ہر کلمۂ تحسیں یاروں کا میراثِ حریفاں ہو بھی چکا

~~~~~
~~~~~

☆

لیے خوشبو ہر میخانہ آیا
ترے لب چھو کے جو پیمانہ آیا

اندھیرے میں کوئی تارا نہ آیا
جو کام آیا چراغِ خانہ آیا

میں محوِ بندگی تھا اور شیطاں
نہ جانے دل میں کب دزدانہ آیا

یہ راہِ گلستاں کیسی ہے جس میں
پسِ ویرانہ پھر ویرانہ آیا

سبو پھیرے ہیں جاموں سے نگاہیں
مقامِ جرأتِ رندانہ آیا

میں چپ اور وہ بھی چپ اے انجمن لے
ترے ہاتھ اور اک افسانہ آیا

غزلخواں سے تو رقصاں جام و مینا
ڈھلی شب رنگ پر میخانہ آیا

حدِ پروانگی سے بڑھ نہ پایا
محبت میں جسے جینا نہ آیا

قدم نظروں سے آگے بڑھ رہے ہیں
سوادِ کوچۂ جانانہ آیا

نہ ہو جولاں گہ واعظ یہی راہ
ہر اگلے موڑ پر میخانہ آیا
خرد نے جب فضا تاریک کردی
شعاعِ دل لیے دیوانہ آیا
وہی ملا وہی ذکرِ محبت
چراغِ کشتہ کا پروانہ آیا

~~~~~
~~~~~

☆

یہ دل آویزیِ حیات نہ ہو
اگر آہنگِ حادثات نہ ہو
تیری ناراضگی قبول مگر
یہ بھی کیا بھول کر بھی بات نہ ہو
زیست میں وہ گھڑی نہ آئے کہ جب
ہات میں میرے تیرا ہات نہ ہو
ہنسنے والے رُلا نہ اوروں کو
صبح تیری کسی کی رات نہ ہو
عشق بھی کام کی ہے چیز اگر
یہی بس دل کی کائنات نہ ہو
بات شیریں لبی میں گم ہو جائے
اس قدر تہ بہ تہ نبات نہ ہو
کون اُس کی جفا کی لائے تاب
گا ہے گا ہے جو اِلتفات نہ ہو
کوئی راضی نہیں ہے سننے کو
صُلح اور دوستی کی بات نہ ہو
نام اسی کا مگر ہے زندہ دلی
رات بھی آئے جب تو رات نہ ہو
عشق ہی کو یہ بات آتی ہے
باتیں ہو جائیں اور بات نہ ہو

زیست بے کیف ہو کے رہ جائے
غم اگر بادۂ حیات نہ ہو
یہ تبسم ہی تیرے لب کا کہیں
رازِ تخلیقِ کائنات نہ ہو
رند کچھ کر رہے ہیں سرگوشی
ذکرِ ملائے خوش صفات نہ ہو

~~~~~
~~~~~

☆

جنوں کا دور ہے کس کس کو جائیں سمجھانے
اِدھر بھی ہوش کے دشمن اُدھر بھی دیوانے

کرم کرم ہے تو ہے فیضِ عام اس کا شعار
یہ دشت ہے وہ گلستاں سحاب کیا جانے

کسی میں دم نہیں اہلِ ستم سے کچھ بھی کہے
ستم زدوں کو ہر اک آرہا ہے سمجھانے

بشر کے ذوقِ پرستش نے خود کیے تخلیق
خدا و کعبہ کہیں اور کہیں صنم خانے

اُلجھ کے رہ گئی حسنِ نقاب میں جو نظر
وہ حسنِ جلوۂ زیرِ نقاب کیا جانے

اس ارتقائے تمدن کو کیا کہوں ملا
ہیں شمعیں شوخ تر آوارہ تر ہیں پروانے

~~~~~
~~~~~

☆

ترک ہر رسم کرو وجہ یہ کافی تو نہ تھی
نگہِ شوق خطا تھی مگر ایسی تو نہ تھی
اُٹھ گئی آپ نظر آنکھ ملائی تو نہ تھی
بھول کہہ لو اسے دانستہ گناہی تو نہ تھی
آکے میخانے میں رندوں سے اُلجھنا واعظ
اور جو کچھ بھی ہو شائستہ مذاقی تو نہ تھی
نگہِ لطف بدلنے کا یہ ہنگام نہ تھا
لب پہ آنے کو ہنسی تھی ابھی آئی تو نہ تھی
محتسب ٹھیک تو ہی میں ہی غلط سے ہے حرام
غم میں دو گھونٹ مگر بادہ گساری تو نہ تھی
ایک مجبورِ محبت کی وفاؤں پہ نہ جا
دلِ عاشق کی بہانیم نگاہی تو نہ تھی
آکے دیکھا درِ ساقی سے تو یہ راز کھلا
حرم و دیر میں ایسی کوئی دُوری تو نہ تھی
لطفِ احباب سے کچھ مٹ تو گئی تختیِ زیست
اِس میں ہاں وہ تری آغوش کی نرمی تو نہ تھی

خوش نہ ہو حسن محبت نے وفا کی بھی تو یہ
کاہلی ذہن کی تھی دل کی غلامی تو نہ تھی

پیتے پیتے ہی تو پیتا میں یہ زہراب کے گھونٹ
اشک آنکھوں میں تھے ساغر میں صبوحی تو نہ تھی

ہاں یہ ملا کو ملی ناز مگر کیا کرتا
مسندِ عدل ترے در کی گدائی تو نہ تھی

~~~~~
~~~~~

☆

پھر اِن گردوں نشینوں کو زمیں کی بات کہنے دے
انھیں پہلے ذرا زیرِ فلک کچھ روز رہنے دے

مرا قصّہ ہی سننا ہے تو کیوں سن غیر کے لب سے
مجھے اپنی طرح میں کہہ سکوں جیسے بھی کہنے دے

جہاں کے غل میں دبنے دے نہ آوازِ ضمیر اپنی
جہاں تک ہو سکے کانوں میں یہ آواز رہنے دے

تجھے مردِ یقیں یہ ساحلِ آسائی مبارک ہو
مجھے شک ہی کی ہمت آزما موجوں میں بہنے دے

لگا کر لب سے رکھ لوں گا بھرم تیرا میں اے ساقی
مرے آگے بھی خالی ہی سہی اک جام رہنے دے

بہت دلچسپ تقریرِ مسلسل ہے تری ناصح
مگر کب تک سنے جاؤں مجھے بھی کچھ تو کہنے دے

غمِ جاناں اجازت دے بدل لوں ذائقہ منہ کا
ترا کیا ہرج ہے اِس میں غمِ دوراں بھی سہنے دے

قدم رکھ شوق سے تپتی ہوئی راہِ حقیقت پر
مگر اک کہکشاں بھی سامنے نظروں کے رہنے دے

یہ شب باشوں کی بزمِ نغمہ و مے ہے یہاں ساقی
حقیقت کون سنتا ہے کوئی افسانہ کہنے دے

ہوائے تازہ سے رنداں نشیں اتنا ہراساں کیوں
کوئی دیوارِ بوسیدہ اگر ڈھتی ہے ڈھنے دے

محبت مرہمِ دردِ دلِ انساں تو بن جائے
مگر ذہنِ بشر انساں کو جب انسان رہنے دے

غمِ دل کہہ نہ آنکھوں سے نہ آہوں سے نہ اشکوں سے
نہ جی کھو کر نہ بت بن کر تنگ ظرفوں کو کہنے دے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا بھلا کیا ہے برا کیا ہے
بدل اے دورِ نو قدریں مگر پہچان رہنے دے

دیے جا خاص اپنا رنگ ہر تخلیق کو ملا
نہ اِس کی فکر کر دُنیا کو جو چاہے وہ کہنے دے

~~~~~
~~~~~

☆

جانِ افسانہ یہی کچھ بھی ہو افسانے کا نام
زندگی ہے دل کی دھڑکن تیز ہو جانے کا نام

کیا بتاؤں آہ بزمِ میکشاں کو کیا ہوا
تیر سا لگتا ہے اب سن لوں جو میخانے کا نام

زیست سے آنکھیں ملانے سے نہ روکیں وہ ہمیں
زندگی جن کی ہے خوابوں سے بہل جانے کا نام

آج تُو، کل اور کوئی ہوگا صدرِ بزمِ مے
ساقیا تجھ سے نہیں ہم سے ہے میخانے کا نام

تابِ ناکامی نہیں تو آرزو کرتا ہے کیا
آرزو ہے موج کے ساحل سے ٹکرانے کا نام

تھے گرفتارِ قفس اب ہیں اسیرِ آشیاں
شاید آزادی ہے بس زنداں بدل جانے کا نام

طاقِ دیں ہو بزمِ دانش ہو حریمِ حسن ہو
گفتگوے زیرِ لب کی جاں ہے دیوانے کا نام

معبدِ انساں بنے کیسے یہ ضد ہر دل میں ہے
اِس کی پیشانی پہ ہو میرے ہی بتخانے کا نام

خوش نہ ہو خود چن کے اک اچھا سا نام اپنے لیے
اور جو دُنیا کل بدل دے تیرے افسانے کا نام

اک ہنسی تو وہ، جو ہے اشکوں سے وقتی سا فرار
اک ہنسی ہے انتہائے غم پہ آجانے کا نام
شعر ملا ہے اندھیروں میں اجالوں کی تلاش
فکر ملا ہے ستارے توڑ کر لانے کا نام

~~~~~
~~~~~

میری حدیثِ عمرِ گریزاں

(1963)

بکھری پڑی ہے ان وادیوں میں
میری حدیثِ عمرِ گریزاں

انتساب

آنے والے کل کے نام

میرے سر میں ابھی ملا یہ خلل باقی ہے
آج گم نام ہوں لیکن ابھی کل باقی ہے
نقشِ پا سے مرے روشن نہ سہی راہِ ادب
میری تابانیٔ کردار و عمل باقی ہے

یہ ہفت و سی سال کی کہانی
یہ ایک تاریخِ زندگانی
بشر کی منزل، بشر کی راہیں
وطن کے نغمے، وطن کی آہیں
کچھ اپنا غم، کچھ غمِ جہاں ہے
یہاں سے آغازِ داستاں ہے

کچھ اپنے پڑھنے والوں سے!

اس مجموعہ کو پڑھنے کی زحمت کرنے والے حضرات! تسلیم

آپ میں سے کچھ میرے دوست ہوں گے۔ کچھ جان پہچان والے اور کچھ اجنبی۔ لیکن آپ سب اس بات پر حیران ہوں گے کہ مجھے یہ خط لکھنے کی کیا سوجھی۔ اگر کچھ کہنا ہی تھا تو ایک سیدھا سادا مقدمہ کیوں نہ شامل کردیا اور یہ عجیب طریقہ کیوں اختیار کیا۔ میں تو اس سوال کا جواب صرف یہی دے سکتا ہوں کہ مقدمہ کی زبان اور ہوتی ہے اور خط کی زبان اور۔ میں تصنع اور تکلف کا پردہ اٹھا کر آپ کے قریب آکر ان بے ساختہ الفاظ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جن کی گنجائش ایک رسمی مقدمہ نہیں کیوں کہ مقدمہ کسی نہ کسی حد تک دانستہ طور پر یا غیر دانستہ طور پر انشا پردازی کی نذر ہوجاتا ہے۔ اور ایسے سوچے سمجھے انداز بیان میں خلوص باقی نہیں رہتا۔

یقین مانیے کہ مجھے یہ خط لکھنا بھی دشوار ہورہا ہے۔ میری عمر تک پہنچتے پہنچتے انسان کچھ قدروں کو اس طرح گلے سے لگا لیتا ہے کہ ان سے انحراف آسان نہیں ہوتا۔ آج بھی مجھے اپنے بارے میں کچھ کہتے ہوئے یا لکھتے ہوئے بڑی ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے کیوں کہ زندگی بھر کی تہذیبی اور معاشرتی روایات یکا یک بھلائی نہیں جاسکتیں۔ مجھے سمجھایا جاتا ہے کہ یہ قدریں پرانی ہوچکی ہیں اور اس خود مشتہری کے دور میں اگر کوئی فنکار کوئی مقام حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے یہ خالی جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو مکمل طور پر بے نقاب کرکے دنیا کے سامنے پیش کرے۔ یہ اور بات ہے کہ میں آج بھی یہ مشورہ ماننے کو تیار نہیں۔ نہ معلوم کتنے دوست ہیں جو مجھے برابر بہ صد اصرار یہ ترغیب دے

رہے ہیں کہ میں اپنی سوانح عمری ضرور لکھوں اور میں ہوں کہ ان لوگوں کی خود اعتمادی (غالباً خود پرستی کہنا زیادہ موزوں ہوتا) پر حیران رہ جاتا ہوں جو اپنے حالات زندگی لکھ نہیں رہے ہیں بلکہ تصنیف و تخلیق فرما رہے ہیں۔ اپنی شخصیت کو خود اس حد تک اہمیت دینا میرا مزاج کسی طرح قبول نہیں کرتا۔ اپنے بارے میں کچھ لکھنا اسی کو زیب دیتا ہے جو اپنی زندگی کو پردۂ راز سے باہر لاکر خالی اپنے چہرے کے خدوخال یا اپنے دل و دماغ کی کشمکش ہی پیش نہیں کرتا بلکہ اپنے دور کی انسانی تاریخ کے کسی نہ کسی پہلو کی بھی ایک حد تک نمائندگی اور ترجمانی کرتا ہے، لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج تک تو میرا تجربہ یہی ہوا ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی کے واقعات پیش کررہے ہیں وہ بجائے نقاب اتارنے کے اپنی پسند کی نقاب پہن کر سامنے آتے ہیں اور یہ خودنوشت داستانیں پڑھنے والوں کو بجائے راہ دکھانے کے اور زیادہ گمراہ کردیتی ہیں۔ ان داستانوں کا رشتہ حقیقت سے بہت کمزور ہوتا ہے اور میں اس قسم کے داستان گویوں کی برادری میں شامل ہونے کو تیار نہیں۔

آپ پوچھیں گے کہ اگر میں اپنی حقیقی یا تصنیف کردہ کہانی سنانے کو تیار نہیں تو پھر یہ لمبا چوڑا خط لکھنے کیوں بیٹھا ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے زمانے کے تقاضے سے یہ سمجھوتہ کرلیا ہے کہ میری نجی زندگی میری ہے لیکن میری ادبی زندگی ان سب کی جو اسے جاننا چاہیں۔ ایک بات یہاں صاف کردینا چاہتا ہوں تاکہ کسی غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہ جائے۔ میں اپنی نجی زندگی سے خالی یہی نہیں کہ شاکی اور شرمندہ نہیں بلکہ پورے طور پر مطمئن ہوں۔ لیکن میری نظروں میں نجی زندگی ایک طہارت رکھتی ہے اور میں خود اس طہارت کو آلودہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کسی فنکار کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس کی نجی زندگی کی واقفیت بھی بہت اہم چیز ہے، لیکن زندگی کی یہ چھپی ہوئی تصویریں صرف ایک نگاہ آشنا، کے سامنے پیش کی جاسکتی ہیں ''نگاہ تماشہ بیں'' کے سامنے نہیں۔ یوں بھی میری کتاب زندگی میں کوئی چور باب نہیں بلکہ میں تو یہ بھی کہنے کی جرات کروں گا کہ میرے قول و عمل میں اور میری زندگی میں کبھی کوئی نمایاں تضاد رونما نہیں ہوا۔ مجھے زندگی نے ''جنون و خرد'' کے دوراہے پر لاکر کھڑا نہیں کیا بلکہ میرے جنوں کو خرد ہی نے پالا اور پروان چڑھایا۔ میری زندگی اور میری شاعری دو الگ الگ خانوں میں رکھ دینے والی چیزیں نہیں۔ میرے نزدیک آج دنیا اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں صرف اس دیوانے کی سماج میں گنجائش ہے جس کی دیوانگی پرور[illegible]د ہے اور وہ دیوانگی جس کے رشتے خرد سے ٹوٹ چکے ہیں حیات انسانی کے لیے مضر ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''جنون وخرد'' کا جو مفہوم میرے ذہن میں ہے وہ یہاں پیش کردوں۔ یہ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کیوں کہ میں نے اپنے اکثر اشعار میں جنوں کو خرد پر ترجیح دی ہے اور بہ ظاہر یہ میرے اوپر والے بیان کی تردید کرتا ہے۔ جنون دو قسم کا ہوتا ہے ایک وہ جو کسی مشترکہ انسانی مفاد کے آگے اپنا ذاتی مفاد نہیں دیکھتا بلکہ کسی ایسے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ دوسرا جنوں وہ ہوتا ہے جو نراج (Anarchy) چاہتا ہے اور جو اپنی ذاتی آرزوئیں اور اغراض پوری کرنے کے لیے سماج اور اخلاق کی صالح پابندیوں کو زنجیریں سمجھتا ہے اور انھیں توڑ کر اپنے انفرادی تقاضے پورے کرنے کی کوشش کرتا ہے، پہلی قسم کا جنون ایک شریف آدمی کے دل میں پرورش پاتا ہے، دوسری قسم کا جنون ایک بیمار غیر متوازن ذہن میں۔ میں نے جس جنون کو سراہا ہے وہ پہلی قسم کا جنون ہے نہ کہ دوسری قسم کا جنون۔

شاید اس توضیح سے آپ یہ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میرے نزدیک بڑے سے بڑے فنکار کو بھی پہلے ایک شریف ذمہ دار انسان اور شہری بننا ضروری ہے۔ میں صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں۔ میری رائے میں کسی فنکار کا قد اس کے انسانی قد سے زیادہ اونچا نہیں ہوسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے نقاد اور فنکار میری اس رائے سے متفق نہ ہوں گے۔ لیکن مجھے تو اپنا نظریہ پیش کرنا ہے۔ مجھے اوروں کے سوچنے کے طریقوں سے کیا مطلب۔ ہاں یہ اختلاف ایک بات کو ضرور واضح کرتا ہے۔ یا تو یہ اختلاف کرنے والے خلوص کو ادب عالیہ کا لازمی جز و تسلیم کرنے کو راضی نہیں یا پھر ان کے نزدیک ادبی خلوص انسانی خلوص سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ شاید ان کے نظریے میں انسان کا فن اور انسان کی زندگی دو الگ الگ چیزیں ہیں اور انھیں اس میں کوئی تضاد یا سقم نظر نہیں آتا کہ وہی فن کار فن میں ڈاکٹر (Doctor jeckyl) بن کر سامنے آتا ہے جو زندگی میں قدم قدم پر مسٹر ہائڈ (Mr. Hyde) کی یاد دلاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شاعری کا مقام میرے ذہن میں ہے۔ وہ شاعری کو بھی رقص، موسیقی، سنگ تراشی یا اداکاری وغیرہ کی طرح محض ایک فن سمجھتے ہیں اور میں شاعر کو صرف فن کار نہیں سمجھتا بلکہ دانائے راز اور پیمبر بھی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک کوئی شاعر یا افسانہ نگار نوع انسان سے بے پناہ محبت کیے بغیر عظیم نہیں ہوسکتا اور نہ ادب عالیہ پیش کرسکتا ہے۔ نوع انسان سے اس طرح محبت کرنے والا اجتماعی مفاد کو انفرادی آسودگی پر قربان کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا اور اس کی زندگی اور پیام میں کبھی کوئی اس قسم کا تضاد پیدا نہیں ہوسکتا۔

خلوص کا ذکر چھڑ ہی گیا تو ایک بات اور عرض کردوں۔ میرے نزدیک اگر ادب میں خلوص نہیں تو وہ انتہائی تخلیقی حُسن کے باوجود بھی تاریخ ادب میں کوئی بلند مقام نہیں پاسکتا، چاہے وقتی طور پر اس کا جمالیاتی کیف دلوں کو مسحور کرلے۔ مجھے یہ احساس ہے کہ میرے اس نظریے سے بھی اختلاف کرنے والے زیادہ ہوں گے اور اتفاق کرنے والے کم۔ زیادہ تر لوگوں کا نظریہ تیوفیل گاٹیے (Theophile Gautier) کے اس قول میں ملے گا:

''اصل حقیقت حُسن ہے اور فن کار کا یہی دین و ایمان ہونا چاہیے۔ اس کو اس کے علاوہ اور کسی چیز کی حاجت نہیں۔ اسے اخلاق تک کی ضرورت نہیں اس واسطے کہ حسن میں اخلاق بھی شامل ہے۔ بھلا یہ کون کہہ سکتا ہے کہ حسین چیز میں، چاہے وہ عورت ہو، موسیقی ہو یا پھول ہو اس میں اخلاق موجود نہیں ہوتا۔''

میں تو صرف یہی کہوں گا کہ اتنی کم زور اور کم وزن دلیل کی مثال مشکل ہی سے ڈھونڈی جاسکتی ہے لیکن جو لوگ زندگی کو فرد کی آسودگی اور لذت پرستی ہی سمجھتے ہیں وہ یقیناً اس دلیل سے قائل ہوجائیں گے۔ ٹالسٹائے نے 1896ء میں اپنی ڈائری میں لکھا تھا:

''انتہائی جمالیاتی کیف ہمیں کبھی پوری آسودگی نہیں بخشتا۔ ایک درد مند انسان کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ وہ مکمل آسودگی صرف اس ادب سے پاتا ہے جو صالح ہو اور انسان کے اخلاق کو بلند کرے۔''

ایک نظریے نے تیوفیل گاٹیے کے افسانوں کو جنم دیا۔ دوسرے نظریے نے ٹالسٹائے کے کارنامے پیش کیے۔ اب یہ آپ کی پسند ہے کہ آپ تکیے کے نیچے گاٹیے کی کتاب رکھیں اور اس کے افسانے پڑھ کر جنسی نفسیات پر غور کریں یا ٹالسٹائے کو پڑھ کر انسانی دکھ درد کے بارے میں سوچیں۔ میرا اپنا عقیدہ تو یہی ہے کہ جس ادب میں انسانی درد کی آواز نہیں وہ زیادہ سے زیادہ ذہنی عیاشی کے لیے سامان فراہم کرسکتا ہے لیکن دل و دماغ کی تربیت نہیں کرسکتا۔ کلام میں تاثیر خلوص سے پیدا ہوتی ہے اور عظمت انسانی درد کی آواز شامل کرنے سے۔ وہی شاعر ادب عالیہ پیش کرسکتا ہے جس میں یہ دونوں باتیں موجود ہوں۔ ممکن ہے کہ غلط قدروں کو اپنا کر آج ہم دھوکا کھا جائیں اور کسی مصنوعی یا روایتی پینترے

ہی کو شاعر کے کلام کا آئینہ دار سمجھ لیں لیکن اس فریب کا جادو زیادہ دنوں تک چلنے والا نہیں اور اگر ہم جان بوجھ کر یہ فریب کھاتے بھی رہے تب بھی ہماری اولاد یہ فریب ہرگز نہ کھائے گی۔ تاریخ ادب میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ ہم عصر نقادوں نے کسی شاعر کو ادب کی سب سے اونچی چوٹی پر جگہ دی لیکن بعد کی نسلوں نے اسے خالی کوہِ ادب سے گرایا ہی نہیں بلکہ اسے کسی گمنام وادی میں دفن کردیا۔ ایک شاعر کی دو مائیں ہوتی ہیں۔ ایک اس کا اپنا درد۔ دوسری آنے والی نسلیں۔ دیوکی کا بچہ، کرشن اوتار اسی وقت بنتا ہے جب اس کی دوسری ماں، جسودھا اسے اپنی آغوش میں اٹھالیتی ہے۔ شاعر کی اصل ماں اس کی دوسری ماں ہی ہوتی ہے کیوں کہ یہی اس کو زندۂ جاوید بناتی ہے۔ یہی اس کے مزار کی، ہمہ وقت بیدار رہ کر پاسبانی کرتی ہے اور اپنے بعد اپنی اولاد کو یہ خدمت سپرد کر جاتی ہے اور یہی اس کی قبر پر کبھی نہ بجھنے والے چراغ جلاتی اور کبھی نہ مرجھانے والے پھول چڑھاتی ہے۔

میں نے ادب عالیہ کا نام کئی بار لیا ہے لیکن ابھی تک میں نے یہ نہیں بتایا کہ ادب عالیہ سے میری کیا مراد ہے۔ میری رائے میں وہی ادب، ادب عالیہ کہلائے جانے کا مستحق ہے جو پائندہ انسانی قدروں کا حامل ہو، جو انسان کے سفر میں اس کے ساتھ ساتھ چلے اور اس طرح نسلاً بعد نسلٍ طفل انسان کے لیے سرمایۂ نشاط و تسکین بنا رہے اور اسے ذہنی اور جذباتی آسودگی بخشتا رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ادب نوع انسان کے لیے ہوتا ہے، صرف اس کے ایک چھوٹے یا بڑے گروہ کے لیے نہیں ہوتا۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ فن کار جہاں نظریوں میں گھر جاتا ہے اس کے دل کے سوتے محدود ہو کر خشک ہونے لگتے ہیں اور اس کی قوتِ تخلیق اپنی معصومیت حُسن اور وسعت کھونے لگتی ہے۔ اس کے رشتے نوع انساں سے باقی نہیں رہتے بلکہ خالی ایک گروہ سے رہ جاتے ہیں۔ اس کے لہجے میں اس گروہ کے خلاف جس سے وہ اتفاق نہیں کرتا کچھ نہ کچھ تلخی اور درشتی بھی آجاتی ہے اور اکثر تو وہ رفتہ رفتہ اس مقام تک بھی آجاتا ہے کہ اس مخالف گروہ کو مٹا دیا جائے تاکہ وہ گروہ جس کو وہ انسانیت کا صحیح نمائندہ قرار دیتا ہے اپنی منزل مقصود کی طرف بغیر کسی رکاوٹ کے گامزن ہو سکے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس کے اس نظریہ میں اور ان (Jesuits) کے نظریے میں جو گنہگاروں کی روح بچانے کے لیے ان کو ہر قسم کی اذیت دینے کے بعد قتل کردیتے تھے کس قدر حیرت انگیز مشابہت ہے۔ میں تو اس فن کار کو عظیم فن کار سمجھتا ہوں جو نوع انسان کی اکائی بن کر انسانی درد و غم سہے اور اس غم کا مکمل علم اور احساس ہونے کے باوجود اس کی ذات میں اتنی لوچ اور اس کے فن میں اتنی سکت ہو کہ وہ اس زہر کو امرت بنا

کر پی جائے، اپنے دل و دماغ کی معصومیت تازگی اور حُسن کو برقرار رکھے اور پھر دانائی کی چوٹیوں سے کل نوعِ انسان کو جس میں گمراہ انسان بھی شامل ہوں ایک طفل معصوم کے میٹھے اور سُریلے بولوں میں پکارے اور منزلِ انسانیت کی طرف قدم بڑھانے کا پیغام دے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر کو پیغمبری ملتی ہے اور جہاں اس کا فن نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے۔ میرے نزدیک انسانیت کے درد کا مداوا دل کی تہذیب و تربیت میں مضمر ہے نہ کہ ذہن کی بڑھتی ہوئی واقفیت میں، اور دل کی تہذیب و تربیت محبت ہی سے ہو سکتی ہے تشدد اور نفرت سے نہیں۔

اتنا تو اب آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ میری ادبی قدریں رائج قدروں سے بہت مختلف ہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں صحیح ہوں اور خلاف رائے رکھنے والے غلط۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ خود اپنی جگہ پر سوچیں اور اپنی رائے قائم کریں۔ اس دور کی ایک بہت بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم اپنا ذہن دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں اور جس نظریے کی اشاعت اور تبلیغ بہتر ہوتی ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ آج نقاد، نقاد کم ہیں اور (Publicity Agents) زیادہ۔ میں اپنی رائے ظاہر کر چکا۔ میرا کسی نہ کسی حد تک شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے نظریے کو ترجیح دینا قریب قریب لازمی ہے۔ ایک فن کار مشکل ہی سے اچھا نقاد ہوتا ہے کیوں کہ وہ ایک فریق ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے ایک جج کے فرائض انجام دینا آسان نہیں۔ میں اپنی مواقفت میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے متنازعہ سوالات پر اپنے دل کو جذبات سے خالی کر کے عقلی سطح پر غور کرنے کی تھوڑی بہت عادت ضرور ہے پھر بھی مجھے سین بوو (Saint Beuve) کا یہ مقولہ نہیں بھولتا:

> ''کسی صاحب طرز شاعر یا انشا پرداز کے لیے اچھا نقاد ہونا دشوار ہے۔ نقاد کا خود کوئی فنی اسلوب نہیں ہونا چاہیے ورنہ لازمی طور پر اس کی توجہ اپنے ہی اسالیب کی برتری پر رہے گی، چاہے وہ لاکھ کوشش کرے کہ ایسا نہ کرے۔''

شاید آپ مجھے ایک صاحب طرز شاعر تو تسلیم کر لیں گے۔ میں ممکن ہے کہ اچھا شاعر نہ ہوں لیکن اس میں غالباً شک نہ کیا جائے گا کہ میری فکر میری ہے میرا انداز بیان میرا ہے میری زبان میری ہے، اور میرا لہجہ میرا ہے وہ میرے اشعار ہوں یا میرے فیصلے، میری تقریر ہو یا تحریر میں نے ان سب پر اپنی انفرادیت کی مہر لگا دی ہے۔ میں نے ہمیشہ ہر سوالِ زندگی کا حل خود سوچا ہے لہٰذا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ادبی تخلیقات کو بھی میں اپنے ہی میزان میں تولنا چاہتا ہوں اور بازار کے باٹوں سے کام لینا نہیں

چاہتا۔ میں تو آپ کو بھی مشورہ دے رہا ہوں۔تنقید کا فن خالی مشکل ہی نہیں بلکہ بڑے سے بڑا نقاد اگر وہ ایمان دار ہے، یہ تسلیم کرے گا کہ اس میں ہر قدم پر بھٹک جانے کا امکان ہے۔ اصل مشکل یہ ہے کہ تنقید کے کوئی اصول مرتب نہیں اور ہر نقاد آخر میں محض اپنے ذوق اور نظریوں کا سہارا لے کر فیصلہ صادر کرتا ہے۔ آج زندگی کے عقلی اور جذباتی تصورات اس تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں کہ آئے دن ادبی نظریے ابھرتے ہیں اور پھر مٹ جاتے ہیں کیوں کہ ان کی جگہ دوسرے نظریے لے لیتے ہیں۔ ان متضاد نظریوں کو لیجیے۔ (1) وطن پرستی یا انسان پرستی (2) فرد کی مکمل آزادی یا انجمن سازی کے لیے فرد کی آزادی پر مناسب بندشیں (3) انقلاب یا ارتقا(4) عقل یا عقیدہ پرستی (5)لذتیت اور جمالیاتی کیف یا صالح اقدار اور افادیت۔ دیکھیے ان میں سے کسی کو اپنانے سے آپ کی ادبی قدریں کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گی۔

یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر کوئی نقاد کسی شاعر کی تخلیقات کو پسند کرتا ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ نقاد اور شاعر کی قدریں بہت کچھ مشترک ہیں اور اس شاعر کی تعریف کر کے وہ دراصل ان قدروں کی اشاعت اور تبلیغ کرتا ہے جن پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہی شاعر کسی نقاد کی فہرست میں عظیم فن کاروں میں ملتا ہے اور دوسرا نقاد اسے قابل ذکر بھی نہیں سمجھتا۔ میں اپنے بارے میں جانتا ہوں کہ اس دور کے بہت سے نقاد جب موجودہ ادب کا جائزہ لیتے ہیں اس وقت جان کے حافظے سے میرا نام اس طرح غائب ہوجاتا ہے جس طرح چینی نقشوں سے میک ماہن لائن (Macmahan Line) بعض دوسرے نقاد نام تو لیتے ہیں لیکن چونکہ میری قدریں مختلف ہیں، وہ مجھے گمراہ سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے ایک عزیز دوست کی تنقید پیش کروں گا۔ میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی ادبی دیانتداری کا احترام کرتا ہوں کہ انھوں نے میرے دوست ہوتے ہوئے بھی اپنے نظریاتی اختلاف کو مروت پر قربان نہیں کیا اور اپنی قابل قدر کتاب ''جدید شاعری'' میں میری نظم ''گمراہ مسافر'' پر تنقید کرتے ہوئے یہ ارشاد کیا:

> ''ملا صاحب کی اس نظم میں سماجی اور تاریخی شعور موجود ہے لیکن دولت کی مساوی تقسیم سے انھوں نے جو شکوہ کیا ہے وہاں کچھ جذباتیت آگئی ہے اور یہ بات ملا صاحب کی صرف اس نظم میں نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری میں اکثر جگہ یہ کیفیت ملتی ہے کہ وہ کسی مخصوص نظام کے قائل نہیں ہوتے۔ وہ

انسانیت پرستی کی منزل تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ محبت کا پیام بھی دیتے ہیں لیکن کسی مخصوص نظام کا سہارا نہ لینے کی وجہ سے ایک واضح نقطۂ نظر کی کمی ان کے یہاں برابر محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ترقی پسند سمجھتے ہیں اور اس کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن ترقی پسندوں پر جگہ جگہ برستے بھی ہیں۔ وہ انسانیت کے تو قائل ہیں، لیکن ان نظریات کو اہمیت نہیں دیتے جن کے بطن سے انسانیت پرستی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ تضاد کی یہ کیفیت ملا صاحب کی شاعری میں ضرور نظر آتی ہے۔ ویسے ان کی نظریں سماجی اور معاشرتی موضوعات کی گہرائیوں تک جاتی ہیں کیوں کہ وہ حالات کا صحیح شعور رکھتے ہیں۔''

آپ نے دیکھا کہ انسان جب سیاسی نظریات ہی کو انسانی نظریات سمجھنے لگتا ہے تو وہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بہت سے سوالات کا جواب تو میں صرف ایک لفظ 'چین' کہہ کر دے سکتا ہوں۔ اگر وہ ہندوستان میں ہوتے تو شاید ان سے کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی کیوں کہ ان کی باریک بین نظر اس مہیب اور خونی چہرے کو جو 'تقسیم مساوی' کی نقاب میں پوشیدہ ہے خود بہ خوبی دیکھ لیتے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس اقتباس میں بہت سے مفروضات ہیں جو نگاہ استدلال کی تاب نہیں لا سکتے۔ ایک یہی لے لیجیے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک انسان دوستی کا واضح نقطۂ نظر ہونا یا نہ ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ کوئی اشتراکیت پر ایمان لاتا ہے یا نہیں۔ مجھ میں اور چاہے جو بھی خامیاں ہوں لیکن میرے ذہن میں نہ تو کوئی الجھاؤ ہے اور نہ کہیں جالے لگے ہیں۔ دلیلوں کی سیڑھیوں پر چڑھ کر بلندی تک پہنچنا شاید مجھے اکثر لوگوں سے کچھ زیادہ ہی آتا ہے کیوں کہ میں نے ساری زندگی یہی کام کرتے گزاری ہے۔ اور یہی تربیت مجھے یہ کہنے سے روکتی ہے کہ میں یقیناً صحیح ہوں اور عبادت صاحب یقیناً غلط۔ میں ڈاکٹر صاحب سے صرف یہ عرض کروں گا کہ انھوں نے مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی ورنہ ان کو کوئی تضاد نظر نہ آتا۔ وہ خود چوں کہ اپنے نظریے کے شکار ہیں لہذا وہ کسی اور نظریے کی تاب نہیں لا سکتے۔ میرے نزدیک کوئی سیاسی نظریہ انسانیت کی مکمل نمائندگی نہیں کر سکتا اور انسانیت کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے صرف اشتراکیت ہی ایک راستہ نہیں۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کوئی بھی نظام جس کی تبلیغ تشدد اور نفرت سے کی جائے وہ انسانیت کی راہ میں رہزن ہے

رہبر نہیں۔ اس نظریے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ اشتراکیت پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص واضح نقطۂ نظر نہیں رکھتا کسی قدر تنگ دلی اور کم نظری ظاہر کرتا ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت سے ہوش مند اور سلجھی ہوئی ذہنیت رکھنے والے انسان ایسے بھی ہیں جو لال جھنڈے کو سلامی نہیں دیتے اور انسان دوستوں کے اس گروہ میں کبھی ایک چھوٹا سا گمنام شخص گاندھی بھی تھا۔

میری نظر میں زندگی ایک دریا ہے جس کے نہ آغاز کا پتہ ہے نہ انجام کا۔ نوع انسان اس دریا کے دونوں کناروں پر نسلاً بعد نسل بیٹھتی چلی جارہی ہے اور یہ دریا آگے بڑھتا چلا جارہا ہے۔ دریا اور دریا کے کناروں کی تصویر ہر آنکھ میں مختلف طور پر ابھرتی ہے کیوں کہ دیکھنے والے کو تو صرف وہی نظر آتا ہے جو اپنے مقام سے وہ دیکھ سکتا ہے۔ صرف کچھ نظریں اتنی بینا ہوتی ہیں جو بہت دور تک دیکھ سکتی ہیں لیکن وہ بھی دریا کی مکمل تصویر نہیں دیکھ پاتیں۔ نظریاتی اختلافات کی بنیاد یہی وجہ ہے۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ حقیقت سے صرف وہی آشنا ہے لیکن ہر ایک کی حقیقت الگ الگ ہے اور وہ بھی پوری حقیقت کا ایک بہت چھوٹا سا جزو۔ زندگی ہم سب سے ہر لحظہ ٹکرا رہی ہے لیکن ہمارے خیالات اور نظریات کا انحصار اِس پر ہے کہ ہم کس ذہنی سطح پر یہ ٹکر لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب میرے معروضات پر غور کریں گے تو شاید اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

نظریات کی ان آویزشوں سے ہٹ کر ادب کو پرکھنے کا ایک آسان طریقہ اور بھی ہے۔ سترھویں صدی کے ایک فرانسیسی نقاد لابروئے (La Bruyere) نے کہا تھا:

''جب تم کوئی کتاب پڑھو اور اس سے تمھاری روح میں بلندی جرات اور شرافت کے جذبات پیدا ہوں تو پھر اس کی خوبی کو جانچنے کے لیے کسی اور معیار کی حاجت نہیں (ڈاکٹر یوسف حسین کی کتاب فرانسیسی ادب سے اقتباس) میرے نزدیک اس معیار کو آج تین سو سال بعد بھی بغیر کسی پس و پیش کے قبول کیا جاسکتا ہے۔ ایک ذہن صالح ادب سے یہی تقاضا کرتا ہے اور جو ادب اسے یہ چیزیں دیتا ہے وہی اسے ذہنی اور جذباتی آسودگی بخشتا ہے۔ یہ تو غالباً آپ تسلیم کریں گے کہ ہر پڑھنے والا ادب سے یہی چاہتا ہے کہ وہ اس کی آسودگی کا سامان فراہم کرے۔ لیکن چوں کہ ہر شخص کا ذوق جداگانہ ہوتا ہے اس لیے کوئی شاہکار ادب بھی سب کو آسودگی نہیں بخشتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ذہن صالح کی قید لگادی ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ میں کس کو ذہن صالح کہتا ہوں اور کسے ذہن بیمار۔ میں تو اپنی ہی قدروں کے سہارے اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔ میں اس ذہن کو صالح قرار دیتا ہوں جو

انسانیت کی ایک اکائی بن کر سوچتا ہے، جو اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ انسانی فطرت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ تعلیم و تربیت سے نفس امّارہ پر قابو پا سکتی ہے، جو انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں اور جس کا یہ مقصد ہے کہ اس کرۂ خاک پر ایک ایسا نظام رائج ہو جس میں انسان آزادی، شادمانی، اور امن کے ساتھ اپنی پسند کی اجتماعی اور انفرادی زندگی بسر کر سکے اور جس وقت تک یہ مقصد حاصل نہ ہو اس وقت تک اس نظام کو لانے کے لیے اپنی بساط بھر کوشش کرے۔ بیمار ذہن وہ ہے جس کے سامنے کوئی انسانی مقصد نہیں، جو صرف اپنی ذات میں محصور ہے اور جو وقتی لذت اور جنسی آسودگی کو زندگی کی سب سے اہم قدر سمجھتا ہے اور اسے یہی شکایت ہے کہ وہ جنسی آزادی سے اپنے لذت طلب تقاضوں کو پورا کرنا چاہتا ہے دنیا اسے اتنی آزادی کیوں نہیں دیتی۔ آسودگی تو دونوں قسم کے ذہن چاہتے ہیں اور غالباً اس پر بھی دونوں متفق ہیں کہ اعلیٰ درجے کی فنی تخلیق بغیر دل میں بغاوت کا جذبہ پیدا کیے وجود میں نہیں آتی۔ لیکن ایک کی مراد آسودگی سے وہ معراج کیف ہے جو جذبات کو طہارت بخشتی ہے، شعور کو بیدار کرتی ہے اور روح میں ولولہ اور امنگ پیدا کرتی ہے اور دوسرے کے نزدیک اس قسم کی لذتیت جو دل و دماغ کو آلودہ کرتی ہے اور جو وقتی تسکین (جس میں ایک تھکن بھی ہوتی ہے) دینے کے بعد ایک نیند طاری کر دیتی ہے۔ میں اس شاعر یا ادیب کو جسے بدی پر نیکی کی آخری فتح میں یقین نہیں چاہے وہ کتنا ہی بڑا فن کار کیوں نہ ہو وہ اونچا مقام نہیں دے سکتا جو میں انسانی مستقبل میں یقین رکھنے والے بڑے فن کار کو دینے کو تیار ہوں۔ جس حقیقت پر امیدوں کے خواب نہیں وہ انسان اور فن کار دونوں کی شکست ہے حقیقت نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں فاکنر (Faulkner) کو ہمنگوے (Hemingway) پر اور فرانسو امور یاک (Francois Mauriac) کو آندرے زید (Andre Zaide) پر ترجیح دیتا ہوں۔

بات حقیقت نگاری تک آ گئی ہے تو میں اس کے بارے میں بھی اپنا نظریہ پیش کر دوں۔ ادب میں حقیقت نگاری زندگی کا عکس پیش کرنا نہیں بلکہ زندگی کے راز بے نقاب کرنا ہے۔ اس میں پس منظر، منظر سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ حقیقت اور ادبی حقیقت میں وہی فرق ہے جو واقعات نگاری اور تاریخ میں ہے یا فوٹوگرافی اور مصوری میں۔ فن کار محض منظر نہیں دکھاتا بلکہ منظر کو آڑ بنا کر اپنا پیام سناتا ہے۔ اس منظر کی نوعیت شاعر کا ذوق انتخاب کرتا ہے جتنی ہی زیادہ منظر اور پس منظر میں ہم آہنگی ہوگی اتنی ہی زیادہ فن کار کو کامیابی نصیب ہوگی۔ دیکھنا یہ ہے کہ حقیقت نگاری کا یہ ذوق فن کار کو زندگی

کے کن کن پہلوؤں کو بے نقاب کرنے پر مائل کرتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ مان لوں گا کہ زندگی کا کوئی پہلو چاہے وہ کتنا ہی تاریک کیوں نہ ہو ایسا نہیں جسے بے نقاب کر کے ایک صالح پیام نہ دیا جاسکتا ہو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی خیال میں رکھنی چاہیے کہ جتنا ہی زیادہ تاریک پہلو ہے اتنی ہی زیادہ اس کی بے نقابی کے لیے ایک بڑے فن کار کی ضرورت ہے جو خالی بڑا فن کار ہی نہ ہو بلکہ بڑا انسان بھی ہو۔ جب تک کہ کوئی بڑا انسانی مقصد ذہن میں نہ ہو اس وقت تک اس بے نقابی کو عریاں نگاری کی کثافت سے بچانا ممکن نہیں۔ معلوم نہیں آپ کی کیا رائے ہے لیکن میں تو بہ صد افسوس اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ معدودے چند فن کاروں کو چھوڑ کر اکثر شعرا اور افسانہ نگار حقیقت نگاری کے نام پر ایک نئے قسم کی فحاشی اور ابتذال کو ادب کہہ کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ بات میں خالی اپنے ادب میں نہیں پاتا بلکہ مغربی ادب میں بھی موجود ہے اور ہمارے ادب سے کہیں زیادہ موجود ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آج ہماری زندگی اتنی تیز رفتار اور ناقابل اعتبار ہوگئی ہے کہ انسانوں کا ایک اچھا خاصا گروہ ہر لحظۂ زیست کو غنیمت سمجھنے لگا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ جو کچھ لذت حیات اسے حاصل کرنی ہے وہ فوراً حاصل کر لے ورنہ آنے والا لحہ اسے یہ فرصت بھی دے یا نہ دے۔ پچھلی دو عالمی جنگوں نے اور انسان کی تباہ و برباد کرنے کی بڑھتی ہوئی واقفیت اور طاقت نے اس کے عقاید کی بنیادیں ہلا ڈالی ہیں اور وہ تہذیب کے اس ضبط سے جو اس نے صدیوں میں اپنی جبلت (Instincts) پر کسی حد تک قابو پا کر حاصل کیا تھا آج پھر باز گشت کرتا معلوم ہوتا ہے اور ہر نظام اخلاق کو ٹھکرا کر اپنی انفرادی تشنگی کی سیرابی کا جویا نظر آتا ہے۔ لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے آج بھی انسانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت دنیا میں ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کرنا چاہتی ہے جس میں انسان اپنے پورے قد پر پہنچ سکے اور ایک پر امن اور صالح تمدن اور معاشرت وجود میں آئے۔ مجھے نام نہاد حقیقت نگاروں سے یہی شکایت ہے کہ یہ تصویر کا صرف ایک رخ کیوں دیکھتے ہیں۔ انسان کے دل میں شیطان بھی ہے اور فرشتہ بھی۔ لیکن یہ کس قسم کی حقیقت نگاری ہے جو جب دل میں جھانکتی ہے تو شیطان ہی نظر آتا ہے اور فرشتہ ہمیشہ کسی تاریک گوشے میں چھپا رہ جاتا ہے۔ دوزخ اور جنت دونوں کے دروازے ایک ہی کنجی سے کھلتے ہیں لیکن یہ فن ہمیشہ دوزخ کا ہی دروازہ کیوں کھولتے ہیں اور کبھی بھول کر جنت کا دروازہ کیوں نہیں کھولتے۔ صفائی میں یہ کہا جاتا ہے کہ بدی کے ایسے مکروہ اور بھیانک منظر پیش کر کے فن کار انسان کے ضمیر کو جھنجوڑنا چاہتا ہے تاکہ نیکی کی غافل قوتیں بیدار ہوں اور اس بدی کا مقابلہ کریں۔ یہ صفائی اگر صحیح ہو تو یہ فن کار کی عظمت کی دلیل ہوسکتی ہے۔ لیکن اس دعوے کی صحت یا

عدم صحت کا انحصار فن کار کی نیت پر نہیں بلکہ اس تاثر پر ہے جو عام طور پر پڑھنے والے کا ذہن قبول کرتا ہے۔ زیادہ تر تو یہی دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کی حقیقت نگاری، پڑھنے والے کے ضمیر کو بیدار کرنے کے بجائے اس کے اعصاب میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ حقیقت نگار دانستہ یا نادانستہ طور پر بادلیر (Baudlaire) کے اس قول پر کہ ''حسن کی بہترین تصویر شیطان کی ذات ہے'' ایمان رکھتے ہیں اور جس وقت وہ اس قسم کی حقیقت نگاری کرتے ہیں وہ اپنے نزدیک تخلیق حُسن کی اونچی سے اونچی بلندی چھو لیتے ہیں گو زبان سے علانیہ طور پر اپنے عقیدے کا اظہار نہیں کرتے۔ ایسا ادب نابالغ ذہنوں کی غذا ضرور بن جاتا ہے لیکن بنیادی طور پر اس میں اور فحاشی میں چاہے درجے کا فرق ہو قسم کا فرق نہیں۔

اس قسم کا ادب میرے نزدیک ایک مریض ذہن کی علامت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فن کار رفتہ رفتہ اپنے ذاتی ردِ عمل ہی کو زندگی کی سب سے اہم قدر سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ہی دل میں ناخن چبھو چبھو کر خون نکالتا ہے اور اپنی ہر تخلیق میں یہی رنگ بھرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا اپنا غم ہی اس کی کائنات بن جاتا ہے۔ میں داخلیت کے خلاف نہیں کیوں کہ میرے خیال میں داخلیت کلام کو خلوص بھی دیتی ہے اور تاثیر بھی۔ یہ فن کار اور قاری میں ایک دلی رشتہ قائم کر دیتی ہے جو پیام پہنچانے میں آسانیاں پیدا کرتا ہے اور جو صرف خارجیت سے کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن داخلیت اسی وقت تک حُسن ہے جب تک اس کے رشتے خارجیت سے استوار ہیں۔ میرے نزدیک عظیم شاعری دراصل خارجیت اور داخلیت کو ایک ساتھ سمونے کا ریاض ہے اور جو یہ گر جانتا ہے وہی اعلیٰ درجہ کا ادب تخلیق کر سکتا ہے۔ ایک بڑا فن کار دنیا کے واقعات اور حادثات سے تاثر قبول کرتا ہے لیکن وہ اس تاثر کو فوراً ہی پیش نہیں کرتا۔ وہ اسے اپنے ذہن و دل میں پرورش دیتا ہے۔ اس سے کبھی لڑتا ہے کبھی اس کو اپناتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے دل کی آواز بن جاتا ہے اور پھر وہ اسے اپنے جذبات اور احساسات کی تھرتھراہٹ اور اپنے شعور کی رفعت اور عظمت دے کر زبان پر لاتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک داخلیت زدہ ذہن دنیا سے بھاگ کر اپنے دل میں پناہ لیتا ہے اور شعور کے بجائے اپنے وجدان ہی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔ ممکن ہے کسی زمانے میں ادب میں یہ دونوں راہیں مقبول ہوں لیکن آج کی دنیا میں اس قسم کی شدید داخلیت کو ذہنی ناہمواری ہی قرار دیا جائے گا۔ مجھے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کو اس بات میں مطلق کوئی دلچسپی نہیں کہ کسی فن کار کا ذاتی ردِ عمل کیا ہے اور اس کی

نسوں میں بہنے والے خون کا رنگ سفید ہے، کالا ہے، یا سنہری جب تک کہ وہ ردعمل اس کے اپنے احساسات سے مناسبت نہ رکھتا ہو یا جب تک کہ وہ جوئے خوں اس کے اپنے زخموں سے نہ پھوٹی ہو۔ اس قسم کی داخلیت جو ایک فن کار کے دل کی برہنگی کے سوا کچھ اور نہیں کسی صاحب ذوق کو مشکل ہی سے پسند آسکتی ہے کیوں کہ وہ محبوب جسے چشم خریدار کو متوجہ کرنے کے لیے بے لباس ہونے کی ضرورت پڑے حسین نہیں ہوسکتا۔

میں نے ابھی تک جو کچھ کہا ہے اس سے آپ یہ نتیجہ نہ نکال لیجیے گا کہ میں نفسیاتی شاعری یا عشقیہ شاعری کے خلاف ہوں۔ انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کو بغیر اچھی طرح سمجھے ہم انسانی ارتقا کا کوئی صحیح تصور نظر کے سامنے نہیں لاسکتے اور نہ اس طرف بڑھ سکتے ہیں۔ وہ نفسیاتی شاعری جو ہمیں انسانی فطرت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے ادب کی اونچی چوٹیوں کو چھو لیتی ہے لیکن جو محض ایک فن کار کا ذاتی ردعمل پیش کرتی ہے اس کی ادب میں کوئی خاص اہمیت نہیں۔ ایسا انفرادی ردعمل دنیا کو اپنی زندگی کا جز نہیں معلوم ہوتا اور وہ اسے فن کار کی ذاتی ذہنی ساخت سے تعبیر کر کے مسکراتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ ''آپ بیتی'' میں جان جبھی آتی ہے جب اس میں ''جگ بیتی'' بننے کی صلاحیت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عشق کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے بھی عشقیہ شاعری کو اس شاعری سے جسے میں انسانی شاعری کا نام دیتا ہوں، ایک کمتر درجے کی چیز سمجھتا ہوں۔ عشقیہ شاعری زیادہ سے زیادہ اس گروہ پر اثر انداز ہوسکتی ہے جس پر خود بھی وہ حالات گزرے ہوں اور جس کے دلوں میں وہ کیفیات طاری ہوئی ہوں جن کا ذکر شاعر نے کیا ہے اور اس طرح ایک ''درد یکساں'' کا رشتہ قائم کرسکتی ہے۔ لیکن وہ آواز جو دنیا کے درد کو اپنا کرنا انصافیوں اور ناہمواریوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دیتی ہے اور امن و سکون اور عافیت کی منزلوں کی طرف کاروان انسان کو قدم بڑھانے کی جرات دلاتی ہے وہ اپنے نغموں کو ایک ''درد مشترک'' کی تھرتھراہٹ سے معمور کردیتی ہے اور اس طرح اس میں آفاقیت اور پائندگی دونوں چیزیں آجاتی ہیں۔ میری رائے میں ''درد یکساں'' درد مشترک کا ہم پلہ نہیں مگر آپ کی رائے مختلف ہوسکتی ہے۔

اب ایک اور پہلو سے اسی سوال پر غور کیجیے۔ یہ تو آپ تسلیم کریں گے کہ ادب میں عشقیہ شاعری کی اس سے زیادہ اہمیت نہیں ہوسکتی جتنی عشق کی زندگی میں ہے۔ زندگی میں عشق کا کیا مقام ہے؟ میں یہ مان لوں گا کہ بھوک اور پیاس کے بعد جنسی آسودگی انسان کی فطرت کا سب سے بڑا اور اہم تقاضا

ہے۔ لیکن کیا عشق اور جنسی تقاضا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں؟ آپ شاید یہ کہیں کہ ایک مہذب اور متمدن انسان جنسی آسودگی کے ساتھ جذباتی آسودگی بھی چاہتا ہے اور اس دوہری آسودگی کے تقاضے کو عشق کہا جاسکتا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے تب بھی زندگی کے کسی ایک تقاضے کو زندگی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ عشق انسان کی زندگی کا صرف ایک تابناک رُخ ہے اور اس کا تعلق ایک فرد کی نجی زندگی سے ہے، اجتماعی زندگی سے نہیں۔ زندگی میں عشق محض ایک مقام ہے، منزل نہیں۔ میں نے یہ خیال اپنے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے:

بس اتنی فرصتِ الفت ہے جہد زیست میں جیسے
کسی ساحل پہ دم لینے کو موجِ بے قرار آئے

آپ اس شخص کو کیا کہیں گے جو عشق ہی کو زندگی کی سب سے بڑی قدر سمجھ لے اور جس کی آرزوئیں صرف ''پریم کی چھت ہو، پریم کے آنگن، پریم کے ہوں سب دوار'' ہی کے خواب دیکھیں۔ ایسا شخص مجنوں اور فرہاد کا جانشین تو بن سکتا ہے لیکن سماج کے لیے ایک ناکارہ انسان ہے کیونکہ اس کا ''پریم نگر'' دنیا کے لیے کوئی سامان تسکین و مسرت فراہم نہیں کرتا۔ دنیا کو تو وہ ''پریم نگر'' چاہیے جہاں انسان ایک دوسرے کو پیار کرے۔ زندگی دن کی عرق ریزی ہے، رات کی اشک افشانی نہیں۔ کسی مقصد کی طلب میں ایک مسلسل جہد ہے۔ اپنی ناکامیوں پر نالہ وفریاد کر کے ہمدردی حاصل کرنا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ شدت غم میں دوچار بار ہونٹوں تک فغاں بھی آجائے لیکن زندگی بھر صرف دل کا دکھڑا رونے والا فن کار یا تو خود فریب میں مبتلا ہے یا دوسروں کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ یا پھر اس کی عشقیہ شاعری محض روایتی ہے جو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ ایسی شاعری کے بارے میں گستاو فلابیر (Gustave Flaubert) نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا تھا:

''اپنی ذات کو غنائیت کا موضوع بنانا قابل رحم ہے۔ اگر ایک دفعہ کوئی چیخ مارے تو بات سمجھ میں آتی ہے نہ کہ مستقل طور پر یہی انداز ہوجائے۔ بائرن (Byron) کے یہیں بڑی غنائیت ہے لیکن اس کا وجود شکسپیر (Shakespeare) کی غیر شخصی شاعری کے سامنے جو مافوق انسانی معلوم ہوتی ہے، ماند پڑجاتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ (Shakespeare) اپنی زندگی میں مسرور تھا یا مغموم۔ فن کار کا مقصد حُسن ہونا چاہیے نہ کہ پبلک میں مقبولیت حاصل کرنا (ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔

فرانسیسی ادب میں)"

مجھے شاید اپنا نظریہ واضح کرنے کے لیے اب اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پھر بھی ایک مثال پیش کروں گا جو میری رائے کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اگر خالی داخلی قدروں ہی کی بنا پر عظمت کا انحصار ہوتا تو آج میر اور مومن کو غالب سے اونچا مقام دیا جاتا۔ آج غالب کی روز افزاں قدر و مقبولیت کیا یہ ثابت نہیں کرتی کہ جب تک فن کار خارجی دنیا سے رشتے قائم نہیں کرتا اس وقت تک وہ داخلیت کی اونچی سے اونچی بلندی پر پہنچنے کے بعد بھی آنے والی نسلوں کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔

عشقیہ شاعری کے سلسلے میں غزل کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ صنف غزل سے متعلق میرے ذہن میں نہ جانے کتنی باتیں ہیں کیوں کہ میں نے صنف غزل کی نوعیت، ادبیت، جمالیت، اور افادیت پر بہت کچھ سوچا ہے اور اپنے نظریات کے تحت کچھ نئے تجربے بھی کیے ہیں۔ یہ خط یوں ہی کافی طویل ہو چکا ہے اور مجھے اس کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ میں اجمالاً بھی ان نظریات کے بارے میں کچھ کہوں۔ بات میں بات نکلتی چلی آئی اور میں ان باتوں میں کچھ اس طرح الجھتا چلا گیا کہ اپنی تنگ دامانی بھول گیا۔ اب یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اسے قلم زد کر کے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے وسعت پیدا کرلوں۔ کسی رائے میں بغیر دلیل کے وزن نہیں آتا لیکن یہ بھی دل گوارا نہیں کرتا کہ غزل پر بغیر کچھ کہے آگے بڑھ جاؤں۔ شاید آپ کو یہ ناگوار نہ ہو کہ رائے تو میں اس خط میں پیش کر دوں اور دلیلوں کو دوسرے خط پر اُٹھا رکھوں۔

غزل سے متعلق یگانہ مرحوم نے اپنے مکاتیب میں کچھ باتیں کہی ہیں جن سے میں پوری طور پر متفق ہوں۔ معصوم رضا راہی نے کچھ اقتباسات اپنے مضمون "یاس عظیم آبادی" (مطبوعہ اردو ادب، علی گڑھ) میں یکجا کردیے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

"(1) میرا کلام میری زندگی کے عین مطابق۔

(2) میں نے صرف حقائق سے محبت کی ہے۔

(3) یگانہ آرٹ ایک تعمیری ادب ہے۔ کوئی تفریحی مشغلہ یا عیش پرستی کا آلہ کار نہیں۔

(4) حُسن و عشق کو یگانہ نے اپنی شاعری کا خاص موضوع نہیں بنایا۔

(5) یگانہ کی شاعری کا موضوع ہے حیات انسانی اور اس کی تنقید و تشریح۔

(6) یہ وہ سخنور ہے جو میدان ادب میں فقط انسانوں کی نمایندگی کرتا ہے۔

(7) غزل بہت وسیع چیز ہے۔ محض عورت اور مرد کے معاملات تک محدود نہیں۔

(8) سب سے بڑا اصول تنقید تو یہ ہے کہ شعر مقتضائے حال یعنی زندگی کے مطابق ہے کہ نہیں۔

میرے نزدیک جو غزل ان باتوں کی ترجمانی کرتی ہو وہ آسانی سے نظم کے ہم دوش کھڑی کی جاسکتی ہے اور وہ کسی ادبی میزان میں نظم سے کم وزن نہ نکلے گی۔ اکثر نقاد نظم کے مقابلے میں غزل کی تنگ دامانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن مجھے تو یہ تنگی آج تک محسوس نہ ہوئی۔ جو لوگ غزل پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ غزل میں صرف اشارہ کیا جاسکتا ہے بات کھل کر نہیں کہی جاسکتی میں ان سے یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ انھوں نے کس نظم میں کھل کر کیا کہا جس سے زائد کھل کر میں نے غزل میں نہیں کہا۔ رہا اشارے میں بات کرنا تو یہ تو کلام کا حُسن ہے عیب نہیں جب تک کہ اشارہ ذہن کو مفہوم تک پہنچانے میں ناکامیاب نہیں ہوتا۔ اس بات سے قطع نظر غزل میں وہ خوبیاں ہیں جو کسی اور صنف سخن میں نہیں اور وہ لوگ جو اس پر اعتراض کرتے ہیں وہ خالی اردو زبان کی تاریخ ہی نہیں بلکہ اپنے ملک کی تہذیب و معاشرت بھی بھول جاتے ہیں۔ غزل اردو ادب کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی ہے اور اردو زبان کے ہاتھ میں زندگی کی لکیر۔ اگر اردو نظم مٹا دی جائے تو یقیناً اردو ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا اور وہ اپنا مقام کھو دے گا لیکن اگر غزل مٹا دی جائے تو اردو زبان ہی زندہ نہ بچ سکے گی۔ میرے نزدیک غزل ایک مشرب ہے، ایک تہذیب ہے، ایک صلح جو پیمانہ لبریز ہے، محض ایک مٹنے والی ادبی روایت نہیں مجھے اس کا خوف کم ہے کہ کوئی اس صنف کو مِٹا سکتا ہے کیوں کہ ایک طرف اس میں گزری ہوئی صدیوں کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے اور دوسری طرف اس کے رشتے عوام کے جذبات اور احساسات سے وابستہ ہو چکے ہیں لیکن یہ ڈر ضرور ہے کہ کوتاہ بیں نقادوں اور ان نقادوں کی نظر دیکھنے والے فن کاروں میں گھر کر یہ کہیں خودکشی نہ کر لے۔ غزل اردو زبان کا وہ ہدیۂ دوستی ہے جو اس نے اس ملک کی باقی سب زبانوں کو نذر کیا ہے اور میرے نزدیک اس میں وہ لوچ سکت اور صلاحیت موجود ہے جو دور بہ دور گزرتی ہوئی زندگی کے تقاضوں کا ساتھ دیتی چلی آئی ہے آج بھی دے رہی ہے اور آئندہ بھی دے سکے گی۔

آخر میں موجودہ دور کے ایک مخصوص رجحان یعنی رمزیہ انداز بیان پر بھی کچھ عرض کردوں۔ میرے نزدیک یہ رجحان غیر صالح ہے اور گمراہ کن بھی۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ صاف صاف بات کہنے کے مقابلے میں اشاروں اور کنایوں سے اپنا پیام دینا زیادہ تحسین بھی ہے اور زیادہ لطیف بھی۔ لیکن بات کہی جاسکی یہ طے کرنے والا کہنے والا نہیں ہوتا بلکہ سننے والا ہوتا ہے۔ رمزیہ اسکول کے اکثر شعرا کا انداز بیان اس قدر مبہم اور غیر واضح ہوتا ہے کہ ذہن پر کافی زور دینے کے بعد بھی کوئی مفہوم ہاتھ نہیں آتا اور شعر سمجھنے کے لیے شاعر کو بلانا پڑتا ہے جو بسا اوقات صرف یہ تشریح پیش کرتا ہے کہ وہ اس کے تاثر اور احساس کا ایک وقتی نقش تھا اور اب وہ خود بھی اس معمے کا کوئی حل پیش نہیں کرسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ فن کار کا پہلا فرض تخلیق حُسن ہے اور حُسن کیا ہے اس کے لیے وہ اپنی ہی جمالیاتی قدروں کا سہارا لے سکتا ہے کیوں کہ دوسروں کی قدروں کو اپنا کر وہ کوئی فنی شاہکار تخلیق نہیں کرسکتا لیکن اگر اس کی تخلیق کا کوئی سمجھنے والا ہی نہ ہوگا تو اسے صرف ذاتی آسودگی پر قناعت کرنا پڑے گی اور اس زمانے کا انتظار کرنا ہوگا جب دنیا کا ذوق اس کی تخلیق کی سطح پر آجائے اور اس کی قدر کرسکے۔ رمزیہ اسکول کا نظریہ کیا ہے یہ اس کے موجد مالارمے (Malarme) کی زبان سے سنیے:

''نظم مثل ایک معمے کے ہے جس کا حل پڑھنے والے کو نکالنا چاہیے۔''

میری رائے میں نظم کو معمہ بنادینا کمال فن کار نہیں بلکہ عجز فن کار ہے۔ سب سے نمایاں خامی اس انداز بیان کی یہ ہے کہ ہر شاعر کا کلام اس کی اپنی آواز اور علامتیں بن کر رہ جاتا ہے اور ادب میں رفتہ رفتہ ایک ایسا مینار بابل تعمیر ہوتا ہے جہاں مختلف زبانوں کے بولنے والے نہیں بلکہ ایک ہی زبان بولنے والے ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھتے۔ ہر فن کار اپنا (Cypher) الگ تیار کرتا ہے۔ ادب ادب نہیں رہتا بلکہ چھوٹے چھوٹے خفیہ سازش کرنے والے گروہوں میں بٹ جاتا ہے۔ اس انتشار اور ابہام کا وہ فن کار اور نقاد جو اس طرز بیان کو پسند کرتے ہیں یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ موجودہ دور ذہنی انتشار اور تذبذب کا دور ہے لہٰذا فن کار جو زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اس انتشار اور ابہام سے کیسے بچ سکتا ہے۔ یہ سوال اُٹھائے بغیر کہ یہ دور ایسا ہے یا نہیں اس عذر میں یہ بات نظر انداز کردی جاتی ہے کہ وہ فن کار جس سے ادب عظیم کی تخلیق کا تقاضا کیا جاسکتا ہے عام پراگندہ خیال انسانوں کی سطح پر نہیں رکھا جاسکتا۔ ایک بڑا فن کار تو وہی ہے جس کے پاس ''دیدۂ بینا'' اور ''قلب بیدار'' ہو اور دیدۂ بینا رکھنے والا وہی قرار دیا جاسکتا ہے جو ان حالات میں بھی راہ دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر وہ

تھوڑا بہت ذہنی انتشار کا شکار ہو بھی جائے تب بھی اسے اپنا پیام لوگوں تک پہنچانے میں یہ نوبت نہیں آسکتی کہ وہ ایک گونگے کے اشاروں سے کام لے۔

میرے نزدیک اس مکتبۂ خیال کے اندازِ فکر میں جو بنیادی لغزش ہے وہ یہ کہ شاعر اپنے احساسات کو اپنے شعور سے جدا کر کے اپنے لاشعور کی زبان میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ احساس وجدان پیدا کرتا ہے اور وجدان مختلف اصوات تو دے سکتا ہے لیکن مربوط اور بامعنی الفاظ بغیر شعور سے کام لیے وجود میں نہیں آتے ۔ وجدان کی زبان میں بڑا خطرہ یہ ہوتا ہے کہ یہ نہایت آسانی سے مجذوب کی بڑ بن جاتی ہے۔ مجھے موسیقی کے ان بے ترتیب بولوں سے یا احساس کی ان مبہم پرچھائیوں سے جو کوئی دھندلا سا نقش بنانے میں بھی کامیاب نہیں ہوتیں کوئی آسودگی نہیں ملتی۔ میں شاعر میں ''دانائے راز'' پہلے ڈھونڈتا ہوں اور فن کار اور گیت کار بعد میں کیوں کہ میری نظر میں شعر محض احساس کے دھندلکے میں لاشعور کی آواز نہیں۔ میں شاعری کو شعور کا فن سمجھتا ہوں اور جو ادب بجائے شعور کی طرف بڑھنے کے لاشعور کی طرف مراجعت کرے وہ انسان کو گمراہ کرسکتا ہے، اسے راستہ نہیں دکھا سکتا۔ تاریخ بشر ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان ارتقا کی بے شمار منزلیں طے کرنے کے بعد اس قابل ہوا کہ اپنے احساسات اور خیالات کو دوسروں تک اپنے بولے ہوئے الفاظ کی مدد سے پہنچا سکے اور زبان پانے کے بعد بھی کئی ارتقائی منزلیں اور طے کرنا پڑیں تب وہ ان الفاظ کو ربط اور آہنگ دے کر اپنے ہونٹوں تک لا سکا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ شاعری انسان نے اس وقت شروع کی جب اس کا شعور کافی عروج پر پہنچ چکا تھا۔ شاعری تمام فنون لطیفہ میں سب سے زیادہ ارتقا یافتہ فن ہے۔ یہ رقص، موسیقی، مصوری اور سنگ تراشی وغیرہ کی طرح انسان کی ان ارتقائی منزلوں میں وجود نہ پا سکی جب شعور خوابیدہ یا نیم بیدار تھا اور احساس کی حکمرانی تھی۔ شعر وہی ہے جو احساس کو شعور کی زبان میں پیش کرے اور شعور واضح ہوتا ہے مبہم نہیں ہوتا۔ آج فرانس میں مالارمے کے جانشین کم ہوتے جارہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ اردو ادب میں بھی یہ اندازِ سخن مقبول نہ ہو سکے گا۔

شاید جو کچھ باتیں میں نے اوپر لکھی ہیں ان سے آپ کو میرا نظریۂ ادب سمجھنے میں [illegible] مدد ملے۔ میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ بہ حیثیت شاعر کے میں اس مقام پر ہوں جو میں نے اپنے نظریے [illegible] ایک عظیم فنکار کو دیا ہے۔ لیکن میرا یہ عقیدہ ضرور ہے کہ صحیح راستے پر کچھ قدم آگے بڑھانا غلط منزل [illegible] جانے سے بہتر ہے۔ اگر آپ میرے نظریوں سے اتفاق کریں گے تو ممکن ہے کہ آپ یہ قبول کرلیں [illegible] اس

گمرہی کے دور میں بھی غلط راستے پر گامزن نہیں ہوں۔

اب اس خط کو آخری فرض ادا کر کے ختم کرتا ہوں۔ میرے لیے ناممکن تھا کہ میں اکیلے اس مجموعے کو شائع کرنے کا خیال بھی دل میں لاتا یہ تو عزیزم صباح الدین عمر (اڈیٹر نیا دور، لکھنؤ) ہی کی ہمت تھی کہ انھوں نے یہ کام اپنے سر لے لیا۔ ان کے خلوص اور محبت کا میں کن الفاظ میں اعتراف کروں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ان کی دوستی میرے لیے بڑا قیمتی سرمایہ ہے اور اس نے میری زندگی میں ایک خوش گوار باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ کتابت، پروف ریڈنگ، کاغذ، طباعت اور اشاعت سے متعلق ہر مرحلہ وہی آسان کرتے چلے آئے اور کرتے چلے جا رہے ہیں۔ کاتب صاحب نے میرے سادہ شعروں کو بھی اپنی شوخی تحریر سے ایسا حُسن بخشا ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے شعر سے زیادہ ان کی کتابت جاذب نظر نہ بن جائے۔ صباح الدین عمر صاحب ہی نے کاتب صاحب کا انتخاب کیا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ ان کے علاوہ کوئی اور اس مجموعے کو ہاتھ نہ لگائے گا۔ یہ ان کے انہماک کی ایک ادنیٰ سی مثال ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے اب یہ مجموعہ انھیں کا ہو چکا میرا نہیں رہا۔ دنیا شکایت کرتی ہے کہ بے لوث دوست اور آشنا نہیں ملتے لیکن کم سے کم میرے صباح الدین عمر نے اس شکایت کو غلط ثابت کر دیا۔

مجھے امید ہے کہ آپ میں سے کچھ حضرات میرے اس خط کے جواب میں اپنی رائے کا کچھ نہ کچھ اظہار ضرور فرمائیں گے۔ فقط۔

دسمبر 1963 — مخلص

2 چینا بازار روڈ، لکھنؤ — آنند نرائن ملا

☆

قطعہ

گزرے ظلماتِ جہاں سے بہ سلامت ملا
ڈر رہے تھے نہ گزر پائیں گے بارے گزرے
کچھ تو راہیں تری نظروں نے فروزاں کر دیں
کچھ سے ہم اپنے ہی اشکوں کے سہارے گذرے

☆

جن پاک نفس انسانوں میں کردار کی عظمت ہوتی ہے
ایسوں سے نہ مل پائیں بھی اگر، نادیدہ عقیدت ہوتی ہے
منزل سے جو واقف ہے اُسے کب رہبر کی ضرورت ہوتی ہے
وہ آپ پیمبر ہے اپنا جس دل میں محبت ہوتی ہے
کم دل سے ہوس کی آلائش غم ہی کی بدولت ہوتی ہے
اشکوں کی نمی جب ملتی ہے شاداب محبت ہوتی ہے
کوئی بھی نظامِ محفل ہو، قدرِ اوّل پاسِ محفل
ساقی کا جہاں سکّہ ہو رواں، مے نوشی عبادت ہوتی ہے
تنگی فضائے گردوں کے شاکی، وہ وقت بھی آتا ہے
ہلکی سی بھی جنبش جب پر کی طائر کو غنیمت ہوتی ہے
کیسی ہی حقیقت ہو لیکن بے کس کی زباں پر افسانہ
آتی ہے لب طاقت پر جب، تب جا کے حقیقت ہوتی ہے
تو ڈھونڈ فلک پر باغِ ارم، اپنا تو عقیدہ ہے زاہد
جس خاک پہ دو دل پیار کریں وہ خاک ہی جنت ہوتی ہے
آواز میں رس، ہونٹوں پہ عنب باتوں میں شکر، یہ سب دھوکے
انسان کی اک پہچان یہ ہے آنکھوں میں مروّت ہوتی ہے
میں کیا، تم کیا، اور دنیا کیا انسان کی کچھ فطرت ہے یہی
اپنے لیے عذر ہزاروں ہیں، اوروں کو نصیحت ہوتی ہے

اُٹھ آئیں نہ اُس محفل سے جو ہم کیا اور کریں جب حال یہ ہو
چُپ ہیں تو ستائے جاتے ہیں، بولیں تو شکایت ہوتی ہے
اِک جرم خیانت تونے کیا، طاقت کو جہاں اپنا سمجھا
مسند پہ پہنچ کر بھول نہ جا، طاقت تو امانت ہوتی ہے
اِک چال وہی لیکن اس کے بازی جہاں میں نام ہیں دو
ہارے تو بغاوت کہلائے، جیتے تو نبوت ہوتی ہے
محفل کی نظر ہی میزاں ہے، تول آپ نہ اپنے کو ملا
جس دام بکے جو چیز، وہی اُس چیز کی قیمت ہوتی ہے

☆

دُنیا ہے یہ، کسی کا نہ اس میں قصور تھا
دو دوستوں کا مل کے بچھڑنا ضرور تھا

اُس کے کرم پہ شک تجھے زاہد ضرور تھا
ورنہ ترا قصور نہ کرنا، قصور تھا

تم دور جب تلک تھے تو نغمہ بھی تھا فغاں
تم پاس آگئے تو الم بھی سُرور تھا

اس اِک نظر کے بزم میں قصے بنے ہزار
اُتنا سمجھ سکا جسے جتنا شعور تھا

اِک درس تھی کسی کی یہ فن کاریِ نگاہ
کوئی نہ زد میں تھا نہ کوئی زد سے دور تھا

بس دیکھنے ہی میں تھیں نگاہیں کسی کی تلخ
شیریں سا اک پیام بھی بین السطور تھا

پیتے تو ہم نے شیخ کو دیکھا نہیں مگر
نکلا جو مے کدے سے تو چہرے پہ نور تھا

مُلّا کا مسجدوں میں تو ہم نے سُنا نہ نام
ذکر اُس کا مے کدوں میں مگر دور دور تھا

☆

یوں بھی ہو، اے کار سازِ بزم ہستی ایک دن
دیکھ لیں دُنیا میں انسانوں کی بستی ایک دن
زندگی ایک روز و شب کا خانۂ ماتم میں جشن
پی کے جامِ زہر اک شب رقص مستی ایک دن
کفر و ایماں سے نبھائی ہم نے ساری عمر یوں
ایک دن سجدہ خدا کو، بت پرستی ایک دن
واعظو! انجامِ ہستی پر کروں گا پھر نظر
پہلے ہونٹوں سے لگالوں جامِ ہستی ایک دن
اے خدائے باغ وصحرا! فیض اگر تیرا ہے عام
اِک گھٹا صحرا پہ بھی گھر کر برستی ایک دن
تشنہ کاموں کی خبر لے، مالکِ جام و سبو!
تشنہ کامی بن نہ جائے چیرہ دستی ایک دن
اُنگلیاں سب خوں چکاں، ہاتھوں میں ہیں کچھ دھجیاں
ہم بھی سینے بیٹھے تھے دامانِ ہستی ایک دن
کون سمجھے حُسن کی فطرت، کسی کے چشم و لب
ہوش ہی ہوش ایک دن، مستی ہی مستی ایک دن
خوں کے بدلے جیسے رگ رگ میں رواں ہے نوکِ خار
یہ تو ہونا ہی تھا حشرِ گل پرستی ایک دن
فرصت تو یہ کہاں مُلا دو روزہ زیست میں
شغل با شیخ ایک دن، خودمے پرستی ایک دن

~~~~~~
~~~~~~

☆

وہ گفتگو میں بہ ظاہر تو سرگراں سے نہ تھے
نظر میں شعلے مگر یوں کبھی تپاں سے نہ تھے
نئے ستم کی نہ دے دھمکیاں ہمیں اے برق!
وہ کون شعلے تھے اُٹھے جو آشیاں سے نہ تھے
لبوں تک آہی گئی آج آہ، مدّت سے
دل ایک گھاؤ تھا، کہتے مگر زباں سے نہ تھے
فلک سے اُترے صحیفوں کا شیخ ذکر نہ کر
تو کیا جہاں میں ہم اُترے اس آسماں سے نہ تھے
نہ مل سکے گا صفوں میں کوئی بھی رہ بر اور
ہم اتنی حد کے بھی مایوس کارواں سے نہ تھے
فلک کے دور نے ذرّوں کا جن کو نام دیا
ستارے وہ بھی تھے ہاں نسلِ آسماں سے نہ تھے
جو کارواں ہی بھٹک جائے، کیسے ساتھ رہیں
وفا کے رشتے تھے منزل سے، کارواں سے نہ تھے
جفا پہ آہ وفغاں تو نہ ہم نے کی مُلّا
خموش رہتے اب اتنے بھی بے زباں سے نہ تھے

~~~~~
~~~~~

☆

ابرِ بہار ہے مگر میرے چمن سے دُور دُور
جام چھلک رہے ہیں کچھ کام و دہن سے دُور دُور
نعرۂ گرمِ انقلاب، میں نے بھی ہاں سُنا تو ہے
جام و سبو کے آس پاس دار و رسن سے دُور دُور
طائرِ صبح ہو تجھے اُڑنا ہے یوں فضا میں آج
زاغ و زغن کے درمیاں زاغ و زغن سے دُور دُور
جبر عقاید حیات کیا کہیں آج ہر طرف
کتنے ہلاک رم غزال اپنے ختن سے دُور دُور
آگ سے کھیلنے میں بھی اتنا خطر تجھے نہیں
اے دلِ سادہ جلوۂ شعلہ فگن سے دُور دُور
اپنی ہر ایک راہ آج دور اسی کے نور سے
جس نے دیے جلا دیے خاکِ وطن سے دُور دُور
دی ہے مجھے دوآبۂ گنگ و جمن نے جو زبان
آج اسی کو حکم ہے گنگ و جمن سے دُور دُور
اپنی فصیلِ باغ کو کوہ کی دے بلندیاں
آندھیاں سُرخ ہوں کہ زرد خاکِ چمن سے دُور دُور
ملّا اَدب میں ڈھونڈ لی جادے سے ہٹ کے اپنی راہ
رنگِ جدید سے الگ، طرزِ کہن سے دُور دُور

☆

چھائی سی دلوں کی دُنیا پر اس صبحِ خرد میں شام بھی ہے
اور اہلِ ہوس کے ہاتھوں کچھ نامِ الفت بدنام بھی ہے
جینے کی یہی رُت ہے شاید، ہر سانس میں اک پیغام بھی ہے
اِک شام بھی ہے اک بام بھی ہے، اک جلوہ فرِ وزِ بام بھی ہے
یہ غم بھی نہیں، راحت بھی نہیں، آخر اس کا کچھ نام بھی ہے
اِک میٹھی میٹھی دل میں خلش جو صبح بھی ہے اور شام بھی ہے
دونوں سے بصیرت مجھ کو ملی، دونوں نے سنواری زیست مری
آنکھوں میں درخشاں اشک بھی ہیں، ہاتھوں پہ فروزاں جام بھی ہے
اِس دل کی زباں میں لفظوں کے مفہوم بدلتے رہتے ہیں
ہاں پیار کے بولوں میں شامل گاہے گاہے دشنام بھی ہے
اُس کسبِ نور سے کیا حاصل جو شمعِ ہدایت بن نہ سکے
ہے زیست کے شایاں زیست وہی، جو زیست بھی ہے پیغام بھی ہے
اپنی اپنی قسمت اس میں، یہ راہ محبت بھی ہے عجب
اِک عمر سفر گہ ناکافی اور گہ منزل دو گام بھی ہے
اِک رُخ ہے وجود اک رُخ ہے عدم، عمرِ گزراں کا ہر لمحہ
اس بنتی مٹتی دُنیا کا آغاز بھی ہے انجام بھی ہے
کیا حسن کی فطرت سمجھے کوئی دوہری دوہری مبہم باتیں
نظروں سے تو ہے ترغیب خطا اور ہونٹوں پر الزام بھی ہے

کچھ اور بھی ہے جنت میں تری زاہد حور و کوثر کے سوا
اس عیش گہ بے کاراں میں باکاروں کا کچھ کام بھی ہے

ہے عشق خود اک آئین اس پر آئینِ جہاں کا زور نہیں
یہ آپ سزا بھی اپنی ہے اور آپ اپنا انعام بھی ہے

شمعوں کے حسیں میناروں کے قدموں میں ہے خاکِ پروانہ
مینا کی صدا ہے قلقل میں آوازِ شکستِ جام بھی ہے

دُنیا ہے نقالوں کا میلا، نقلی چہرے، جھوٹی باتیں
اوڑھے ہے ردائے شبنم جو اکثر، وہ شرر اندام بھی ہے

دشمن سے نہ کھائی مات کبھی اور دوست کی شہ سے بچ نہ سکا
مُلا کی حقیقت کیا کہیے پختہ بھی ہے کچھ، کچھ خام بھی ہے

☆

نہ تیرے لیے ہے نہ میرے لیے ہے
یہ دنیا ہے سب کی، یہ سب کے لیے ہے

دیے جا رہی ہے وہی رات دھوکے
خدا جانے کتنے سویرے لیے ہے

وہ سادہ نظر سادگی میں بھی اپنی
بڑے دل نشین استعارے لیے ہے

نظر میں دِوالی تو ہونٹوں پہ ہولی
یہ ہر رُت کا سنگار کس کے لیے ہے

خدا کر سکا طے نہ انساں کے جھگڑے
ہر اک اپنے اپنے صحیفے لیے ہے

بھری رہ رووں سے نگاہوں کی راہیں
یہ دل کتنی یادوں کے میلے لیے ہے

نہیں چشمِ مُلّا میں بس نورِ فردا
یہ ماضی کے بھی کچھ دھندلکے لیے ہے

☆

وہ نبض کی رفتار کہ چھٹتے ہیں پسینے
لگتے نہیں دنیا ترے جینے کے قرینے

نظروں میں ہمیں ہم تھے کسی بزم میں جب تھے
اٹھ آئے تو بھولے سے بھی پوچھا نہ کسی نے

بن جاتے ہیں، تقدیر بدلتی ہے جہاں رُخ
چڑھتے ہوئے زینے ہی اُترتے ہوئے زینے

گرنے لگے کیا شیر کے اب ناخن و دنداں
گرگیست بہ ہر خوان و شغالے بہ کمینے

میرے بھی قدم تھے سوئے عشرت کدۂ ہوش
وہ تو کہو روکا مجھے آشفتہ سری نے

اب نجمِ فلک بن کے دکھاتے ہیں ہمیں آنکھ
ذرّے وہی کل جن کو اچھالا تھا ہمیں نے

برساتے ہوئے آنکھوں سے مے ملتے ہیں اکثر
در پردہ خصومت سے سلگتے ہوئے سینے

بے کس پہ ستم توڑنے والوں میں نہ ڈھونڈو
جرأت وہ جو خنجر کفِ سفاک سے چھینے

آغوش میں ساحل کی جو گزری وہ نہ پوچھو
طوفاں کو صدا دینے لگے پھر سے سفینے
وہ شوق کی بستی نہ وہ میلے نہ چراغاں
اب دیدہ و دل ہیں کہ یادوں کے دفینے
مے خانے میں یوں وعظ کناں ملا تھا کل رات
شعلہ بہ یسارے و نگارے بہ یمینے

☆

چپ ہوں، لیکن ہے خموشی بھی کلام آلودہ
تیغ پھر تیغ ہے، ہو لاکھ نیام آلودہ

ساقیا! بزم میں ارزاں ہیں بہ نامِ مے آج
آبِ ناپاک کے کچھ قطرۂ جام آلودہ

ایک دنیا کا تصور کوئی آسان نہیں
ذہنِ انساں ہے ابھی تک تو مقام آلودہ

حُسن اُس جلوے کی مشتاق ہے بزمِ خلوت
تو نے جس کو نہ کیا ہو ابھی بام آلودہ

نگہ و لب ہی نہیں ، ہے یہ تقاضائے وفا
تیرے آنسو بھی نہ ہوپائیں پیام آلودہ

شاید ہوجائے کبھی نغمہ و پرواز کی قدر
وصفِ طائر ہے ابھی یہ کہ ہو دام آلودہ

ساتھ چلنے کے لیے قافلے تیار نہیں
پائے انساں ہے ابھی طرزِ خرام آلودہ

دل میں رہ رہ کے خلش سی ہے نہ جانے کیسی
غمِ معصوم، نہیں جو ابھی نام آلودہ

رشتۂ حُسن و محبت میں اک ایسا بھی ہے وقت
جب کہ بیگانہ نگاہی ہے سلام آلودہ
تیرہ ہو لاکھ شب زیست، مگر اے غمِ دوست
تو سلامت ہے تو ہو جائے گی شام آلودہ
پا کی ذوق نے مُلّا مجھے چلنے نہ دیا
کسی اس راہ پہ، جو ہو چکی گام آلودہ

☆

جب بھی انسان کو دیتا ہے صدا اُس کا ضمیر
ایسا لگتا ہے کہیں دور سے آواز آئی

یاس کی آندھیوں میں بھی دل سے کبھی مٹی نہ آس
گم ہوئی لو ہزار بار، شمع مگر بجھی نہیں

سیاہی کی ایک بوند

(1973)

خونِ شہید سے بھی ہے قیمت میں کچھ سوا
فنکار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

انتساب

اندرا گاندھی کے نام

نظروں میں تری خواب ہیں ہاتھوں میں علم ہے
تو قوم کی للکار ہے تو قوم کا دَم ہے
جلتا ہوا دیپک ترا ہر نقشِ قدم ہے
ہستی پہ تری ناز ہو جتنا ہمیں کم ہے
اس ملک کی قسمت ترے ماتھے پہ رقم ہے

اعتراف

شاعری کو پیغمبری کا جزو کہہ لیجیے یا تلمذ رحمانی کا شاہکار، الہام مان لیجیے یا ضمیر انسانی کی آواز، سماجی فکر کی فن کارانہ صدائے بازگشت سمجھ لیجیے یا کاروانِ فکر مطلق کی بانگِ درا، تخلیقِ فرد قرار دے لیجیے یا گروہوں اور جماعتوں کے تاثرات قلبی اور وارداتِ ذہنی کی بازیابی، لیکن اس قدیم و عظیم فن کو سماجی محسوسات و مزعومات، عزائم و علائم سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ شاعری اور معاشرہ دونوں ہی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات فن کاروں کے خواب اور شاعروں کے الہامی تاثرات سماج میں تبدیلیاں لانے کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ اور ہر اہم اور دور رس سماجی تبدیلی لازمی طور سے ادب وفن کو بھی متاثر کرتی ہے۔ عام قاری کے لیے فرد اور سماج کا یہ رشتہ علم وادب اور فنونِ لطیفہ کی دنیا میں غیر مرئی ہوتا ہے۔ لیکن غور کرنے والوں اور دور رس نگاہوں سے چھپا بھی نہیں رہتا۔ آج کی دنیا میں سماجی تنظیم اور انسانی تہذیب بے حد متنوع اور پیچیدہ ہوگئی ہے۔ اس تنوع اور پیچیدگی کے اسرار و رموز کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے تزکیۂ نفس و انجلائے شعور کی ضرورت ہے۔ بالغ اذہان اور مزکّی شعور ہی تمام تجربات ومحسوسات کو اظہار کا جامہ پہنا سکتے ہیں۔

سماج اور تہذیب کی طرح فنی اور اخلاقی اقدار بھی معرض تغیر میں ہیں۔ یہ تغیرات اتنی سرعت اور تیز رفتاری سے ہو رہے ہیں کہ کمزور دلوں اور متزلزل دماغوں کے لیے ان کا ساتھ دینا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ لیکن ایک بیدار ذہن ان تمام تبدیلیوں کا اثر پوری طرح قبول کر رہا ہے اور یہ تبدیلیاں براہِ راست نمایاں ہو جاتی ہیں۔ لیکن ادب اور فنونِ لطیفہ پر ان کا اثر بالواسطہ اور کبھی کبھی بہ دیر بھی ہوتا

ہے۔ لیکن ہوتا ضرور ہے ذرا غور کیجیے کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے اردو ادب میں کتنے دور گذر گئے۔ داغ و امیر و جلال کے شاگردوں کی آوازیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہیں۔ صفی و عزیز و ثاقب کے اشعار پر ''چھتیں اڑتی'' ہم آپ میں بہتوں نے دیکھی ہیں۔ حسرت و جگر و اصغر و آرزو کے نغموں پر سامعین کو وجد میں آتے دیکھا گیا ہے۔ چکبست و سرور و اقبال و جوش نے دلوں کو گرمایا اور ذہنوں کو برمایا ہے۔ ترقی پسندوں کے غلغلوں میں پچھلی تمام آوازیں مدھم پڑ گئی تھیں۔ پہلو بہ پہلو حلقۂ ارباب ذوق والے اپنے ترانے بھی چھیڑے ہوئے تھے۔ آخر میں نئی نسل اور جدید تر نسل کا شعور بلند ہوا جس کا ارتعاش آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس مختصر سی مدت میں زبان، بیان، اندازِ فکر، فنی روایات، جدتِ اظہار اور تجرباتِ ترسیل کے کتنے پہلو ہمارے سامنے آئے اور گزر گئے۔

اگر ہم انفرادی اکتسابات و خصوصیات کو بھی مدّ نظر رکھیں تو یہ تبدیلیاں اور بھی متنوع اور مختلف الالوان نظر آئیں گی۔ اتنی تیز رفتار اور زبردست تبدیلیاں ہماری طویل ادبی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی ہیں۔ مختصر سی مدت میں اتنے اہم تغیرات کا رونما ہونا کوئی ادبی حادثہ نہیں تھا۔ جو یکایک وجود میں آ گیا۔ یہ درحقیقت اس پورے دور میں ہونے والی تبدیلیوں کا ہی عکس ہے۔ دخانی مشینوں سے برقی اور پھر ایٹمی توانائی تک کا سفر تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ دو عظیم جنگوں کے جلو میں انسانی تباہی کے ساتھ ساتھ افروایشیائی ممالک میں امن و آزادی کی زبردست تحریکیں چل پڑیں اور انسان نئے عزم اور نئی امید سے نئے آفاق کی طرف آگے بڑھا۔ سماجی فکر و عمل کی دنیا میں سمندر منتھن کا جو عالم برپا تھا اسی سے نکلنے والے زہر اور امرت کے گہرے نقوش انفرادی تخلیق پاروں پر بار بار ابھرے اور مٹے۔ نت نئے تجربات اور انحرافات کی کشمکش میں اقدار کی شکست و ریخت اور تعمیرِ نو اور روایات کی تنظیم جدید ہوتی رہی۔ کسی حساس شاعر کے لیے ان تبدیلیوں سے صاف بچ نکلنا ممکن نہیں تھا۔ نہ ذات کے گھروندوں میں پناہ تھی نہ تخیل محض کی جنتوں میں، نہ تجرباتی بوالعجبی میں مفر تھا نہ غم کوش دروں بینی میں۔ معاشرتی حقائق کی کرنیں ہر اندھیرے میں دراز و روزن تلاش کر کے در آتیں اور دور دور تک روشنی سے بھاگنے والوں کا تعاقب کرتیں۔ پنڈت آنند نرائن ملا کا حساس و فعال ذہن، ان کی زبردست قوت مدرکہ، ان کا انسانی ہمدردی اور آفاقی محبت سے لبریز دل اس سارے منظر کا ہر تاریخی موڑ پر مشاہدہ کرتا اور جائزہ لیتا رہا ہے۔ ان کی شاعری بھی اس ارتقائی سفر میں ان کا ساتھ دیتی رہی ہے اور بدلتے ہوئے اجتماعی ذہن سے کبھی بے آہنگ نہ ہونے پائی ہے۔ ملا تنہا نہیں تھے بلکہ ان کے ساتھ شاعروں اور ادیبوں کا

پورا قافلہ تھا۔ اور قافلے میں ملا کی ادبی قامت کی بلندی بہ یک نظر نمایاں ہو جاتی تھی۔ ان کی فن کارانہ شخصیت قدیم و جدید کے مابین ایک رابطے کا کام دیتی رہی اور ملا کو جائز طور سے اس کا برابر احساس رہا:

دو کناروں کے ہوں مابین، میں اک پُل ملا
رکھتا جاتا ہوں ستوں ایک، ہر اک گام کے ساتھ

یہ ذہنی سفر ملا نے دو ایک دن میں طے نہیں کیا ہے۔ انھوں نے 1926 میں شاعری شروع کی تھی۔ اگر وہ ابتدائی زمانہ بھی جوڑ لیا جائے جو انگریزی شاعری کی نذر رہا تو ملا کی شاعری کی عمر نصف صدی سے زیادہ ہوگی۔ اس پختگی کے علاوہ جو عمر، مشق اور تجربے کا عطیہ ہوتی ہے، ملا کی ذہنی بیداری، تاریخی شعور اور وسعتِ مطالعہ و مشاہدہ نے ان کی شاعری کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

ملا کے بارے میں ذہنی بیداری اور تاریخی شعور کی بات کرتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہنا چاہیے کہ ملا کسی مقررہ اور محدود نظامِ فکر سے وابستہ نہیں ہیں۔ انھوں نے ''میری حدیثِ عمر گریزاں'' کے ابتدائیہ میں ''سیاسی نظریات'' اور ''انسانی نظریات'' کے مابین خطِ فاصل کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں وہ ''معراجِ کیف جو جذبات کو طہارت بخشتی ہے، شعور کو بیدار کرتی ہے اور روح میں ولولہ اور امنگ پیدا کرتی ہے'' شاعری کا ایک روشن پہلو ہے اور یہی ان عظیم فن کاروں کا خاصہ ہوتی ہے۔ جو انسانی مستقبل پر یقین رکھتے ہیں۔ اسی لیے وہ شعر کو زندگی کی عکاسی کی بجائے رازِ زندگی کی نقاب کشائی کا ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔ وہ فن کار کے ذاتی ردِعمل کے قائل تو ہیں لیکن اس ذاتی ردِعمل کو زندگی کی سب سے اہم قدر قرار نہیں دیتے۔ انھوں نے مختصر لفظوں میں اسی بات کو یوں بھی ادا کیا ہے کہ ''عظیم شاعری دراصل خارجیت اور داخلیت کو ایک ساتھ سمونے کا ریاض ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ وہ شاعر میں ''دانائے راز پہلے'' ڈھونڈھتے ہیں اور ''فن کار یا گیت کار بعد میں۔'' صبر آزما ریاض اور جرأتِ حق گوئی کے بغیر کوئی دانائے راز نہیں بن سکتا۔ ایسے سچے فن کار کے قلم کی سیاہی خونِ شہید کی سرخی کی طرح چمکنے لگتی ہے۔ عمومی شہادتوں میں لازمی طور سے جرأتِ حق گوئی کا مظاہرہ نہیں ہوتا شاید اسی لیے ملا نے یہ شاعرانہ تعلّی جائز سمجھی ہے کہ:

خونِ شہید سے بھی ہے قیمت میں کچھ سوا
فنکار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

ظاہر ہے اس شانِ اظہار میں اگر ایک طرف عالم شہید ہے تو دوسری طرف خاص فن کار۔ ورنہ:

یہ رتبۂ بلند مِلا جس کو مل گیا

ہر بوالہوس کے واسطے دار و رسن کہاں؟

یہی ''سیاہی کی ایک بوند'' ملا کے تازہ مجموعۂ کلام کا عنوان ہے۔ ان کے تین مجموعے ''جوئے شیر'' (1949)، ''کچھ ذرّے کچھ تارے'' (1959) اور ''میری حدیثِ عمرِ گریزاں'' (1963) پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ اب دس برس کے بعد شائع ہو رہا ہے۔ جن حضرات نے ان کے پہلے تین مجموعے دیکھے ہیں وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہیں گے کہ ان کی شاعری نے ارتقا کی کچھ مزید منزلیں طے کی ہیں۔ اور ان کا فن عروج کی تازہ منزلوں کی طرف بڑھا ہے۔ سچا فن کار کبھی پرانا نہیں ہوتا اور یہ تازگی ملا کی فن کاری اور عروج دونوں کی نقیب ہے۔ اس مجموعے میں ملا کی ایک نظم ''شعر کا جنم'' بھی شامل ہے، اس سے ملا کے نظریۂ فن کو سمجھنے میں مزید آسانی ہوگی:

چھانے لگا کیوں
آنکھ پہ بادل بادل
سایہ سایہ ہر جلوہ
جلتے، بجھتے، کچھ دیپک
گہنائی سی ہر تحریر

گرنے لگے کیوں
ذہن پہ پھر پردے پردے
کھوئے کھوئے سے کچھ خواب
جھل مل جھل مل چند خیال
پرچھائیں سی ہر تصویر

شاید مجھ سے دور کہیں

مجھ میں رہتا ہے جو میں
چھپ کے الگ تنہا تنہا
پھر کربِ تخلیق میں ہے
جب وہ پلٹ کر آئے گا
نئے سندیسے لائے گا
نئی شعائیں پھوٹیں گی
اور گہن سے چھوٹ کر
میں خود کو پا جاؤں گا

خارجی حقایق میں ذات کی بازیابی، خودیابی، شاعری کی خالق ہے، ایک طرف اپنی ذات کا مرکزی نقطہ ہے اور دوسری طرف کائنات کا حقائق سے گہرا اور تخلیقی رشتہ۔ ملا ذات اور کائنات کے مابین یہ رشتہ کورے فلسفے اور عقل محض کی مدد سے قائم نہیں کرتے بلکہ ان کے یہاں دل و دماغ، خیال اور جذبے کی ایک حسین آمیزش ہے۔ وہ حال سے نا آسودہ ہو کر نہ صرف مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔ اور نہ ذات کے نہاں خانوں میں چھپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے جہد حیات کی راہوں پر بے جھجک آگے بڑھتے ہیں۔ لیکن یہ جنونِ آگہی جذبۂ محض نہیں ہوتا۔ انھیں کے لفظوں میں ان کے ''جنون کو خرد ہی نے پالا اور پروان چڑھایا ہے انھوں نے شعروں کے سانچے میں انسان کے ہر درد و کرب کو ڈھالنے کی کشش کی ہے۔ لیکن ان کا درد، انفرادی درد کم اور اجتماعی درد زیادہ ہے۔ ''مریم ثانی'' جیسی خوبصورت، متحرک، نرم اور گل گوں نظم میں بھی ان کا ذاتی اور انفرادی غم، معاشرے کی عام غم انگیز فضا کا ایک اٹوٹ حصہ بن جاتا ہے۔ ایسی نظموں میں وہ فقیہ، واعظ اور ناصح بھی نہیں، مشکک بھی نہیں ہیں، کورے فلسفی بھی نہیں ہیں بلکہ وہ ایک حساس مفکر اور ایک جری فن کار ہیں۔ انھوں نے جو طریق فکر اور طرز اظہار اپنایا ہے وہ تلوار کی دھار پر رقص کرنے کے مرادف ہے۔ ذرا سی لغزش خطرناک نتائج کی حامل ہوسکتی ہے اور یہ بات فنی بلوغ کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ فکر کی بلاغت، نظر کی توانائی اور لہجے کی خوش آہنگی ان کے فن کو بقول آل احمد سرور ''لطیف و منفرد'' بنا دیتی ہے۔ اسی انفرادیت کا اعتراف احتشام حسین نے ان لفظوں میں کیا ہے کہ'' ان کے صاف، شفاف اور ذکی الحس ذہن اور انسانی دکھ درد کے تصور سے خون ہوجانے والے دل، دونوں

نے مل کر ایک مخصوص شاعرانہ انداز سے زندگی کو فن کی گرفت میں لیا ہے۔ یہ ان کا ایسا انفرادی رنگ ہے جسے انھوں نے شاعرانہ، مترنم اور دل کش زبان میں پیش کیا ہے۔ اس رنگ میں ان کے حریف مشکل ہی سے نکلیں گے۔"

انفرادیت، جو اجتماعیت کا جز بنے رہنے پر مصر ہو، عام نگاہوں کو دیر میں محسوس ہوتی ہے اور ملا کا ذہنِ فن کار اس کو محسوس بھی کرتا ہے۔ لیکن وہ صرف شہرت۔ یا آسانی سے حاصل کی ہوئی شہرت کا طلب گار نہیں ہے۔ ملا کی شاعری کا مقصد نہ تو تفریحِ طبع ہے، نہ خواہش نمائش و نمود ہے۔ وہ اجتماعی روح کی بے چین پکار ہے۔ اس لیے ملا کو صحیح طور پر یقین ہے کہ یہ پکار آج نہیں تو کل دوسرے ذہنوں اور روحوں میں ارتعاش ضرور پیدا کرے گی اور یہی ارتعاش فن کی بقا اور دوام کا ضامن ہوگا۔ وہ مذاق عام سے کسی قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار نہیں مگر کیف مذاق عام سے واقف ہیں۔

سطحِ مذاقِ بزم پر ملا اتر کے آنہ تو — اوروں کا جو کمال ہے تیرے لیے زوال ہے
وادیِ شعر میں یہ جادۂ ملا ہی نہ ہو — اک الگ ہٹ کے نشان کفِ پا ہے تو سہی
ملا یہ اپنا مسلکِ فن ہے کہ رنگِ فکر — کچھ دیں فضائے دہر کو کچھ لیں فضا سے ہم
مل سکی جن کو نہ اس دنیا میں جا ملا وہ خواب — اشک بن کر دیدۂ شاعر میں ڈھلتے ہی رہے
محفل کے سبو و جام سے لے ملا بھی اپنی صہبا — لے کیفِ مذاق عام مگر، بر سطحِ مذاق عام نہ لے
عرصۂ شعر میں ہے شاہسوار یکتا — نام ملا کا مگر پانچ سواروں میں نہیں
کچھ بات ہے ملا میں کہ نقادوں کے باوصف — وہ انجمن شعر میں گم نام نہیں ہے
میرے سر میں ابھی یہ خلل باقی ہے — آج گم نام ہوں لیکن ابھی کل باقی ہے

ملا کے ذہن میں انسان کی عظمت کا جو تصور ہے وہ حال کی دشت نوردی اور زبوں حالی سے ہم آہنگ نہیں ہے، لیکن مستقبل پر ملا کا یقین ناقابل شکست ہے۔ وہ جہاد زیست کے تپتے میدانوں میں شجر سایہ دار ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ ویسے تو دہر میں جتنے بھی نظام آئے ہیں وہ "معر دۂ بہبودیِ عام" ہی لے کر آئے ہیں۔ لیکن قدم قدم پر چمن کھلے ہونے کے باوجود، "قافلۂ آلِ بشر" کی دشت نوردی ملا کے سازِ دل پر زخمہ زنی کرتی رہتی ہے:

ہر نئے علم میں کچھ تازہ بلاؤں کے نشاں
ہر نئی فتح کے دامن میں چھپی تازہ شکست

ہر نئے، موڑ پہ کچھ تازہ غموں کے صحرا
اور ان سب کو لیے جنبش پا میں اپنی
کھولتا دیدۂ پرنم میں تبسم کی کرن
ان گنت صدیوں کو طے کرتا ہوا، دور بہ دور
خم بہ خم رہگو رعمر گریزاں پہ رواں
خواب درخواب جلاتا ہوا نظروں میں چراغ
شب بہ شب قافلۂ آبلہ پا گزرا ہے

حیات کے اس سفر لامتناہی میں انسان اب بھی خواب دیکھنے سے باز نہیں آتا اور شوق رہروی کو ہارنے نہیں دیتا:

شوق آغوش میں ناکامی پیہم کو لیے
شاید امید سحر ہے وہ خواب
جس کی تقدیر میں تعبیر نہیں

اس امید کو ملا ارتقا کا نام دیتے ہیں۔

ملا کے مشاہدات کا دامن بہت وسیع ہے، ایٹمی توانائی، ہپّی، اندھیر نگری، محبت کرنے والی جوان روحیں، پوجا کرانے کے حوصلے، محافظ وطن سپاہیوں کے ولولے، معمولی انسان جس کے سینے میں چھوٹا بالک چھپا ہے، عقل و دل کا تضاد، بوڑھا مانجھی، محفل میں شمع محفل کی تنہائی، بے کس کا چراغاں، کارواں زندگی کا سفر، گاندھی، نہرو، سروجنی نائیڈو سے لے کر بیڑی پینے والا مفلس تک، سیاست کی مسند سجانے والوں سے لے کر استحصال کا شکار تک، کوئی بھی ان کی تیز نگاہوں کی رسائی سے دور نہیں۔علی العموم اتنے وسیع کینوس کو اتنے ہی وسیع علم کے بغیر سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ملا کا کمال یہ ہے انھوں نے ہر جگہ ان افراد و واقعات و علائم کو سطحیت سے بچایا ہے اور گمبھیر تفکر اور انسانیت دوستی کی مدد سے ان کی سماجی معنویت کو اُجاگر کیا ہے۔ لہجے کی متانت، سیدھے بیانیہ انداز کے خطوط سے اوپر اٹھ کر مظاہر میں نہیں بلکہ مظاہر کی روح میں پیوست ہوتی چلی جاتی ہے اور شاعر پرت دار حقیقت کی تہیں کھولتا جاتا ہے۔ یہ عمل وہ بڑی چابک دستی اور فن کاری سے کرتا ہے۔ بہ ظاہر سیدھی باتوں کے پس پردہ چھپی ہوئی سچائیوں کو وہ اس طرح نکال لیتا ہے کہ جیسے نظر باندھ رہا ہو۔اس کے باوجود ان

کے یہاں فلسفہ طرازی نہیں ہے۔ بلکہ ایک حساس اور شعور انسان کا فطری ردعمل ہے جو انھیں کبھی بوڑھا بنادیتا ہے۔ اور کبھی بالا، کبھی مفکر بنادیتا ہے اور کبھی مجاہد۔

یہ رنگینی اور رنگا رنگی فکر و اسلوب دونوں ہی سطحوں پر نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں قصیدہ و مثنوی و مرثیہ کا، رزمیہ، تجویہ، رثائی، اور بیانیہ انداز اس لیے پیدا نہیں ہونے پایا کہ وہ فکر انگیز تغزل کے گرویدہ ہیں۔ ان کا شعر دل کو ذہن کی سطح سے متاثر کرتا ہے، خالص جذبے کی سطح پر کبھی نہیں۔ اس طرح کی ایک کیفیت بعض اوقات ان کی بے حد ابتدائی نظموں میں ضرور پائی جاتی تھی۔ لیکن مدت ہوئی کہ وہ ڈگر چھوڑ چکے ہیں۔ وہ دونوں کا لہجہ اختیار تو نہیں کرتے لیکن غالب و اقبال کی روایت سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔ روش عام سے ذرا ہٹ کر کہنے اور سوچنے کے انداز نے انھیں شگفتہ گفتار تو بنایا ہی ہے ان کے اشعار کو ایک نیا معنوی اور فکری کردار بھی عطا کردیا ہے۔ ان کے لہجے میں جھنکار تو کبھی کبھی سنائی دیتی ہے۔ لیکن ایک خوشگوار معتدل اور فکر انگیز کھنک ہمیشہ سنی جاسکتی ہے۔

ادھر ملا نے سنسکرت نظموں کے کچھ ترجمے بھی کیے ہیں۔ یہ ترجمے انگریزی کی وساطت سے کیے گئے ہیں اور گمان یہ تھا کہ شاید سنسکرت کی ارضیت اور مقامی پن کہیں اجنبیت کا رنگ نہ اختیار کرلے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملا نے ان نظموں میں اپنا حقیقی لہجہ پالیا ہے۔ سیدھا سادہ، سماجی معنویت سے بھرپور، پرکار اور دل کش۔ مثلاً ہندوستانی عورت کے جذبات معصوم گداز دیکھیے:

میرے من میں میرا پریتم

سوتا ہے اک کچی نیند

دھیمے بولو، جاگ نہ جائے اور سن لے

کالی داس نے ''حسن دوشیزہ'' کی جو تصویر کشی کی ہے اسے ملا نے اپنی زبان میں یوں محصور کیا ہے:

یہ ادھ کھلا غنچہ جو مہکتا ہے سر شاخ

جس کا ہرا آنچل نہیں سرکا ابھی تک......

اِک دُر صدف ہی سے ابھی جھانک رہا ہے

لو دیتا ہوا دیپ، نمایاں بھی، نہاں بھی

انگور چھپائے ہوئے صہبا کا خزانہ

غزل کو جن لوگوں نے انفرادی لہجہ دیا ہے ان میں ملا کا خاص مقام ہے۔ وہ ہمارے بلند قامت غزل گو ہیں۔ نرمی اور گھلاوٹ صرف زبان و بیان ہی میں نہیں بلکہ سوچنے کے انداز میں بھی نمایاں ہے۔ ملا چونکا دینے والا آہنگ اختیار کیے بغیر سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کی رایوں سے اختلاف ہوسکتا ہے اور کہیں کہیں مجھے بھی پورا اتفاق نہیں ہے۔ لیکن ان کو بات کہنے اور اپنے ماضی الضمیر کو پورے خلوص اور صفائے ذہن کے ساتھ دوسرے تک اس طرح پہنچانے کا ڈھنگ آتا ہے کہ سننے والا ہمدردانہ غور و فکر کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس سے زیادہ ہم شاعری سے مطالبہ بھی کیا کر سکتے ہیں؟

مقدمے کی تنگ دامانی غزلوں کے اقتباس پیش کرنے سے روک رہی ہے۔ پھر بھی اس حکایت لطیف کے خاتمے کے پہلے چند اشعار آپ کے ساتھ دہرانے کو جی چاہتا ہے:

مٹے نہ نرمیِ شام و سحر جہاں والو — کہیں سے دن بھی چلے جب کہیں سے رات چلے

بجھی بجھی سی فضا ہے دلوں کی، اشک جلاؤ — نظر سے برف جو پگھلے تو دل کی بات چلے

کیا ختم پہ آپہنچا افسانہ محبت کا — ملتی ہیں نگاہیں اور پیغام نہیں ملتا

وہ کنجِ طرب چھوٹ چکا، آئی رہِ غم — اب آج سے بیگانے ہی بیگانے ملیں گے

صرف اٹھانے کا گنہگار ہوں اے ساقیِ بزم — میں نے جو جام چھوا تھا، ابھی رکھا ہے وہیں

ایک ہنگامۂ آتش نفساں بھی ہے حیات — یہ فقط انجمن شعلہ رخاں ہی تو نہیں

لب تہذیب کا انداز بیاں ہے ورنہ — شکر میں کون سی شے ہے جو شکایت میں نہیں

شب کو بھی مہکتی تو ہیں یہ ادھ کھلی کلیاں — جب چوم لیں کرنیں تو مہک اور ہی کچھ ہے

اشکوں سے بھی ہو جاتا ہے آنکھوں میں چراغاں — بن برسی نگاہوں کی چمک اور ہی کچھ ہے

دو دن کی زندگی میں بھی نشتر ہر ایک سانس — کن کن جراحتوں کو تبسم بنائے گل

اس نظر پہ پلکوں کے پڑ رہے ہیں یوں سائے   جھنڈ میں درختوں کے جیسے دھوپ کھو جائے
دل میں ہر طرف پھیلی چاندنی انھیں کی ہے   وہ لطیف سے غم جو اشک جو نہ بن پائے
دل سے چپ چاپ دبے پاؤں گزر جاتے ہیں   جیسے اب آنکھ چراتے ہیں گزرتے ہوئے دن
زیست تاروں کی رہگزر بھی نہیں   اور پیراہن شرر بھی نہیں

ان شعروں میں گونا گوں خیالات و محسوسات زندگی کے کتنے ہی گوشوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، سیاست ہو یا عشق، فلسفہ ہو یا حرفِ حق، رندی و مستی ہو یا بے خودی و کیف دروں، ملا کا جچا تلا انداز پہچانا جاسکتا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ہمارے ناقدین نے بھی اردو کے اس بلند پیکر شاعر کو از سرِ نو دریافت کیا ہے اور اسے وہ مقام بلند حاصل ہوگیا ہے، جو اس کا جائز حق تھا۔ مجھے خوشی اس لیے اور بھی زیادہ ہے کہ اس صدی کی تیسری دہائی میں میں نے ملا صاحب پر پہلا تعارفی مضمون لکھا تھا۔ ملا کی فنی رفعت اس وقت بھی پرکھنے والی نظروں سے چھپی نہیں تھی۔ اب تو بدترین مخالف بھی اعترافِ عظمت پر مجبور ہے۔ سچ یہ ہے کہ علم و ادب کی دنیا میں دیر تو ہے اندھیر نہیں ہے۔ یہ مجموعہ یقیناً ملا صاحب کا آخری مجموعہ نہیں ہے۔ ابھی ملا صاحب سے اردو کو بہت کچھ اور بھی پانا ہے۔

نئی دلی

26/مارچ 1973   علی جواد زیدی

☆

غزل

غزل پرانی ہے لیکن کئی شعر نئے اور غیر مطبوعہ ہیں اس لیے اسی سے اس
مجموعے کا آغاز ہوتا ہے

گل کام نہ دے گی تری نا کردہ گناہی
گلچیں کی عدالت ہے کانٹوں کی گواہی

وہ داد و ستد دل کی نہ وہ بزم نہ وہ رند
انساں کی جگہ آج ہے وردی میں سپاہی

دو عشق کو اقدامِ ہوس کا تو نہ الزام
وارفتہ نگاہی نہیں گستاخ نگاہی

میں نالہ بہ لب اُجڑے نشیمن پہ نہیں ہوں
دیکھی نہیں جاتی ہے گلستاں کی تباہی

ممکن ہے کہ ہونٹوں کو تو میں سی بھی لوں لیکن
لے جاؤں کہاں آنکھوں کی افسانہ نگاہی

یوں دل میں چھپائی ہے ترے غم کی امانت
دامن پہ نشاں کوئی نہ تاروں کی گواہی

پہچان لیا ہم نے خطا کار تجھے اب
کچھ حد سے سوا تھی تری معصوم نگاہی

میں نے تو اندھیروں میں بھی ڈھونڈے ہیں اُجالے
ڈھونڈیں جنھیں ملتی ہو اجالوں میں سیاہی

مسجد ہی میں کل رات کٹی شیخ کی شاید
وہ لالہ لبی ہے نہ وہ تسنیم نگاہی
ملتی ہے نظراب بھی کبھی اس سے مگر یوں
جس طرح سرِراہ گزرجاتے ہیں راہی
پہچانتا شاید ہوں میں ناصح کو، وہی نا
لفظوں کا جو ہے سلسلہ لامتناہی
اب آنکھ ملاتے ہوئے ڈر لگتا ہے تم سے
مہتاب میں آنے لگی خورشید نگاہی
اس جام پہ کیا بیت گئی تا بہ سحر جو
محفل میں دھرا رہ گیا صہبا سے بھرا ہی
دل نور سے معمور ہو ممکن ہے مگر شیخ
ذہنوں میں اتر جاتی ہے ماتھے کی سیاہی

ملا نے نظر کتنے حسینوں سے لڑائی
تب جاکے کہیں آئی یہ شائستہ نگاہی

☆

غزل

آثارِ زیست پھر سے نمایاں ہوئے تو ہیں
کچھ قافلے رواں سوے زنداں ہوئے تو ہیں

کالے پرے افق پہ نمایاں ہوئے تو ہیں
کچھ آمدِ بہار کے عنواں ہوئے تو ہیں

منبر پہ شیخ، بزم میں پیرمغاں وہی
کچھ کاروبار زیست کے آساں ہوئے تو ہیں

یہ اور بات ہے کہ خزاں ہے وہی خزاں
نامِ بہار لے کے چراغاں ہوئے تو ہیں

آلودگی پہ کیوں نہ ہوں محفل میں جام خوش
ساقی کی چشمِ لطف کے شایاں ہوئے تو ہیں

طرزِ جفا میں کوئی کمی رہ گئی مگر
اپنی جفا پہ ہاں وہ پشیماں ہوئے تو ہیں

کیا موسمِ جراحتِ دل آرہا ہے پھر
سامانِ صدہزار، نمکداں ہوئے تو ہیں

نیکی کی جھونپڑی میں دیا تک نہ جل سکا
اقلیمِ اہرمن میں چراغاں ہوئے تو ہیں

کانٹوں کا شکریہ کہ اُلجھ کر انھیں کے ساتھ
دو چار گل بھی دولتِ داماں ہوئے تو ہیں

شاید اسی کا نام ہے ہمواریِ حیات
جو لالہ زار تھے وہ بیاباں ہوئے تو ہیں
کیا انتخابِ شیخ کا پھر وقت آگیا
کچھ مومنانِ جام سے پیاں ہوئے تو ہیں
مہکی تھی زیست بازوئے ملا پہ بھی کبھی
گیسو کسی کے اِن پہ پریشاں ہوئے تو ہیں

☆

تاشقند

ظلمت میں روشنی کے کچھ امکاں ہوئے تو ہیں
تارے سے کچھ افق پہ نمایاں ہوئے تو ہیں
پلٹے ہیں کارزار سے تیغوں کے قافلے
بستی میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
ٹوٹا تو جاکے کوہ رجز خواں کا سلسلہ
کچھ آبشار پھر سے غزل خواں ہوئے تو ہیں
ذوقِ گرہ کُشا کے جے قطرہ ہائے خوں
پھر انگلیوں میں ریشۂ جنباں ہوئے تو ہیں
باراں ابھی نہیں، نہ سہی، قطرہ ہائے آب
مل کر ہوا میں ابر کا عنواں ہوئے تو ہیں
انسانِ گم شدہ کے لیے غم کی رات میں
رہ رہ کے تاشقند فروزاں ہوئے تو ہیں

☆

غزل

جو شبِ سیاہ سے ڈر گئے کسی شام ہی میں بھٹک گئے
وہی تاجدارِ سحر بنے جو سیاہیوں میں چمک گئے

نہ بنایا منہ کسی جام پر نہ لگایا دل کسی جام سے
جو لبوں تک آئے وہ پی لیے جو چھلک گئے وہ چھلک گئے

ہے حیات جہدِ نفس نفس، رہِ آشیاں ہے قفس قفس
جو نہ نوکِ خار پہ چل سکے رہِ زندگی سے بھٹک گئے

تجھے کچھ خبر بھی ہے محتسب اسی بزم میں ترے سامنے
لڑیں دور ہی سے نگاہیں کبھی یوں بھی جام کھنک گئے

مرے رہنمائے سخن سرا کبھی منبروں سے اتر ذرا
کوئی گام راہِ عمل میں بھی تری گفتگو سے تو تھک گئے

ہیں نہ جانے کتنے گلِ حسیں جو چھپائے عارضِ آتشیں
لیے اپنا ساغرِ عنبریں کسی دشت ہی میں مہک گئے

کہوں کیا میں زیست کی داستاں اسے یوں سمجھ مرے مہرباں
کبھی حرفِ بزم جو سن لیا تو نظر کے جام چھلک گئے

رہِ علم شک کی ہیں سیڑھیاں یہی ذہن زندہ کا ہے نشاں
جسے اختلاف میں ہو گماں وہ ہمیں نہیں جو بہک گئے

نہ نظر ملی نہ زباں کھلی مجھی پھر بھی دل کی نہ بے کلی
کبھی دور جا کے پلٹ پڑے کبھی پاس جا کے ٹھٹک گئے

چلی بادِ جبر اگر تو کیا مجھے یوں جہاں نہ بجھا سکا
مجھے راس آئی یہی ہوا مرا شعلے اور بھڑک گئے

مرے ذہن و دل کی بصیرتیں غمِ زندگی کی حقیقتیں
مرے لب پہ گیت نہیں ہیں وہ کہ جو پائلوں میں چھنک گئے

سنیں بامِ ہوش پہ جا کے کیوں تری ملا آیت بے مزہ
ابھی کوئے عشق میں رات کو وہ غزل سنی کہ بھڑک گئے

☆

مقامات

کوئی چالیس سال ہوئے اسی سرزمیں میں جناب جوشؔ ملیح آبادی نے ایک چھ شعر کا قطعہ جس کا عنوان تھا "پروگرام،، نظم فرمایا تھا اور یہ زمانہ،، میں شائع ہوا تھا. نہ جانے کیوں اصغر گونڈوی نے مجھ سے یہ اصرار کیا کہ میں بھی اسی ردیف اور قافیہ میں ایک قطعہ نظم کروں۔ میں نے تعمیلِ ارشاد میں یہ قطعہ لکھا لیکن اسے کسی پچھلے مجموعے میں جگہ نہ دی ۔ اب اسے اس مجموعے میں شامل کر رہا ہوں۔

ملا سے جسے شوقِ ملاقات ہو سن لے
کس وقت کہاں اور کس عنواں میں ملے گا
ہر صبح کو دفتر میں وہ قانون کا مزدور
مثلوں میں دبا حالِ پریشاں میں ملے گا
دن کو رگِ باطل کا وہ نشتر زنِ کامل
ہنگامہ فگن عدل کے ایواں میں ملے گا
اور شام کو فردوس کے باغی کا وہ دلبند
پیمانہ بہ کف محفلِ یاراں میں ملے گا
اور رات کو وہ خسروِ اقلیمِ معانی
گل ریز و گہربار شبستاں میں ملے گا

اور پچھلے پہر وہ، کوئی سنتا تو نہیں ہے،
خلوت گہِ آغوشِ حسیناں میں ملے گا
جس روز نظر آئے نہ وہ اپنی جگہ پر
اس روز تجھے شہرِ خموشاں ملے گا
تاریخ کے صفحات میں زاں بعد اسے ڈھونڈ
وہ تذکرۂ خاصۂ خاصاں میں ملے گا

اور بعد قیامت جو گزر تیرا وہاں ہو
حوروں کو لیے روضۂ رضواں میں ملے گا

☆

غزل

پستی حوصلۂ عام سے آگے نہ بڑھی
جو نظر حسن سر بام سے آگے نہ بڑھی
یہی کندہ ہے ہر اک تربت ناکامی پر
آرزو ولولۂ خام سے آگے نہ بڑھی
اس کی محفل میں گیا تھا کہ کہوں گا غم دل
گفتگو شکوۂ ایام سے آگے نہ بڑھی
نئی تنظیم چمن غم کا مداوا نہ بنی
یہ بھی رسم قفس و دام سے آگے نہ بڑھی
میں نے چاہا تھا بھلادوں تجھے اے دوست مگر
یہ خطا وہ تھی جو اقدام سے آگے نہ بڑھی
زیست دیتی ہی رہی شوق کو عنوان نئے
داستاں کوئی ترے نام سے آگے نہ بڑھی
کسی مقصد کی حرارت نہیں شامل تو حیات
گرمی رقص مے و جام سے آگے نہ بڑھی

مجھ پہ الزام خطا اور مجھے یہ افسوس
ہائے کیوں بات یہ الزام سے آگے نہ بڑھی
اُس کو کیا کہہ کے بتاؤں تجھے میرے ہمدم
اک خلش جو غمِ بے نام سے آگے نہ بڑھی
چشمِ آوارۂ ملا کی اڑی تھی تو خبر
شکر ہے حلقۂ اصنام سے آگے نہ بڑھی

☆

کنونیشن

(1)

بانسری چھوٹی سی ہونٹوں سے لگائے اپنے
صبح ہوتے ہی میں کوچوں میں نکل آتا تھا
اور گاتا ہوا پھرتا تھا ہر اک راہ پہ گیت
گیت جو خوشۂ گندم نے دیے آدم کو
اور گانے کی جنھیں ساحلِ تسنیم پہ رخصت نہ ملی
ڈر تھا معصومیت خلد نہ مٹ جائے کہیں
نبضِ تقدیس بھی پا جائے نہ گرمی خطا
بوئے انگور بھی کوثر میں نہ آ جائے کہیں
سیکھ جائیں کہیں حوریں بھی نہ ہوا کے چلن
گیت جو نور کی وادی میں تھے مٹی کی پکار
اور اس خاک پہ ہر دور میں ہر ملک میں جو گائے گئے
کبھی نظروں کبھی آہوں کبھی اشکوں سے فقط
مل گئی جب بھی کہیں
ابنِ آدم کی کسی دخترِ ہوا سے نظر
رس بھرے دکھ بھرے گیت
جسمِ بیدار کے اور دیدۂ بے خواب کے گیت
آہِ شب تاب کے اور عارضِ شاداب کے گیت

اور جب سن کے مرے گیتوں کو
کارواں زیست کا راہوں پہ ٹھہر جاتا تھا
اور ہو جاتا تھا ہر بام و دریچہ آباد
چمک اُٹھتی تھیں ہر اک مرد و زن و پیر و جوان کی نظریں
اور ملتی تھی مجھے دادِ سخن
شورِ تحسیں سے کبھی
زیرِ لب آہ کے پر سوز تکلم سے کبھی
تیز چلتی ہوئی سانسوں کے ترنم سے کبھی
اک لرزتے ہوئے آنچل کے تلاطم سے کبھی
میں سمجھتا تھا کہ میں ہوں کوئی فنکارِ عظیم
کوئی خلاق کلام
نور زادہ کوئی جو چھوڑ کے مسکن اپنا
دیوتاؤں کی طرح
سیر کرنے کے لیے عالمِ فانی کی ذرا
لیکے کچھ زندہ و تابندہ و پابند سرود
خاک کو بزمِ چراغاں کرنے
نغمہ و نور اندھیروں میں لٹانے کے لیے
آسمانوں سے اتر آیا تھا

(2)

اور اک روز یونہیں وقتِ سحر
اپنے خوابوں کے سجاتا ہوا رنگین محل
گنگناتا ہوا اپنا ہی کوئی نغمۂ عشق
ناز سے پاؤں اُٹھاتا میں چلا جاتا تھا
کہ سرِ راہ اچانک نظر آئی مجھکو

اک حسینہ

حسن جس کا فقط اک سحرِ خد وخال نہ تھا
جو محض ایک تقاضائے سن وسال نہ تھا
بلکہ اک عظمتِ ہستی کا ظہور
ایک قدرِ ابدی
جس میں اک شانِ خدائی کی جھلک
دیکھنے والوں کی نظروں کو بتادے جو حسیں
جو عبادت کو محبت کی طہارت دیدے
جیسے اک سربہ فلک کوہ بلند
وہ معجزہ کبھی لگتی تھی جواں سال کبھی
طفلِ معصوم کبھی
پھر بھی وہ جذب وکشش
اک فرشتے کو خطاؤں پہ جو مائل کردے
دلِ بے لوث کو دے کربِ تمنائے حیات
اس کی رفتار تھی وقتِ گزراں کا آہنگ
قلب گیتی کے دھڑکنے کا سرود
جیسے بہتی ہوئی رود
گرد میں بکھرے ہوئے بال اُنے
جیسے آئی تھی بڑی دور سے طے کرکے بیاباں کا سفر
زیبِ تن مَیلی سی اک چادرِ صد چاک فقط
جابہ جا جس پہ تھے خون وعرق واشک کے داغ
اور ہر چاک سے لَو دیتے ہوئے جسمِ فروزاں کا جمال
ابر کی گود میں اک صاعقہ نا آسودہ
اپنی مٹھی میں کلی جیسے گُلِ تر کو لیے
اور ان آنکھوں کی گہرائی میں گم ازل اور ابد

جن میں افسانۂ انساں کا ہر اک باب رقم
جن میں گزری ہوئی صدیوں کی پکار
دیکھ کر اس کو یہ محسوس ہوا
جیسے آج اپنے مقدر سے ملاقات ہوئی
جتنے سپنے تھے وہ سب ٹوٹ گئے
گیت آیا نہ کوئی ہونٹوں تک
رک گئے میرے قدم
اور خاموش سرِ راہ کھڑا محوِ تماشا میں ہوا

(3)

وہ قریب آتی گئی اور قریب اور قریب اور قریب
اور مری نبض کی رفتار بھی ہوتی گئی تیز اور بھی تیز اور بھی تیز
کہ مقابل مرے آ کر وہ گزرنے ہی کو تھی
میرا ہر قطرۂ خونِ جگر
اور ہر قطرۂ سوزاں کا سرودِ خاموش
اور جلتی ہوئی ہر سانس کا ناگفتہ پیام
ایک لو بن کے مری آنکھ میں تھا
بڑی مشکل سے مرے لب تلک آیا یہ سوال
''اے حسینہ ترا کیا نام ہے اور کون ہے تو؟''
اس نے کی میری طرف ایک اچٹتی سی نگاہ
جس کی بیگانہ وشی میں بھی عجب انس سا تھا
اور پھر ڈال کے نظروں میں مری اپنی نظر
چیر کر جو مری ہستی کی ہر اک تہہ مرے سینے میں اترتی ہی گئی
اس نے ہلکے سے کہا
''زندگی نام مرا''

کب سے بیتاب ہوں میں امن کے فردوسِ گریزاں کے لیے
کتنے صحراؤں سے گزری ہوں میں اس وادیِ انساں کے لیے
نہیں معلوم کہ باقی ہے مسافت کتنی
کتنی تاریک شبوں سے مجھے لڑنا ہے ابھی صبحِ درخشاں کے لیے
اور پھر کھینچ کے ہونٹوں سے یکایک مری نے
سنگریزوں پہ اسے دے پٹکا
ٹکڑے ٹکڑے ہوئی نے
اور ہوئی میرے گلو و دہن ولب سے رواں خون کی دھار
اور پھر ہاتھ بڑھا کر مجھے اس زور سے رستے سے ہٹایا اس نے
لڑکھڑا کر میں گرا ایک طرف
اور اسی چال اسی انداز سے وہ بڑھ گئی پھر سوئے افق

(4)

مجھ کو جب تک وہ نظر آئی میں دیکھا ہی کیا اس کی طرف
اور پھر جا کے جہاں ٹوٹی پڑی تھی مری نے
چاہتا تھا کہ اُٹھا لوں میں پھر اس کے ٹکڑے
کہ محسوس ہوا جیسے کوئی کان میں کہتا ہے مرے
اب یہ ٹوٹے ہوئے ٹکڑے نہ جڑیں گے ناداں
اور اگر جڑ بھی گئے
اب سمائیں گے نہ اس میں ترے گیت
اب ترے کام کی یہ نے نہ رہی
چھوڑ اوروں کے لیے اب یہ پرانے نغمے
رس بھرے دکھ بھرے گیت
جسمِ بیدار کے اور دیدۂ بے خواب کے گیت
آہ شب تاب کے اور عارضِ شاداب کے گیت

اب تری لے ہے ترا اپنا گلوئے زخمی
اب ترا سوزِ نوا ہی ہے ترا نغمۂ ساز
بھول جا اپنے غموں کو کہ یہ غم کچھ بھی نہیں
میں نے دکھ اپنے تجھے سونپ دیے
اس امانت کا نگہباں رہنا
اور پھر جیسے بڑی دور سے آواز آئی
"جا تجھے شاعرِ انساں کی سند دی میں نے
دیکھ تا زیست اس اعزاز کے شایاں رہنا"

☆

مجاہد

آج ہے مجاہد وہ جو یہ کام کر جائے
تیز کر کے دل کی لو
ظلمتوں کو چمکائے
موسم جراحت میں
ابرِ چشم تر لائے
جا کے بن میں کانٹوں کے
سبزہ زار لہکائے
گل فروش سانسوں سے
رہگوار .... مہکائے
لے کے چادرِ شبنم
برق سے لپٹ جائے
بنکے تارِ ابریشم
سنگ میں اتر جائے
اور وقت جب آئے
اپنے خوں کے سب قطرے
اپنے دل کے سب سپنے
اپنے لب کے سب نغمے
موت سے ملا کر آنکھ زندگی کو دیجائے
آج ہے مجاہد وہ جو یہ کام کر جائے

☆

شیطان کے غم

فردوس سے جس روز کسی کو نہ نکالا
جس روز جہنم میں کسی کو نہ ڈھکیلا
اپنے ہی غموں سے اسے فرصت نہ ملی جب
ہاں زیست میں شیطان کی ایسے بھی ہیں کچھ روز

☆

غزل

دل نغمہ ہائے شوق کسی کو سنائے تو
لیکن کوئی جبیں سے شکن بھی ہٹائے تو

مجھ کو گلہ نہ ہوگا جو سمجھے مجھے غلط
چُپ کو مری مگر کوئی معنی پنہائے تو

میں بھی ہوں ضبطِ عشق کا قائل مرے ندیم
نظروں میں جام لے کے کوئی مسکرائے تو!

بہتا ہو اس کے ساتھ تو بہہ جائے خونِ زیست
کانٹا جو دل میں ہے کبھی چٹکی میں آئے تو

کہنے سے تیرگی ہے مٹے گی نہ تیرگی
اس تیرگی میں شمع بھی کوئی جلائے تو

افشاں نہ ہونے دوں گا میں حد بھر تو رازِ غم
لیکن نظر کی ڈال شگوفے کھلائے تو!

چھوڑو ابھی یہ بات کہ تضحیک ہے کہ ربط
کیا کم ہے مجھکو دیکھ کے تم مسکرائے تو

غم ہی سہی مگر کبھی غم بھی تو دے بہار
لَو دے کے کوئی اشک بھی پرچم اڑائے تو

اردو زبان غیر ہے یہ شوق سے کہے
ملا سے لیکن آکے نگاہیں ملائے تو

☆

غزل

(چومصرعی)

جاتا ہے فردوسِ بشر تک
خوابوں کی وادیِ سحر تک
کرنوں کے اس نور نگر تک
گو شب ہی شب حدِ نظر تک

کتنے رشتے نکلے جھوٹے
کتنے کچے دھاگے ٹوٹے
ایک ایک کر کے ساتھی چھوٹے
شامِ طرب سے غم کی سحر تک

صحرا، صحرا، صحرا، صحرا،
صدیوں چل کر انساں پہونچا
زخمی، غمگیں، خستہ، پیاسا
دورِ قمر سے دورِ قمر تک

ہم نے دیکھا راہ کا ہر خم
ہم پر گزرا ہے ہر عالم
ہم سے پوچھو عشق کے موسم
سازِ نظر سے سوزِ جگر تک

خوں سے پانی بنتے بنتے

صرف تمنا ہوتے ہوتے
کیا کیا رنگ آنسو نے بدلے
آتے آتے سطحِ نظر تک

پھولوں کی صورت پہ نہ جاؤ
پنکھڑیوں کی تہ میں جھانکو
پردۂ شبنم چیر کے دیکھو
شعلہ ہی شعلہ ہیں اندر تک

درد کہیں ہم اپنا کس سے
پوچھیں غم کا مداوا کس سے
اپنی چال کا شکوا کس سے
پاؤں کی خاک آئی ہے سر تک

جنسِ حوّا ایک ہی فطرت
ایک ہی صورت ایک ہی سیرت
ایک ہی شعلہ ایک ہی آفت
بنتِ عنب سے بنتِ بشر تک

یاد سا ہے اس کو دیکھا تھا
اک شعلہ سا ہاں لپکا تھا
نفس نفس اک دیپ جلا تھا
آگ لگی تھی دل سے نظر تک

اِس کی ڈیوڑھی اُس کی ڈیوڑھی
کن کن ناگوں کی پوجا کی
اہلِ طلب پر کیا کیا بیتی
دیدۂ تر سے لقمۂ تر تک

خون ہوئی کتنی خودداری
آب نظر نے کتنی کھوئی

غیرت کتنے زینے اتری
اوجِ ہنر سے عرضِ ہنر تک
ملا کی باتوں پہ نہ جاؤ
آؤ اسے خلوت میں دیکھو
رندِ خوش خو، خوش ہیں، خوشگو
مُلّائی اس کی منبر تک

☆

غزل

(سہ مصرعی)

سجے بولتی ہے رات ابھی اپنے نام کی
جلدی سے خوں نچوڑ لیں رگ رگ سے شام کی
کل تک سحر رہے نہ رہے اپنے کام کی

ظلمت میں آؤ نور کے پرچم اڑائیں ہم
اک رات کوئے عارض و لب میں جگائیں ہم
سکے ہیں کچھ ابھی تو ہتھیلی میں جام کی

ہونٹوں کا ہو وہ پھاگ کہ ہو گھنگھروؤں کا راگ
وہ آنچلو کے ناگ ہوں یا چولیوں کی آگ
یارو، یہ بجلیاں ہیں سب اپنے ہی نام کی

اس نعمت حیات کی توہین کر نہ تو
اک سہمی سی بجھی سی سسکتی سی آرزو
تیرے ہی کام کی ہے نہ دنیا کے کام کی

سب دل کی دھڑکنوں کو ملا کر بس ایک تال
اک رات ہی میں ڈال دیں سب آرزو کے سال
اک بوند میں انڈیل لیں سب اپنے جام کی

ہر جام میکدے کی بنے زرنگار اینٹ
چھلکائیں بادہ یوں کہ پڑے آسماں پہ چھینٹ
تارے کچھ اور ڈال دیں جھولی میں شام کی

زاہد ابھی کسے ہے ثواب و خطا کا ہوش
جو چاہے کہہ رہے گی ہماری زباں خموش
اپنی طرف سے ہم نے تو حجت تمام کی

آخر رہی نہ راز کسی شب کی داستاں
کل صحنِ میکدہ میں ملیں چند پرچیاں
کچھ تیرے نام کی تھیں تو کچھ میرے نام کی

تقریر گل فروش نہ صورت ہی لالہ فام
دنِ رکعتوں کی نذر تو شب کروٹوں کا نام
کس بت سے لڑگئی مرے قبلہ مقام کی

اتنی سی بات صرف کہ وہ مسکرا دیے
اور اپنے اپنے یاروں نے ٹکڑے لگا دیے
کیا کیا حکایتیں ہیں ہمارے سلام کی

یہ گرم خوں کی رُت ہے یہ ہے دل کی چاندرات
آئے گی کل سحر تو وہ آئے مگر یہ بات
ہم تو نہ کہہ سکیں گے حسینہ سے شام کی

تھا عشق سادہ لوح تو محفل میں بے زباں
اس شوخ نے نگاہوں نگاہوں کے درمیاں
گنجائشیں نکال لیں کیا کیا کلام کی

کرتے ہیں مدح آج جو آ کے سامنے
نظریں بچھا رہے ہیں جو ملا کے سامنے
کل دھجیاں اڑائیں گے ملا کے نام کی

☆

غزل

گلشن ہے اسی کا نام اگر، حیراں ہوں بیاباں کیا ہوگا
ہنگامِ بہاراں جب یہ ہے انجامِ بہاراں کیا ہوگا
ساقی کے دیارِ رحمت میں ہندو و مسلماں کیا ہوگا
اس بزمِ پاک نہاداں میں آلودۂ ایماں کیا ہوگا
یہ جنگ تو لڑنا ہی ہوگی ہر برگ سے چاہے خوں ٹپکے
کانٹوں سے جو گل ڈر جائے گا دارائے گلستاں کیا ہوگا
الفت کو مٹانے کے درپے دنیا، اور میں اس سوچ میں ہوں
اُلفت نہ رہے گی جب باقی خوابِ دلِ انساں کیا ہوگا
میں دور بھی تم سے جی لوں گا تم میرے لیے کچھ غم نہ کرو
مانا کہ پریشاں دل ہوگا ایسا بھی پریشاں کیا ہوگا
جس ہاتھ میں ہے شمشیر و تیر کیا اس سے اُمیدِ برگ و ثمر
جو شاخِ نشیمن توڑے گا معمارِ گلستاں کیا ہوگا
کس شے پہ ابھی ہم جشن کریں، ہر سُو کانٹے کوڑا کرکٹ
کچھ رنگ چمن آئے تو سہی گھورے پہ چراغاں کیا ہوگا

جو تشنہ لبوں کے حق کے لیے ساقی سے لڑے وہ رند کہاں
جو دست و دہاں کا خوگر ہے وہ دست و گریباں کیا ہوگا

ساقی کی غلامی کرلے گا اور وہ بھی کچھ قطروں کے لیے
نادان سہی ملاّ لیکن اتنا بھی وہ ناداں کیا ہوگا

آوازِ ضمیر اپنی سُن کر ملاّ نے بتالی راہِ عمل
یہ فکر کبھی اس کو نہ ہوئی اندازِ حریفاں کیا ہوگا

☆

نقاد

(1)

ان سے ملیے
یہ ہیں اک نقادِ عظیم
ان کی فطرت، ان کا مزاج
اونٹ سے ملتا جلتا ہے

فن کے کوہستانوں میں
جہاں کھڑے ہیں اونچے درخت
ہاتھ بڑھا کر جو اپنا
توڑ کے تارے لاتے ہیں
گردوں کی انگنائی سے
وہاں یہ جاتے ڈرتے ہیں
کوئی نیچی ڈال، شریر
کہیں نہ ان کے کوہڑ کو
سہلا کر غصیل کر دے

(2)

اِن سے ملیے
یہ ہیں اک نقادِ عظیم
اِن کی فطرت، ان کا مزاج
اونٹ سے ملتا جلتا ہے

شعروادب کے گلشن سے
ان کو کوئی کام نہیں
سیب ہو آڑو یا انگور
سب سے رہیں گے دور ہی دور
ٹہنی پتی پھل یا پھول
ان کی نظر میں کچھ بھی نہیں
گلشن ان کے واسطے موت
بھوکے مرجائیں یہ وہاں
ان کا پیٹ جو بھرنا ہو
دو اِن کو کانٹوں کا پلاؤ
ناگ پھنی کے چند کباب
پھر دیکھو کس تیزی سے
ان کے جبڑے چلتے ہیں

(3)

اِن سے ملیے
یہ ہیں اک نقادِ عظیم
اِن کی فطرت، ان کا مزاج
اونٹ سے ملتا جلتا ہے
صحرا اِن کا پائیں باغ

560

ریت ہے ان کا فرشِ گُل
جہاں نہ سبزہ ہے نہ درخت
جہاں یہ سب سے اونچے ہیں
جہاں بس اِن کے پیٹ میں ہے
چُلّو دو چُلّو پانی
اور کہیں قطرہ بھی نہیں

ان سے ملیے
یہ ہیں ادب کے اونٹ

567

کوئی دلیل چلے جب ، کوئی گھات چلے
بھٹک گئے ہیں رہِ زیست سے قدم میرے
تمھیں یہ غم ہے تو پھر کیوں نہ میرے سات چلے
یہ میرے آتے ہی کیوں چپ سے ہوگئے یارو
سناؤ ہاں مری کوتاہیوں کی بات چلے
ہم اپنے آپ خود اپنا زمانہ ہیں اے دوست
وہ اور ہیں جو زمانے کے سات سات چلے
ابھی ہے خیر نکل آؤ بزم سے ملا
نہ جانے کب یہاں جوتا چلے کہ لات چلے

☆

غزل

وہ دورِ گُل رہا نہ رہی وہ ہوائے گُل
کانٹوں کی انگلیوں میں ہیں بندِ قبائے گُل
میں بھی چمن پرست ہوں میں بھی فدائے گُل
لیکن کسی روش پہ نظر بھی تو آئے گُل
گلچیں ہے ہر نگاہ تو ہر کف ہے گُل فروش
کس کو غمِ حیات میں اپنا بتائے گُل
میں کیا سمجھ سکوں ترے آئینِ عدل کو
کانٹوں کا بھی تو ہی تو خدا ہے خدائے گُل
دو دن کی زندگی میں بھی نشتر ہر ایک سانس
کن کن جراحتوں کو تبسّم بنائے گُل
اوروں سے پھر کہے کہ لہو دیں چمن کو وہ
پہلے ذرا کچھ اپنا پسینہ بہائے گُل
تاریخِ گلستاں تو ہے سبزے کی داستاں
یہ نالہ ہزار نہ یہ خندہ ہائے گُل
اب ہر ہنسی پہ قید ہے ہر پنکھڑی کی ناپ
شاید غرض یہی ہے کہ جینے نہ پائے گُل

یہ انقلاب ہے تو نہ دکھلایہ انقلاب
کانٹوں کے لب پہ خندہ ہو آنسو بہائے گل
گلچیں ہے پُر فریب عمل اور قول اور
نعرہ بنام سبزہ و سجدہ بہ پائے گل
ملا اور اک صنم کا بہت اِن دنوں ہے ساتھ
ڈرتا ہوں ساتھ یہ نہ کہیں کچھ کھلائے گل

☆

شملہ کے دیودار

سہی قد دیودارو! اے پہاڑوں کے نگہبانو!
صف اندر صف قطیں کوہ پر اس طرح باندھے
تمھیں نے اے ستونو! اپنے سر پر تھام رکھا ہے
فلک کے گنبد نیلی کے ایوان درخشاں کو

تمھیں تو اس زمیں پر زندگی کا باب اوّل ہو
تمھیں نے سنگ کی چھاتی میں خونِ گرم دوڑایا
جمودِ خاک میں اک نغمہ جوشِ نمو چھیڑا
طلوعِ ابنِ آدم کے فسانے سے بہت پہلے
مقدس سادھوو! سنتو!
تپسوی یوگیو! رشیو!
نہ جانے کب سے تم یونہیں کھڑے ہو اپنا دم سادھے
فقط اک ٹانگ پر اپنی
ذرا سی جنبشِ پا تک نہیں ہوتی
تمھارے پیر کے ناخن نکیلے تیز گھس کر

اترتے ہی چلے جاتے ہیں چٹانوں کے سینہ میں
اور اپنے لمبے لمبے سیکڑوں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں ہاتھوں سے
گھنے سایے میں اپنے لے لیا ہے تم نے دھرتی کو

جہاں کے سب سے جنگی پھیپھڑوں والے ہوا خورو!
فضا کا زہر پی جاتے ہو سارا اپنی سانسوں میں
ہر اک شعلہ کی ساری برق خوئی اور شرر باری
تمھاری ان خنک بانہوں کو پا کر سو سی جاتی ہے
تمھاری چھاؤں میں ہر دھوپ آ کر کھو سی جاتی ہے
ہر اک فریاد، نالہ، چیخ، شیون، گریہ وزاری
ہر اک دل کی تڑپ ہر بے قراری ہر پریشانی
تمھاری خامشی میں جذب ہو کر ڈوب جاتی ہے

جہاں کے عہدِ طفلی کے رفیقو اور دم سازو!
میں جب بھی اپنے غم لے کر تمھارے پاس آیا ہوں
تمھاری گود میں سر رکھ کے پایا ہے سکوں میں نے
مرے جلتے ہوئے زخموں پہ تم نے پھائے رکھے ہیں
مجھے پھر سے ملا ہے زندگی کا حوصلہ تم سے
فسردہ دل کو پھر سے تازگی تم نے عطا کی ہے
مرے ادراک کو تم نے دیا ہے اک نیا عرفاں
یہ کچھ سانسوں کا جینا، اور یہ وقتی سے ہنگامے
یہ دو اشکوں کے غم یہ چار لمحوں کی پریشانی
یہ دو ٹانگوں کے کیڑوں کی لڑائی ایک گھورے پر
ازل زادو!
ابد کے رازدارو!

آسماں یارو!
تمھاری چھاؤں میں آ کر یہ سارے ہیچ لگتے ہیں
مجھے لگتا ہے جیسے تم
مری بے مائیگی غم پہ چپکے چپکے ہنستے ہو
اور اپنی بے قراری پر
میں خود شرما سا جاتا ہوں

☆

غزل

بجھاؤ مہر کو تاروں کی پھر برات چلے
زباں خموش اگر ہو تو دل کی بات چلے
اسی کو راہ کا عرفاں ہے، غم اسی کا ہے غم
جو سوزِ دل میں لیے سازِ کائنات چلے
قفس کے دار و رسن کے ہر اک زباں پہ سخن
ترس گئے کہ کبھی آشیاں کی بات چلے
مٹے نہ نرمیِ شام و سحر جہاں والو
کہیں سے دن بھی چلے جب کہیں سے رات چلے
سمجھ لے حسن کہ الفت ہے جاں بہ لب جس وقت
نہ کام آئے تغافل نہ التفات چلے
بجھی بجھی سی فضا ہے دلوں کی، اشک جلاؤ
نظر سے برف جو پگھلے تو کوئی بات چلے
اسی کے نقشِ قدم دلن کو پھول شب کو چراغ
جو اپنے ہات میں بیکس کالے کے ہات[1] چلے
مقام جرأتِ رندانہ ہے یہی شاید

---

[1] ہات (ہاتھ) اور سات (ساتھ) کا قافیہ اصولاً غلط ہے مگر میرا ذوق قبول کرتا ہے۔

اے مطرب تیرے ترانوں میں اگلی سی اب وہ بات نہیں
وہ تازگیِ تخئیل نہیں بے ساختگیِ جذبات نہیں
تو بھول گیا اپنے نغمے کچھ فرق مرے کانوں میں نہیں
تاثیر جو دل پر کرتی تھی وہ لے ہی تری تانوں میں نہیں
شوریدہ سری الفت کی گئی اب عقل کی ریزہ کاری ہے
فرہاد کی بیتابی کے عوض پرویز کی حیلہ سازی ہے
میں جس کا جویا ہوں گنجینہ میں تیرے گوہر وہ نہیں
سامانِ فریبِ عقل تو ہے جو دل میں چبھے نشتر وہ نہیں
اس گلشن سے تجھ کو نسبت اب جز نکہتِ گلچیں نہ رہی
اب تیری زباں حق گو نہ رہی اب تیری نظر حق بیں نہ رہی

☆

بزمِ دوں

بزم دوں! مجھ پہ ترا کوئی اجارا تو نہیں
کسی ہُنڈی کو تری میں نے سکارا تو نہیں
میں گرا خاک پہ، ڈھونڈا مگر اٹھنے کے لیے
کالی باہوں کا تری کوئی سہارا تو نہیں
اپنے ہی دل کی تجلی لیے ظلمت سے لڑا
تیری راتوں سے چرایا کوئی تارا تو نہیں
مجھکو محفل سے اُٹھایا، مرا ساغر توڑا
کسی ساقی کو ترے پھر بھی پکارا تو نہیں
آخری سانس تلک تجھ سے لڑوں گا سن لے
لاکھ کمزور ہوں تجھ سے کبھی ہارا تو نہیں

☆

غزل

اپنے نہ رہو ہر بات میں تم غیروں کے سہارے ہوجاؤ
اس سے پہلے بہتر ہے یہی بھگوان کو پیارے ہوجاؤ
دونوں کو اسی پر چلنا ہے کیوں راہ پہ ہم تم ٹکرائیں
ہم بھی ہٹالیں اپنے قدم کچھ تم بھی کنارے ہو جاؤ
ہم تو نبھ پر تمکو بھیجیں دھرتی کا دیا بننے کے لیے
اور تم آکاش پہ جاتے ہی دُم دار ستارے ہوجاؤ
دنیا ہے اکھاڑا طاقت کا کمزور ہی مارے جاتے ہیں
جینا ہے اگر اس دنگل میں کچھ تم بھی کرارے ہوجاؤ
من کے ناتے کو کیوں توڑو سیدھا نہ سہی الٹا ہی سہی
تم دوست نہیں بنتے نہ بنو دشمن ہی ہمارے ہوجاؤ
اس سے پوچھو مجبوری کو جس پر یہ عالم بیتا ہو
ہونٹوں پہ دہکتی ہوں باتیں چُپ خوف کے مارے ہوجاؤ
سنسار کے سارے دُکھ بھولوں اب یوں بھی نہ مجھ کو یاد آؤ
دنیا کی طرف جائے نہ نظر اتنے بھی نہ پیارے ہوجاؤ
یہ جگ ہے لیٹروں کی نگری اِکتے دُکتے کی خیر نہیں
پتھ کوئی چنو لیکن پتھ پر سارے ہی کے سارے ہوجاؤ
کشتی سے دھارا کیا چھوٹا جیسے ندی ہی روٹھ گئی
کہتے ہیں چھچھورے تنکے بھی ہٹ جاؤ کنارے ہوجاؤ
ملا بھی تمھارا ہے ساجن ممکن ہو اگر تم سے تو کبھی
آتے جاتے اسکے دوارے بھی سانجھ سکارے ہوجاؤ

☆

غزل

وہی اک سوزِ جگر جانِ ہر افسانہ بنا
کہیں انساں کہیں بلبل کہیں پروانہ بنا

خواب ٹکرائے حقیقت سے تو بچھڑے دو دوست
دو نگاہیں ملیں اور پھر کوئی افسانہ بنا

اجنبیت سی رہی اس کی نظر میں جب تک
مَیں بھی بیٹھا رہا اس بزم میں بیگانہ بنا

حرم و دیر ملے ہیں نہ ملیں گے یہ کبھی
راہ اک ساقیا میخانہ بہ میخانہ بنا

پیترے اپنے لیے بیٹھے ہیں اس بزم میں سب
کوئی دانا کوئی ناداں کوئی دیوانہ بنا

عقل تو دوست ہے انساں کی دشمن تو نہیں
جس میں دل سانس نہ لے پائے وہ دنیا نہ بنا

کتنے خورشید بجھے کتنے ستارے ٹوٹے
تب کہیں جاکے کسی رند کا پیمانہ بنا

حق پرستی لب بیباک و نگاہ آزاد
انھیں اصنام سے ملا کا صنم خانہ بنا

☆

غزل

کسی دانا کو کہا بزم نے دیوانہ سُنا
میرے ہمدم مجھے میرا ہی فسانہ نہ سُنا

مے سے پر ہونے لگا ہے کوئی جامِ انگور
پھر کسی آنکھ میں کھلنے کو ہے میخانہ سُنا

میں حقیقت سے بہت دُور بھٹک آیا ہوں
اے محبت مجھے اپنا کوئی افسانہ سنا

یہ یقیناً مرے احباب کی محفل ہوگی
میں نے اک حرف بھی اپنے لیے اچھا نہ سنا

لبِ ہر شمع فسردہ پہ ہے پھر دعویٔ نُور
آگیا پھر کوئی نادان سا پروانہ سُنا

چشمِ ساقی نے سرِ بزم چھپایا جس کو
راز رندوں نے وہ پیمانہ بہ پیمانہ سُنا

نہ کسی بام پہ رسوا نہ کسی بزم میں مست
ہم نے ملا کا سا شاعر کوئی دیکھا نہ سنا

☆

ہپی

کل سرِ راہ مل گیا مجھ کو
ایک ہپّی نہ جانے زن یا مرد
بالیاں کانوں میں گلے میں ہار
موے سربار دوش پیٹھ کا درد
ننگے سرپاؤں میں پھٹی چپل
سر سے پاتک بدن پہ غازۂ گرد
صُلح اتنی مذاقِ بزم سے صرف
جسم کی آڑ جانگیہ اک زرد
گیسوؤں میں جنوں جواں زندہ
ہر نظر سرخیِ حدیثِ نبرد
ایک جھولے میں کل متاعِ حیات
ایک شانے پہ زیست راہ نورد
میں نے پوچھا مرے جواں باغی
کون سودا ہے؟ دل میں ہے کیا درد؟
بولا تم کیا سمجھ سکو گے بھلا
خوں تمھارا رواجوں سے ہے سرد

نسلِ انساں غلام ہے اب تک
انجمن میں ابھی اسیر ہے فرد
آج دو پیڑیوں میں ہے اک جنگ
سن رسیدہ سے نوجواں کی نبرد
سبز پتے اُبھر نہیں پاتے
شاخ پر یوں جمے ہیں برگِ زرد
خوانِ پیری پہ گرم نان و کباب
نوجوانوں کے واسطے دمِ سرد
آج ہے مورچہ جمائے ہوئے
بزم کے سامنے برہنہ فرد
میرے ساتھ آؤ بنکے دیوانہ
ذہن انساں سے جھاڑدیں کچھ گرد
کھوکھلی ہو چکیں ہیں سب قدریں
راہِ اخلاق صرف گرد ہی گرد
ان عقیدوں میں کوئی تاب نہیں
جن پہ صدیوں کی جم چکی ہے گرد
علم کا کاروان وہاں پہونچا
آسمانوں سے چھن رہی ہے گرد
چشمِ انساں میں کوئی خواب نہ ہو اب
دلِ انساں میں کوئی درد نہ درد
جسم ہی جسم کی ہے ساری بھوک
اور یہ بھوک ہی ہے سارا درد
ہو چکا کہنہ یہ نظام جہاں
اک نئی انجمن بنائے گا فرد
میں نے پوچھا کہ حشر کیا ہوگا

مان لو انجمن سے جیتا فرد
اس نے یہ سن کے قہقہہ مارا
جس کی ہر لے میں اک پیام نبرد
اور الٹ کر سوال مجھ سے کیا
''شعلہ با چوبہائے خشک چہ کرد''

☆

گرونانک

(پانچ سو سالہ جشن پیدائش کے موقع پر پٹنہ میں)

کثافت زندگی کی ظلمت میں شمعِ حق ضو فشاں ہو کیسے
جہاں کی بجھتی ہوئی نگاہوں کو جگمگاتا ہے بامِ نانک
نہ پاک کوئی نہ کوئی ناپاک کوئی اونچا نہ کوئی نیچا
گرو کا یہ میکدہ ہے اس جا ہر اک کو ملتا ہے جام نانک
یہاں مٹے آ کے تفرقے سب، رہی نہ آلودگی کوئی بھی
یہ حرفِ الفت، طورِ عرفاں، یہ عرشِ انساں یہ نامِ نانک

~~~~~~

☆

فطرت

سوئی سے چھد گیا پارے کا جگر بھی ملا
مگر اک مرد کی آوارہ نگاہی نہ گئی
اور عورت کے خیالوں کا بھٹکنا نہ گیا
~~~~~~

☆

غزل

سینوں کے کھنڈر آنکھوں کے ویرانے ملیں گے
جس شہرِ خموشاں میں نہ میخانے ملیں گے

حل پائے ہیں اب تک نہ یہ فرزانے ملیں گے
اک روز انھیں روند کے دیوانے ملیں گے

یہ جنت ساقی ہے کھٹکتے ہیں یہاں دل
مے خوار بدلتے ہوئے پیمانے ملیں گے

وہ کنجِ طرب چھوٹ گیا، وحشتِ غم آیا
اب آج سے بیگانے ہی بیگانے ملیں گے

بکھرے ہوئے زینوں پہ ہر اک بامِ خرد کے
کچھ واہمے کچھ خواب کچھ افسانے ملیں گے

اے شمع نہیں ملنے کے یونہیں تو پرستار
جب خود کو جلائے گی تو پروانے ملیں گے

بیکس کے لیے بھی تو کوئی سایۂ دیوار
دیووں ہی کو کب تک یہ پری خانے ملیں گے

یہ نیک ہے، وہ بد نہیں آساں یہ بتانا
جس خانے میں جھانکو گے نہاں خانے ملیں گے

وقتِ گزراں بھی نہ مٹا پائے گا مجھ کو
جب میں نہ ملوں گا مرے افسانے ملیں گے
یہ راہِ جنوں ہے یہاں رکھ پاؤں سنبھل کر
ہر گام پہ دم توڑتے فرزانے ملیں گے
دنیا ترے گلشن نہ قریب آئے اگر آج
پھر کل ترے ویرانوں سے ویرانے ملیں گے
سانچوں میں پرستش کے خدا ڈھال لیے ہیں
ہر دل میں بس اپنے ہی صنم خانے ملیں گے
جو پائے حقیقت اِدھر آ روئے خطا دیکھ
نیکی کی نقابوں میں تو افسانے ملیں گے
کی مصلحتِ وقت سے اس نے نہ کبھی صُلح
ملا کے سے دو چار ہی دیوانے ملیں گے

☆

اِتمامِ حُجّت

خاک کی بستیوں میں ہر جانب
ہے خبر گرم اک زمانے سے
داستانِ زمیں کے ختم کے بعد
کسی وادی میں آسمانوں کی
ایک میلا بہت بڑا ہوگا
(جیسا اب تک ہوا نہ ہوگا کبھی)
جس میں ساری خدائی جائے گی
اور وہ حرفِ اوّل و آخر
خالقِ خاک و آب و آتش و باد
مالکِ خلد و دوزخ و اعراف
اپنے سارے جلال و حسن کے ساتھ
اپنے سارے پیمبروں کو لیے
رعد اور برق کی سواری پر
آگے آگے جلوسِ ماہ و نجوم
پیچھے پیچھے پرے فرشتوں کے
اپنے رنگین پر اٹھائے ہوئے
آ کے اک بارگاہِ عالی میں

بڑی اونچی سی ایک مسند پر
جلوہ افروز ہوگا شان کے ساتھ
ایک دربار منعقد ہوگا
باری باری ہر ایک کی پیشی
اس عدالت کے سامنے ہوگی
چارج شیٹیں لگائی جائیں گی
بے زبانوں کو بھی ملے گی زباں
جھوٹ ہونٹوں پہ آنہ پائے گا
سارے مکر و فریب کے پردے
سرِ اجلاس اُٹھائے جائیں گے
چیرے جائیں گے جسم سے خرقے
داڑھیوں کو اتار کر چہرے
ننگے کر کے دکھائے جائیں گے
اور عطا و سزا کے حکم کے بعد
دو بڑے قافلے رواں ہوں گے
خلد و دوزخ کے پھاٹکوں کی طرف
اور اس شو کو دیکھنے کے لیے
سب میں نامی گناہگار جو ہیں
سب سے آگے بٹھائے جائیں گے
مجھ کو یہ ڈر لگا کہ میں پھنس کر
دور پیچھے کہیں نہ رہ جاؤں
اور اچھی طرح نہ دیکھ سکوں
ننگے چہروں کے اصل خال و خد
برہنہ جسم خرقہ پوشوں کا
داخلے کے ٹکٹ کی کھڑکی پر

دُم میں ''رکیو'' کی اٹک نہ جاؤں کہیں
قبل اس سے کہ میرا نمبر آئے
ساری سیٹیں کہیں نہ بھر جائیں
اس نزاکت کا سامنا کرنے
اک یہی حل مجھے نظر آیا
میں نے حُجت تمام کرنے کو
اور از راہِ احتیاطِ مزید
ایک کے بعد ایک تابڑ توڑ
بے تحاشا گناہ کر ڈالے
اور اپنے رکارڈ...... کے بل پر
میں نے اس وادگاہِ آخر کی
صفِ اول میں سیٹ بُک کر لی

☆

غزل

دم کیوں نہ لگے چرخ نشینوں کا نکلنے
ذرّے اٹھے تقدیر ستاروں سے بدلنے

مظلوم سے اس وقت ستمگار خبردار
خاموش تبسم میں فغاں جب لگے ڈھلنے

کم ظرف تو کم ظرف اسے لاکھ اٹھاؤ
چھوڑا جہاں لگتا ہے یہ شانوں سے پھسلنے

رندوں کو بھی کچھ دم کی حکومت ملے ساقی
اک بار تو دے شیخ کی پگڑی کو اچھلنے

ہر گام پہ اک کشمکشِ بیم و رجا ہے
یہ دل مجھے دیتا ہے نہ گرنے نہ سنبھلنے

ہر آن بدلتی ہوئی قدروں کے جہاں میں
کس آج کو روکا کسی گزرے ہوئے کل نے

چلتے نہیں دنیائے غرض میں درمِ دل
پھر آئی حقیقت مرے خوابوں کو کچلنے

لے آیا کہاں جہدِ بقا نسلِ بشر کو
خود پھول لگے اپنی ہی کلیوں کو مسلنے

دے موت مجھے اور یہ غربت مری لے لے
مردہ نہ اٹھا موت کو غربت سے بدلنے
حق گوئی ملا پہ نہ آیا کبھی وہ وقت
اگلے ہوئے الفاظ پڑیں اس کو نگلنے

منفرد اشعار

☆

اکیلا غم کی سیہ شب میں خستہ پا انساں
ازل سے جنت گم گشتہ کی تلاش میں ہے

~~~~~~

میں تجھ سے مل تو چکا ہوں ہزار بار مگر
سلگ رہی ہے ابھی دل میں انتظار کی آگ

~~~~~~

آرزو پوری نہ ہوتی تو نہ ہوتی، غم نہ تھا
غم تو یہ ہے آرزو کا حوصلہ جاتا رہا

~~~~~~

ارتقا کی داستاں اب تک تو انساں کے لیے
آنسوؤں کا ایک دریا ہے کہ بہتا جائے ہے

~~~~~~

امن کی اس جنگ خو دنیا میں سنتا کون ہے
ہر پیامِ صلح صحرا کی اذان بنتا گیا

~~~~~~

ہم اہلِ دل کا زاہد زیست میں بس ایک مسلک ہے
جہاں سر خود بہ خود جھک جائے اس کو آستاں سمجھو

~~~~~~

بے اِرادہ قہقہوں پر قہقہے دیوانہ وار
یوں بھی آتی ہے ہنسی جب دیر تک آتی نہیں

~~~~~~

تجھ سے کیا اُوبتا کبھی اے زیست
تجھ کو جی بھر کے پیار ہی نہ کیا

~~~~~~

شاید وہ خود ہی چل سکے زندگی کے ساتھ
جن کی زباں پہ ہے کہ زمانہ بدل گیا

~~~~~~

زیست فنکار کی آلودۂ دنیا تو ہوئی
چشمِ فنکار کی معصوم نگاہی نہ گئی

~~~~~~

بچ گئی دام سے ماہی تو نہیں خوش پھر بھی
اب اسے غم ہے کیوں دام میں آ ہی نہ گئی

~~~~~~

خونِ شہید سے بھی ہے قیمت میں کچھ سوا
فنکار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند

~~~~~~

اس نظر کا فریب کیا کہیے
ماں کی چھاتی سے شیر خوار ہٹے

~~~~~~

تیری الفت کا گیا وار نہ خالی اے دل
وہ تغافل کی سپر لینے پہ مجبور ہوا

~~~~~~

سنسکرت ادب سے ماخوذ نظمیں

☆

پاپی بدرا

بدرا کیسا پاپی ہے
میں پیا ملن کو جاتی تھی
لیکن تو نے
رستے میں یکایک گھیر لیا
پہلے تو گرج کر دھمکایا
میری ساری سدھ بدھ کھوئی
میں ڈری لجائی اور کانپی
پھر اپنی لاکھوں انگلیوں سے
پتلی پتلی ٹھنڈی ٹھنڈی
تو نے میرا ہرا انگ چھوا
اور روئیں روئیں کو چوم لیا،

☆

ناممکن

یہ ممکن ہے کہ بالو پیتے پیتے تیل دے نکلے
یہ ممکن ہے کہ پیاس اپنی بجھا لو تم سرابوں سے
یہ ممکن ہے گدھے کے سر میں بھی اک سینگ پیدا ہو
مگر پیدائشی احمق کے بنجر ذہن کو چاہے
ہزاروں سال تم سینچو کوئی اکھوا نہ پھوٹے گا

☆

چارپائے

اگر تم اس کی نظروں سے ملا کر اپنی نظروں کو
اگر تم دیکھ کر اس کے جمال ہوش دشمن کو
حواس اپنے نہیں کھوتے
تو میں ہوں سخت حیراں پھر بھی یہ تسلیم کرتا ہوں
تمھارا مرتبہ اونچا بہت ہے چارپایوں میں

☆

ساہوکار کی دعوت

بڑی دعوت ہے مہمانوں پہ مہماں آتے جاتے ہیں
محل میں ایک ساہوکار کے جشنِ چراغاں ہے
لدی ہیں میزیں یوں کھانوں سے ٹانگیں لڑکھڑاتی ہیں
ہر اک سو لذتِ کام و دہن کی آزمائش ہے
مگر ایواں سے باہر
نکل کر اپنی اپنی جھونپڑیوں کے اندھیروں سے
غریبوں کے بھی کچھ بچے کھڑے ہیں ایک کونے میں
بدن چپکے ہوئے اک دوسرے کا ہاتھ تھامے مٹھیاں بھینچے
نظارہ کر رہے ہیں کھانے والوں کا دریچے سے
کبھی جب شورِ نوشا نوش زیادہ تیز ہوتا ہے
تو کچھ شرما کے وہ اپنی نگاہیں پھیر لیتے ہیں

☆

بیلوں کی جوڑی

کسی ہل میں یہ جوتے جانے کے قابل
نہ یہ کوئی بوجھا اٹھانے کے قابل
یہ مندر کے آنگن کے بیلوں کی جوڑی
یہ چربی ہی چربی نکمی نگوڑی
مگر بات سچی یہ کہنا پڑے گی
ہر اک بیل سے اِن کی خوراک اچھی
کسی میں یہ شوخی نہ یہ بلبلاہٹ
نہ سینگوں کے تاجوں کی یہ جگمگاہٹ

☆

اتراشحنہ

پیڑ کی ٹوٹی ہوئی ڈال بھی کام آتی ہے
کھیت بنجر بھی ہوا جب تو وہ بیکار نہیں
بامِ طاقت سے گرا کوئی تو پھر اس کے لیے
تختۂ دار ہے یا گوشۂ گمنامی ہے

حسین مالن

میری حسین مالن
کیا بیچتی ہے بتلا
یہ ٹوکری کے گل ہی
یا شاخ کے ثمر بھی
یا ساتھ ساتھ دونوں

☆

عیّارہ

رات تاریک تھی اندھیرے میں
اپنی ہم ذوق اک سہیلی سے
کر رہی تھی وہ راز کی باتیں
کس طرح اس سے اس کا شیدائی
چھپ کے کر جاتا ہے ملاقاتیں
پیار کی سب لگاوٹیں گھاتیں
کہ یکایک اسے یہ شک سا ہوا
اس کا خاوند بھی ہے پاس کہیں
اس نے اک قہقہہ لگا کے وہیں
ایک ٹکڑا یہ اور جوڑ دیا
اور پھر آنکھ کھل گئی میری

☆

دوشیزہ

یہ ادھ کھلا غنچہ جو مہکتا ہے سرِ شاخ
جس کا ہرا آنچل نہیں سرکا ہے ابھی تک
جس کو نہ چھوا ہے کسی انگلی نے ابھی تک
آلودگیِ دست ہوس سے ابھی محفوظ
اک دُر جو صدف ہی سے ابھی جھانک رہا ہے
لَو دیتا ہوا دیپ نمایاں بھی نہاں بھی
انگور چھپائے ہوئے صہبا کا خزانہ
ارمان بھرے دل کے ہر اک خواب کی تعبیر
اک جسم کو سونپی ہوئی جنت کی امانت
بھرپور اک انعام
اس خاک پہ وہ کون ہے انسان کا بیٹا
یہ جس کے لیے ہے

☆

پتی ورتا

اس کی سہیلی اس سے بولی
کیا تو اپنا سارا جیون ترس ترس کر
دکھ سہ کر
یوں ہی اکیلی کاٹے گی
اور یہ تیرا
نردئی اور ہرجائی شوہر
تجھ کو یوں ہی ستائے گا
کچھ ہمت کر
چھوڑ دے اس کو
کیوں یوں خود کو مٹاتی ہے
وہ گھبرائی
جلدی سے ہاتھ اس نے منہ پر
اپنی سہیلی کے رکھا
اور کہا آواز دبا کر
میرے من میں میرا پریتم
سوتا ہے اک کچی نیند
دھیمے بولو
جاگ نہ جائے اور سن لے

☆

تمھیں بتلاؤ کیا کہہ کر بدا تم کو کروں ساجن

تمھیں بتلاؤ کیا کہہ کر بدا تم کو کروں ساجن
اگر کہتی ہوں ''مت جاؤ''
تو ڈرتی ہوں سمجھ بیٹھو نہ اس کو بدشگونی تم
''سدھارو جاؤ'' یہ بھی تو زباں پر لا نہیں سکتی
محبت کی زباں پہ جھوٹ کیسے بول سکتی ہے
''نہ جانے دوں گی میں تم کو''
مگر اک پریم کی داسی حکومت تو نہیں کرتی
''تمھاری جیسی مرضی ہو''
مگر تم تو مرے ہو کس طرح ہونٹوں پہ وہ لاؤں
کہ جس سے تم کو بھولے سے بھی بوئے غیریت آئے
کہ جیسے ایک ہے میرے لیے تم جاؤ یا ٹھہرو
تو کیا میں یہ کہوں تم سے
''گئے تم چھوڑ کر مجھ کو تو پھر میں جی نہ پاؤں گی''
مگر اس بات کا تم کو
یقیں آئے نہ آئے
اور تم ناراض ہو جاؤ

''تمھیں ایشور کو سونپا''
یہ بھی کچھ من کو نہیں بھاتا
نہ جانے کتنی صدیوں سے
نہ جانے کتنے ہونٹوں پر
یہ لفظ آتے رہے ہیں اور یونہیں آتے ہی جائیں گے
اب ان میں دل کی دھڑکن ہے
نہ ان میں خوں کی گرمی ہے
یہ ہیں بے جان ٹھنڈے لفظ جو معنی نہیں رکھتے
بس اک آوازِ بے نغمہ
مرا دل مجھ سے کہتا ہے
کہوں تم سے
''مجھے اک بار پھر جانے سے پہلے پیار تو کرلو''
مگر یہ تو نہ جانے کتنی بار اب کہہ چکی ہوں میں
تمھیں بتلاؤ کیا کہہ کر بدا تم کو کروں ساجن

☆

بادل اور بجلی

بادل آئے
بجلی چمکی
چھایا چاروں اور اندھیرا
یا اک موٹی کالی بلی
جس کی زباں لمبی چمکیلی
دودھ گگن کا جتنا بھی تھا
چاند ستاروں کے تھالوں میں
جلدی جلدی چاٹ گئی سب

☆

عورت ”پتنگ“ اور ادھار

عورت پتنگ اور ادھار
جب یہ گئے تو جانے دو
ان کا جانا ہی اچھا
ان کے پلٹ کر آنے کا
اکثر ہے انداز یہی
دھجے ۔ دھجے
پرزے ۔ پرزے
ٹکڑے ۔ ٹکڑے

☆

عافیتِ نادانی

چمن سے چر رہے ہیں دوب ہرن
یہ چراگاہ ان کی دنیا ہے
امن، راحت، سکون، اطمینان
ان کو سب کچھ یہاں میسّر ہے
کسی لالچ کے وہ شکار نہیں
طاقت وزر کی ہر کثافت ہے
زندگی اِن کی پاک اور معصوم
قتل وغارت گری کا نام نہیں
ہاں مگر یہ غریب بیچارے
خالی الذہن جانور ہی تو ہیں
عقل کی نعمتوں سے کوسوں دور

☆

چور

واپس کردو میری پھٹی میلی چادر یا لیجاؤ
میرے اس بچے کو بھی
اور ذرا رکھنا یہ خیال
گرم رہے بچے کا بدن
اوڑھنے اور بچھانے کو کچھ اور نہیں ہے میرے پاس
میری اس کٹیا کی ننگی مٹی ہے ٹھنڈی ٹھنڈی
گھر میں تمھارے ہو شاید پھیلانے کو تھوڑا سا پیال
بچے کو تم اس پہ لٹانا اور اڑھا دینا چادر
چور نے سن کر یہ باتیں
جلدی سے اٹھائی چادر کو اپنے ہاتھوں سے چھوڑ دیا
اور چرا لایا تھا جو کمبل
رات کی پہلی چوری میں
وہ بھی ان پر ڈال دیا
اور دبے پاؤں جب وہ چپکے چپکے باہر آیا
آنکھ سے آنسو جاری تھے

☆

شکست عشق

اس نے بند رکھا دروازہ
وہ نہ ٹلا
منہ پھیرا اور بات نہ کی
وہ نہ ٹلا
روئی چیخی اور چلائی
وہ نہ ٹلا
تب اس نے دروازہ کھولا
لائی اس کو آنگن میں
اور نظر اس پر یوں ڈالی
جیسے وہ کچھ بھی تو نہ تھا
جیسے بس مٹی کا ڈھیلا
اک ادنیٰ معمولی انسان
اور وہ اس کا ضدی عاشق
بھاگا سر پر رکھ کر پاؤں
مڑ کر بھی پھر اس نے نہ دیکھا
جیسے موت تھی اس کے پیچھے

☆

ککڑوں کوں

سُورج دیو نے
جب دھرتی کے اندھیارے پر
پہلا چمکتا نیزہ مارا
وہ ٹاپے سے باہر نکلا
پھڑ پھڑ کر کے پر پھیلائے
انگڑائی لی
پھر گھورے پر
آیا۔ ٹھٹکا۔ گھوما۔ ناچا
ہلکے ہلکے۔ دھیرے دھیرے
پیپل کی پھنگی پر پہونچا
اور پھر اپنا
سینہ تانا
سر کو اٹھایا
دائیں دیکھا
بائیں دیکھا
نیچے دیکھا

اور اِترا کر
اک وِجئی سمراٹ کی صورت
گردن اونچی
کلغی اونچی
اونچا کر کے اپنی لے کو
پنچم میں لے جا کے سروں کو
چونچ اٹھا کر بانگ لگائی
ککڑوں کوں
ککڑوں کوں

○○○

☆

انتہائی تضحیک

(1)

نسلِ قارون کا ایک ساہوکار
سونے چاندی کا پوجنے والا
جس کو دولت ہے جاں سے بھی عزیز
اور اس ڈر سے چھن نہ جائے کہیں
جاکے راتوں کو جائے ویراں میں
جب وہ کرتا ہے دفن زر اپنا
اور سمجھتا ہے اب یہ ہے محفوظ
خاک بھی اس پہ یوں نہیں ہنستی

(2)

ایک بیمار، نوح کا ہم عمر
زندگی جس کی مستقل آزار
پھر بھی مرتا ہے زندگی کے لیے
گولیاں صبح و شام کھاتا ہے

سانسیں گن گن کے اپنی لیتا ہے
اور کہتا ہے یوں بڑھا لے گا
اپنی معیادِ زیست کے مہ و سال
موت بھی اس پہ یوں نہیں ہنستی

(3)

جس طرح ایک بے وفا بیوی
دیکھ کر سادہ لوح شوہر کی
گود میں اپنے طفل کو خنداں
پہلے بچے کو پیار کرتی ہے
اور پھر فاتحانہ شان کے ساتھ
قہقہہ اس کے لب پہ آتا ہے
کسی آواز میں یہ طنز نہیں
کسی تضحیک میں یہ ڈنک نہیں

داستانِ شب

☆

بوڑھا مانجھی

مانجھیو! ساتھیو! اے میرے رفیقو! یارو
اے جواں سال مرے ہم سفرو!
مجھ کو دھارے سے ہٹانے کی یہ کوشش نہ کرو
سالہا سال ہوئے میں بھی تمھارے ہی طرح
اپنی کرنوں سے اجالی ہوئی کشتی لے کر
دامنِ موج کو دیتا ہوا چاندی کی لکیر
ایک اٹھتے ہوئے سورج کی طرح آیا تھا
چادرِ آب پہ چلتی تھی مری کشتی یوں
فرشِ مخمل پہ قدم جیسے دھرے
ناز سے کوئی حسیں رقاصہ
سینۂ بحر پہ جس طرح کھلے نور کا پھول
میری سانسوں میں تھی خوشبوئے نسیمِ سحری
میرے سینے میں فروزاں تھے امیدوں کے چراغ
میرے ہر قطرۂ خوں میں تھی ستاروں کی تڑپ
میری نظروں میں تھے کچھ قوسِ قزح رنگ افق
اور آغوشِ افق میں کچھ دور

رنگ و نکہت کے وہ پُر کیف جزیرے تھے جہاں
سیپی اور مونگے کی خوش رنگ گپھاؤں کے قریب
بے حجابانہ فقط اوڑھ کے اک چادرِ ماہ
سو رہی تھیں مرے خوابوں کی حسیں جل پریاں
اور جہاں سے مری دنیائے تمنّا کی طرف
جگمگاتی ہوئی اک کاہکشاں جاتی تھی

اور وہ روز ہے اور آج کا روز
میری نظروں میں جزیرے ہیں وہی
میرے سینے میں ہے امید، وہی عزم وہی
کتنے ساتھی مرے اس راہ میں مجھ سے چھوٹے
کتنے شل ہو کے مرے ساتھ سفر کر نہ سکے
کتنے غرقاب ہوئے
کتنے کنارے سے لگے
میں مگر پھر بھی افق ہی پہ جمائے نظریں
اسی جانب ہوں رواں
اور اب مجھ کو یہ لگتا ہے کہ جیسے میں ہوں
اپنے بیڑے کی اکیلی کشتی
اپنی کشتی کا اکیلا مانجھی
اور ان سالوں میں جو بیت گئے
جب بھی طوفانوں نے چاہا مرا رستہ روکیں
میری ضربوں نے کیا سینۂ طوفاں کو دونیم
اور موجوں پہ رواں یوں تھا سفینہ میرا
جیسے شاہیں کی فضا میں پرواز
جیسے سینوں میں نہنگوں کے اترتا ہے مرا خنجر تیز

افقِ شرق سے لے کر افقِ غرب تلک
حکمرانی تھی مری میں تھا امیرِ قلزم
میں نے اس بحر کی ہر موج کے سینے پہ کی ثبت
اپنے پتوار کی مہر
قطرے قطرے نے بجایا مرا ڈنکا ہر سو
اور مرے بول بنے بحر کے گیت
کوئی آندھی کبھی گل کر نہ سکی میری نگاہوں کے چراغ
چھین پائی کوئی بجلی نہ کبھی
میرے ہونٹوں سے تبسم میرا
اور کسی شورشِ طوفاں کے دبائے نہ دبی
میری گونجی ہوئی للکار کی لے

اور اب پھر ہے افق تیرہ و تار
اک نئی اور بھیانک سی اٹھی ہے آندھی
جس سے ڈر ہے کہ نہ بجھ جائے ہر اک نجمِ فلک
اور ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا چھا جائے
آج ان تازہ بلاؤں کے خلاف
تم سمجھتے ہو کہ اب مجھ میں وہ طاقت نہ رہی
اس امنڈتی ہوئی آندھی سے جو ٹکر لے کر
کھے کے لے جاؤں سفینے کو کسی مامن میں
اور تباہی سے بچا لوں اس کو
میرے نادان رفیقو! یارو!
اتنا کمزور نہ جانو مجھ کو
یہ تو سچ ہے کہ میں بوڑھا ہوں جواں سال نہیں
اب بہت دور نہیں منزلِ آخر میری

اور کانوں میں مرے
تیز سے تیز تر آتی ہے سمندر کی پکار
پھر بھی رکھتا ہوں وہی حوصلہ و عزم ابھی
میرے بازو میں سکت ہے، مری کشتی میں ہے دم
اور بپھرے ہوئے گردابوں کے زخمی سینے
خونچکاں ہیں مرے پتوار کے داروں سے ابھی
آج تک میں کسی طوفان سے ہارا تو نہیں
ڈر کے ڈھونڈھا کبھی غیروں کا سہارا تو نہیں
کبھی گھبرا کے کنارے کو پکارا تو نہیں
اور اس ساعتِ نازک میں بھی
اپنی کشتی کسی ساحل کے حوالے تو نہ کی
اپنے اڑتے ہوئے پرچم کو اُتارا تو نہیں
اور طاقت کے خداؤں کی غلامی تو نہ کی
میری غیرت کو گوارا یہ نہیں
موت منظور مگر یہ مجھے منظور نہیں
کسی ساحل کے پس پشت چھپوں
کسی چوکھٹ پہ جبیں گھس کے طلبگار اماں بن جاؤں
اپنے گیتوں کو بھلا کر کسی آقا کی زباں بن جاؤں

جب تلک دم میں ہے دم مجھ سے یہ ہوگا نہ کبھی
چھوڑ دوں اپنے وہ خوابوں کے جزیرے، وہ افق
اور سفینے کا کسی اور طرف رُخ پھیروں
دو طریقے ہیں ہر آفت سے نپٹنے کے لیے
ایک بزدل کے لیے ایک بہادر کے لیے
لڑ کے کرتا ہے اسے زیر جو ہے مرد جری

چھوٹ جاتی ہے مگر ہاتھ سے بزدل کے سپر
اور وہ ہو جاتا ہے خطرے کا شکار
آج تک میں نے ہر اک طوفاں کو
سینۂ بحر سے للکارا ہے
ایک مانجھی کے لیے
ابر و باد و مہ و خورشید و کواکب کے سوا
نہ کوئی دوست نہ ہم راز نہ ساتھی نہ عزیز
اس کی کشتی ہے فقط اس کی عروس
اور طوفانوں کی بجتی ہوئی سیٹی، دایہ
سینۂ بحر ہے ماں کی آغوش
اور اک روز یہی اس کا مزار

اے جواں سال مرے سہرابو!
مجھ کو میداں سے ہٹانے کی یہ کوشش نہ کرو
ورنہ پھر مانگ کے رستم کی طرح
مادرِ بحر سے اپنی وہ پرانی طاقت
تم سے آمادۂ پیکار نہ ہو جاؤں کہیں
اور تمھارے یہ سفینے جنھیں سمجھے ہو تم آہن کے جہاز
میری اک پھونک سے سب کاغذی ناوؤں کی طرح
منتشر ہو کے نہ اُڑ جائیں کہیں
مانجھیو! ساتھیو! اے میرے رفیقو! یارو!
اے جواں سال مرے ہم سفرو!
مجھ کو دھارے سے ہٹانے کی یہ کوشش نہ کرو!

☆

غزل

جل اٹھتی ہے زباں، رہبر نہ فرزانہ ہی کہتا ہے
کوئی کہتا ہے حرفِ حق تو دیوانہ ہی کہتا ہے
مگر پھر بھی ہر اِک لب ان کا افسانہ ہی کہتا ہے
کبھی کچھ شمع کہتی ہے نہ پروانہ ہی کہتا ہے
سحر میں کھو گئے ہم تم نہ وہ راتیں نہ وہ باتیں
حکایت شب کی اک ٹوٹا سا پیمانہ ہی کہتا ہے
تری محفل سے کب کا اٹھ بھی آیا یہ جہاں پھر بھی
نہ جانے کیوں تری محفل کا پروانہ ہی کہتا ہے
بہ پایاں عمر پہنچی ہے تو پہونچے دل تو زندہ ہے
ابھی تک یہ تری نظروں کو میخانہ ہی کہتا ہے
یہ دنیا ایک محفل ہے نقابوں کی، یہاں جو ہے
وہ افسانے ہی سنتا ہے اور افسانہ ہی کہتا ہے
یقیناً اہلِ دانش کی یہ محفل ہے جسے دیکھو
سوا اپنے وہ باقی سب کو دیوانہ ہی کہتا ہے
عجب ہے فطرتِ فنکار عنوانِ سخن کچھ ہو
وہ اس کی آڑ میں بھی اپنا افسانہ ہی کہتا ہے

نہ جانے تجربات زندگانی کیا ہیں ملا کے
جو اپنے بن کے آئے ان کو بیگانہ ہی کہتا ہے
مٹا ملا مگر دنیا مٹا پائی نہ خواب اس کے
کھنڈر کو اپنے دل کے وہ صنم خانہ ہی کہتا ہے

کربِ آگہی

(1977)

''اک الگ ہٹ کے نشانِ کفِ پا''

آنند نرائن ملا ہمارے عہد کے ان فنکاروں میں سے ہیں جن کا ذہن و شعور فکر کے روایتی اور رسمی سانچوں سے بے نیاز ہو کر سوچ سکتا ہے اور جن کی نظر حقائق کو اس طرح سے دیکھنے پر قانع نہیں جس طرح سے دوسرے انھیں قبول کرتے ہیں۔ اردو میں تنقید چوں کہ طرف داریوں سے بلند ہو کر سخن فہمی کا حق کم ہی ادا کر پاتی ہے، اس لیے کم لوگوں کو احساس ہے کہ ملا نے اپنے عہد کے بہت سے مسلمات سے گریز کیا ہے، شعری کردار کے بارے میں بنیادی سوال اٹھائے ہیں اور شاعری میں اپنی راہ الگ بنائی ہے۔ ان کی شاعری پچاس برس سے بھی زیادہ مدت پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی طاقت حقائق کو اپنی نظر سے دیکھنے اور پرکھنے والا ذہن ہے۔ یہ بات کہ ''میں نے ہمیشہ ہر سوال زندگی کا حل خود سوچا ہے...... میرے اشعار ہوں یا فیصلے، میری تقریر ہو یا تحریر، میں نے ان سب پر اپنی انفرادیت کی مہر لگا دی ہے۔ میرا انداز بیان میرا ہے، میری فکر میری ہے۔'' وہی کہہ سکتا ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر اپنے ذہن سے سوچنے کا عادی رہا ہو۔ ملا کے نزدیک اس دور کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ''ہم اپنے ذہن دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں'' اور جس نظریے کی اشاعت و تبلیغ بہتر ہوتی ہے اور جس راہ پر دوسروں کو چلتا ہوا دیکھتے ہیں، سر جھکا کر بغیر سمجھے سب اسی پر چلنے لگ جاتے ہیں۔ یہ فکری صلاحیت ہی ملا کو اسی قدر کی طرف لے گئی جسے نظام اقدار میں بنیادی اہمیت حاصل ہے، یعنی انسانی ہمدردی یا انسانیت کا درد۔ اس درد کو ملا نے ایک عقیدے اور ایمان کی شکل دی ہے اور اسے ایسی تخلیقی مرکزیت اور محویت کے ساتھ پیش کیا ہے، نظم میں بھی اور غزل میں بھی، کہ ان کی پوری شاعری آفاقی محبت کے جذبے سے جگمگا اٹھی ہے۔

غزل کو ملا محدود معنی میں نہیں لیتے، ان کا شعری وجدان ذاتی واردات اور پیکار حیات دونوں سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے تخلیقی اظہار کا تار و پود دونوں کی ملی جلی کیفیات سے تیار کرتا ہے۔ ان کے یہاں ''شبستان سے میدان تک'' کا احساس بیک وقت ملتا ہے اور درد انسانیت کی سماجی حواگی کی بدولت انھوں نے غزل کو نظم کا قد دینے کی کوشش بھی کی ہے۔

دیا دردِ انساں کا احساس تجھ کو
کھڑا کردیا نظم کے پاس تجھ کو

یہ بات عجیب معلوم ہوگی، لیکن حقیقت یہی ہے کہ ملا کے تصور انسانیت کا سرچشمہ کوئی ایک مذہب یا اخلاقی ضابطہ یا فلسفہ یا سیاسی و معاشی نظریہ نہیں ہے۔ ان کی فکر ان سب سے اپنی ذہنی غذا ضرور حاصل کرتی ہے، لیکن وہ اپنے نظام اقدار کو اپنی بصیرت ہی کی مدد سے مربوط کر کے ایک وجدانی شکل دیتے ہیں۔ ان کا تصور انسانیت دراصل ایک فنکار کا تخلیقی تصور ہے جس کے نزدیک زندگی ایک جہد مسلسل ہے اور انسان صرف انسان ہی کی میزان نہیں، بلکہ شام و سحر کی گردش، کائنات کی نمو پذیری اور تہذیب کا عمل سب انسان کی صلاح و فلاح سے عبارت ہیں اور حیات انسانی کے مستقبل کا انحصار اسی پر ہے کہ ''اس کرۂ خاک پر ایک ایسا نظام رائج ہو جس میں انسان آزادی، شادمانی اور امن کے ساتھ اپنی پسند کی اجتماعی اور انفرادی زندگی بسر کر سکے۔'' گویا انسان کا مقدر ہے کہ وہ اپنے خارجی اور باطنی مطالبات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔ ملا نے بار بار اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ مٹی کے فرشتے سے ابھی مایوس نہیں ہیں۔

وادی نور بنے گی یہی شعلوں کی زمیں
ابھی مٹی کے فرشتے سے میں مایوس نہیں
خستگی و تشنگی و رہزن و ریگ و سیراب
کتنی صدیاں ہوگئیں انسان چلتا جائے ہے

ہر انقلاب کی سرخی انھیں کے افسانے   حیاتِ دہر کا حاصل ہیں چند دیوانے

زیست ہے صدیوں کے نقاشوں کا شہ کارِ عظیم
اپنی اپنی جا ہر اک کچھ رنگ بھرتا جائے ہے

بجھی بجھی سے فضا ہے دلوں کی اشک جلاؤ
نظر سے برف جو پگھلے تو دل کی بات چلے

بنی نوع انساں سے بے پناہ محبت ملا کے شعری مزاج کا بنیادی عنصر ہے۔ ان کے پورے کلام میں اس کی جیسی گونج سنائی دیتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اختیاری تصور نہیں بلکہ فطری جذبہ ہے جو اپنے اظہار کے لیے بے تاب و بے قرار رہتا ہے۔ انسان اور انسان میں فرق انسانیت کی توہین ہے۔ معمولی انسان کا درد ہی انسانیت کا سچا درد ہے۔ حالی نے عشقیہ شاعری کے ضمن میں کہا تھا: عاشق کچھ کسی کی ذات نہیں اسی طرح انسان دوستی کے ضمن میں ملا نے اپنے شعری کردار سے ثابت کر دیا ہے کہ انسان دوستی اور انسانی مساوات کا تصور بھی ''کچھ کسی کی ذات نہیں۔'' ملا ہر طرح کے ذہنی تحفظات اور تعینات سے ہٹ کر جس طرح دلِ انسان کی ''تاب نبرد'' پر زور دیتے ہیں، ''طاقت کی دہائی'' پر ''انسان کی اکائی'' کو ترجیح دیتے ہیں، اور مساوات اور انسانی برابری کا علم بلند کرتے ہوئے سماجی کوتاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اس نے ان کی شاعری کو ایک خاص انسانی کردار عطا کیا ہے۔

وہ لو رہی کیا بلندیوں ہی کو جو فقط زرنگار کر دے
جمالِ خورشید کی حقیقت شعاعِ ذرہ نواز میں ہے

نظام میکدہ ساقی بدلنے کی ضرورت ہے

ہزاروں ہیں صفیں جن میں نہ مے آئی نہ جام آیا

فلک کے نہ ان ماہ پاروں کو دیکھو　　جو مٹی میں ہیں ان ستاروں کو دیکھو

چمن میں یہ کس چال سے چل رہے ہو　　نہ پھولوں کو دیکھو نہ خاروں کو دیکھو

ذرا جھانک کر غرفہ میکدہ سے　　ترستے لبوں کی قطاروں کو دیکھو

ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظام چمن　　فسردہ غنچوں کو جس میں شگفتگی نہ ملی

ایک جنگ پر آمادہ دنیا یہ راز نہ کب تک سمجھے گی

طاقت کی دہائی فانی ہے انسان کی اکائی باقی ہے

گردوں کے ستارے بجھنے دو دنیا سے کہو ماتم نہ کرے

ذروں سے شعاعیں پھوٹیں گی مٹی کی خدائی باقی ہے

زیست بدلا ہی کی محاذ نبرد　　وہی انساں وہی حیات کا درد

کوئی جبر آج تک نہ چھین سکا　　دل انساں سے اس کی تاب نبرد

ملا کے نزدیک زندگی فقط فرد کی آسودگی اور لذت پرستی سے عبارت نہیں۔ مشترکہ انسانی مفاد کو بہر صورت ذاتی مفاد پر ترجیح حاصل ہے۔ اس لیے فنکار کا منصب یہ ہے کہ وہ ذات سے آگے بڑھے اور دانائے راز اور پیمبری کا حق ادا کرے۔ اس عقیدے کا لازمی نتیجہ زیست کے اثبات، عمل و اختیار اور

جہد مسلسل کی تلقین ہے، اور یہ تلقین ایک ایسی رجائیت کو راہ دیتی ہے جو اس روایتی رجائیت سے ملتی جلتی ہے جس کا پچھلے چند دہوں میں ہمارے ادب میں خاصا رواج رہا ہے۔ یوں تو رجائیت مستحسن ہے، لیکن ایسی رجائیت جو صرف جذباتیت سے مملو ہو، حقیقت کے صرف ایک رخ یا پہلو کو دیکھتی ہو اور زندگی کی سنگینی کو نظر انداز کردیتی ہو، ایک ایسی عینیت اور رومانیت کی راہیں ہموار کرتی ہے جو حقائق سے فرار کا دوسرا نام ہے۔ لیکن ملا کی رجائیت اور روایتی رجائیت میں فرق ہے۔ پہلے کہا جاچکا ہے کہ ان کا تصور انسانیت محض خارجی عقیدہ نہیں بلکہ ایک فنکار کا تخلیقی تصور ہے جس میں زندگی کی بہتر تشکیل بنی نوع انسان سے محبت کے بغیر ممکن نہیں۔ ملا کا ذہن سچائی سے وابستگی محسوس کرتا ہے، فارمولے سے نہیں۔ ان کی انسان دوستی کا منبع اور سرچشمہ خود ان کی اپنی فنکارانہ بصیرت ہے۔ وہ ''سیاسی نظریات'' اور ''انسانی نظریات'' میں بجا طور پر فرق کرتے ہیں۔ یہ کہنا کہ ان کا یہ دعویٰ اس عہد کا اہم فنکارانہ دعویٰ ہے کہ انسان دوستی کے واضح نقطۂ نظر کا ہونا یا نہ ہونا اس بات پر منحصر نہیں کہ کوئی کسی خارجی فلسفے پر ایمان لاتا ہے یا نہیں۔ ملا کسی بھی قسم کے نظریاتی اصرار کو ایسی تنگ دلی اور کم نظری سے تعبیر کرتے ہیں جو بنیادی طور پر تخلیقی جذبے کی تڑپ اور بے قراری کی دشمن ہے۔ وہ گاندھی اور نہرو کی اس دانشورانہ روایت کے امین ہیں جو روشن خیالی، ذہنی کشادگی اور نظر کی وسعت سے عبارت ہے اور جس کا فکری مرکز ثقل خود اس کے اپنے پیروں تلے اپنی دھرتی میں ہے۔ یہ روایت وہ ہے جو صداقت کی صرف ایک تعبیر کو کل صداقت نہیں مانتی، یا جو ایک ہی راستے کو دوسرے تمام راستوں کی نفی کا حق نہیں دیتی یا جو سچ کی اپنی کشش میں یقین رکھتی ہے اور اس کی حیثیت کو منوانے کے لیے غیر اخلاقی ذرائع اختیار کرنے کو سچ کی نفی جانتی ہے۔ سچ کے بھی کئی روپ، کئی رُخ اور کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ ملا نے ایک جگہ صاف لکھا ہے۔

> "میری نظر میں زندگی ایک دریا ہے جس کے نہ آغاز کا پتہ ہے نہ انجام کا۔ نوع انسان اس دریا کے دونوں کناروں پر نسلاً بعد نسلٍ بیٹھی چلی جارہی ہے اور یہ دریا آگے بڑھتا چلا جارہا ہے۔ دریا اور دریا کے کناروں کی تصویر ہر آنکھ میں مختلف طور پر ابھرتی ہے کیوں کہ دیکھنے والے کو تو صرف وہی نظر آتا ہے جو اپنے مقام سے وہ دیکھ سکتا ہے۔ صرف کچھ نظریں اتنی بینا ہوتی ہیں جو بہت دور تک دیکھ سکتی ہے لیکن وہ بھی دریا کی مکمل تصویر نہیں دیکھ پاتیں۔

> نظریاتی اختلافات کی بنیاد یہی وجہ ہے۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ حقیقت سے صرف وہی آشنا ہے لیکن ہر ایک کی حقیقت الگ الگ ہے اور وہ بھی پوری حقیقت کا ایک بہت چھوٹا سا جزو۔ زندگی ہم سب سے ہر لحہ ٹکرا رہی ہے لیکن ہمارے خیالات اور نظریات کا انحصار اس پر ہے کہ ہم کس ذہنی سطح پر یہ ٹکر لیتے ہیں۔"

ملا کے یہاں شاعری یا طریق فکر کا گہرا تعلق ضمیر کی آواز سے ہے۔ انھوں نے اس بات کی کبھی پرواہ نہیں کی کہ ان کی راہ عمل کے بارے میں دوسروں کی رائے کیا ہوگی۔

ان کے قومی خیالات کو بھی اسی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ قومی سطح پر سوچتے ہوئے بھی انھوں نے ہمیشہ وہی کہا جو ان کے جی کو لگا۔ ان کی غزل اس اعتبار سے دل چسپی کا بہت سامان رکھتی ہے کہ پچھلی تقریباً نصف صدی میں ہندوستان کے قومی، سیاسی اور سماجی منظر نامے کے بارے میں ایک آزاد خیال قومی شاعر نے کیا کچھ محسوس کیا اور کس کس طرح اس کا اظہار کیا۔ یہ بات دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ وہ صنف سخن جسے ملا نے "اردو زبان کے ہاتھ میں زندگی کی لکیر" کہا ہے، اس کے مشرب اور تہذیب کا احترام کرتے ہوئے انھوں نے غزل میں کیا وہ سب کچھ نہیں کہا جس کے لیے دوسرے شعرا نظم کا قالب اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ غزل کو نظم کے ہم دوش کرنے میں اشارہ اس بات کی طرف بھی تھا، تاہم اس وقت ذکر پیرایۂ بیان کا نہیں، اس جرات و بے باکی اور انصاف پسندی و حق گوئی کا ہے جس سے ملا ہمیشہ اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ سیاسی اور سماجی حقائق کی طرف اشارے تو اس دور کے نئے پرانے تقریباً سبھی غزل لکھنے والوں کے یہاں مل جائیں گے لیکن ذہنی رویے کی یہ استقامت اور رائے کی یہ اصابت کسی دوسری جگہ، کیا باعتبار کیفیت اور کیا باعتبار کمیت ،مشکل ہی سے ملے گی۔ ذیل کے اشعار میں جو تصویریں ابھرتی ہیں وہ درد انسانیت کے اسی جذبے سے مربوط ہیں جو ملا کی شاعری کا بنیادی محرک ہے۔ یہ تصویریں صرف انھیں اشعار سے مخصوص نہیں بلکہ ان سے ملتی جلتی تصویریں ملا کی غزلوں کے تقریباً ہر صفحے پر مل جائیں گی۔ ان میں گل، گلشن، گلستان، برق و شبنم، باد و باراں، ہنگام بہاراں، چمن، چمن پرست، دور گل، فصل گل، جام و سبو، دار و رسن اور ان کے لفظی معنوی انسلاکات کی سماجی معنویت اردو میں نئی نہیں۔ ملا نے انھیں آج سے نصف صدی پہلے اسی وقت اپنایا ہوگا جب غزل اپنے اصلاحی سفر کے بعد ایک نیا موڑ لے رہی تھی اور

اس میں ایک نئی سماجی اور قومی جہت کا اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن ملا میں اور اس دور کے اکثر شعرا میں فرق بس یہی ہے کہ جہاں دوسروں نے بنے بنائے فکری سانچوں سے کام لیا ہے، ملا کے اشعار کی معنویت ایک آزاد، شخصی و قومی نظر کا فیضان ہے۔

الگ الگ سے افق پر ہیں چھوٹے چھوٹے غبار
یہ کاروان کو میرے کیا ہوا خدا جانے

انتظار فصل گل میں کھو چکے آنکھوں کا نور   اور بہار باغ لیتی ہی نہیں آنے کا نام

میں نالہ بہ لب اجڑے نشیمن پہ نہیں ہوں   دیکھی نہیں جاتی ہے گلستان کی تباہی

چمن کو برق و باراں سے خطر اتنا نہیں ملا   قیامت ہے وہ شعلہ جو نشیمن زاد ہوتا ہے

ہے یہی رسم اس چمن کی ہر نیا بادل یہاں   بن کے نیساں آئے ہے اور آگ برسا جائے ہے

نہ اتفاق عمل ہے نہ ایک سمت قدم   ابھی تو بھیڑ ہے یہ اس کو کارواں نہ کہو

نعرہ گرم انقلاب میں نے بھی ہاں سنا تو ہے
جام و سبو کے آس پاس دار و رسن سے دور دور

برق و شبنم، باد و باراں، خار و گل سب آئے کام رفتہ رفتہ اک مزاج گلستاں بنتا گیا

اس گلستاں کی خیر ہو یارب کیاری کیاری کا ہے الگ پرچم
میکدے کے خلاف ہیں دونوں زندہ باد اتحاد دیر و حرم

جفا صیاد کی اہل وفا نے رائگاں کردی قفس کی زندگی وقف خیال آشیاں کردی

کالے پرے افق پہ نمایاں ہوئے تو ہیں کچھ آمد بہار کے عنواں ہوئے تو ہیں

ملا کے یہاں سماجی صورت حال اور وطن کا درد اتنا شدید ہے کہ اکثر غزلوں میں کئی کئی اشعار میں مسلسل بھی کیفیت ملتی ہے۔

وہ دور گل رہا نہ رہی وہ ہوائے گل کانٹوں کی انگلیوں میں ہیں بند قبائے گل
میں بھی چمن پرست ہوں میں بھی فدائے گل لیکن کسی روش پہ نظر بھی تو آئے گل
دو دن کی زندگی میں بھی نشتر ہر ایک سانس کن کن جراحتوں کو تبسم بنائے گل
گلچیں ہے پُر فریب عمل اور قول اور نعرہ بنام سبزہ و سجدہ بہ پائے گل

تنظیم چمن کے عزم وہ سب، وہ قول وہ پیماں بھول گئے
جو قبل بہاراں لب پر تھے، ہنگام بہاراں بھول گئے
ہر سو وہ ہراس و دہشت ہے اپنوں کو بھی انساں بھول گئے
دل رسم محبت بھول گئے، شاعر غم جاناں بھول گئے

پھولوں میں نہیں وہ خندہ لبی، نکہت نفسی، شبنم دہنی
وہ دور سموم و برق آیا، تہذیب گلستاں بھول گئے
زخمی کی جاں کی فکر نہیں، اور جامہ دری پر حشر بپا
یہ چاک گریباں پر نالاں، چاک دل انساں بھول گئے

خورشید گہن سے چھوٹ چکا بدلی سے رہائی باقی ہے
طوفان سے کشتی کھے لائے ساحل پہ لڑائی باقی ہے
پیروں کی کٹی بیڑی جس دم قیدی سمجھا آزاد ہوا
یہ بھول گیا گردن میں ابھی زنجیر طلائی باقی ہے
رہرو دونوں خطرہ سے اگر بچ نکلا منزل پائے گا
اب راہزنی تو ختم ہوئی ہاں راہ نمائی باقی ہے

ملا کا حساس وفعّال ذہن صرف ہندوستانی صورت حال ہی کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بناتا، بلکہ آفاقی محبت کا عالمگیر جذبہ انھیں عالمی صورت حال پر غور کرنے کے لیے بھی مجبور کرتا ہے۔ ایک خطے کے انسان کے مسائل دوسرے خطے کے مسائل سے مختلف سہی، لیکن درد سب کا ایک ہی ہے یعنی محرومی، بے انصافی، حق تلفی اور ظلم خواہ کہیں ہو، اس سے پوری انسانیت مجروح ہوتی ہے۔ ذیل کے اشعار میں ہمارے عہد کی عالمی صورت حال کے بارے میں جو اشارے ملتے ہیں، گہری معنویت کے حامل ہیں۔

وہ نبض کی رفتار کہ تھمتے ہیں پسینے　　لگتے نہیں دنیا ترے جینے کے قرینے

روشنی کا لے کر نام لڑ رہے ہیں آپس میں   اس طرف بھی کچھ سائے اُس طرف بھی کچھ سائے

نہ جانے کتنی شمعیں گُل ہوئیں کتنے بجھے تارے   تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

توانا کو بہانہ چاہیے شاید تشدد کا   پھر اک مجبور پر شوریدگی کا اتہام آیا

ستم اکثر بہ عنوان کرم ایجاد ہوتا ہے   چمن میں باغباں کے بھیس میں صیاد ہوتا ہے

دور ظلمت تو ہے، دیے لیکن جل رہے ہیں کہیں کہیں پہ ابھی

رنگِ طوفاں سے میں نہیں مایوس   ہے یقین موج تہ نشین پہ ابھی

قرنوں، صدیوں میں انسان نے جینے کے سلیقے کچھ سیکھے

جینے کے سلیقے جب آئے جینے کے ارادے چھوڑ دیے

ملا کی فنکارانہ رجائیت کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ان کے نزدیک ادب میں حقیقت نگاری صرف زندگی کی ترجمانی ہی نہیں بلکہ زندگی کے رازوں کو بے نقاب کرنا بھی ہے۔ زندگی میں دو پہلو ہیں، تاریک اور روشن۔ جو لوگ تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھتے ہیں ملا کو ان سے شکایت ہے۔ لیکن خود ان کے یہاں انسان کی عظمت، ارادے و اختیار، جہد مسلسل اور مستقبل پر ایقان کا جیسا ذکر ملتا ہے۔ بادی النظر میں اس سے شبہہ ہوسکتا ہے کہ کہیں ان کی حقیقت نگاری تصویر کا ایک رخ یعنی روشن رخ دیکھنے سے تو عبارت نہیں ہے۔ زندگی حق و باطل اور معلوم و معدوم کے درمیان ایک کشمکش سے عبارت ہے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ملا کے یہاں اس ازلی کشمکش کی پرچھائیاں بھی ملتی ہیں۔ اس عہد کو صنعتی تہذیب نے جس خلفشار سے دوچار کر دیا ہے، ملا سے بے خبر نہیں۔ جنوں و خرد یا عشق و عقل کی

آویزش و پیکار اور عشق یا جنوں کا ترجیحی مرتبہ تو اردو غزل کی روایت کا حصہ ہے۔ ملا اس جنوں میں جو "نراج" کی طرف لے جاتا ہے اور اس جنوں میں جو "مشترکہ انسانی مفاد" کے آگے اپنا ذاتی مفاد نہیں دیکھتا اور آتش نمرود میں بے خطر کود پڑتا ہے، فرق کرتے ہیں۔ ملا جب "مشعل ایماں" سے "آگہی کے نہ ملنے" یا "قافلوں کے بھٹکنے" یا "گردہ شکستہ پا" کے پیش نظر "روایتی رہنماؤں سے انحراف کرنے" یا "نیکی اور بدی کے خانوں کی لکیر کے مٹنے" یا دنیا میں "نقابوں کا میلہ" لگنے کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا ذہن نئی نسل کے اس ہمہ پہلو شعور حقیقت سے قریب دکھائی دیتا ہے جو حقیقت کی تمام پرتوں اور رنگوں کو نظر میں رکھنے پر اصرار کرتا ہے۔ ملا مٹی کے فرشتے سے کتنے بھی پُر امید ہوں، لیکن انھیں اس کا بھی اقرار ہے کہ "انسان فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی۔" اور "دانش کی تباہی" سے بچ نکلنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ باطن سے یعنی "دل کے سوز و گداز" سے ہم کلامی کا سلسلہ منقطع نہ ہو۔ نئے ذہن کے لیے یہ شعور حقیقت کہیں زیادہ قابل قبول ہے جس میں سیاہ و سفید کے خانے واضح طور پر الگ الگ مرتب نہیں ہوتے۔ ملا کے یہاں اس کا احساس پایا جاتا ہے۔ ارادے و اختیار میں ان کے رجائی یقین کو اگر ذیل کے اشعار سے مربوط کر کے دیکھا جائے تو علم و آگہی کی کم مائیگی، زندگی کی کشمکش اور جسم اور روح کے متضاد تقاضوں کے عرفان سے مرتب ہونے والے شعور حقیقت کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ کہیں زیادہ سچی اور قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔

یہ نیک بھی ہے بد بھی، شیطاں بھی فرشتہ بھی　　انسان کو کیا کہیے ہر سطح پہ انساں ہے

نیکی و بدی کے خانوں کی ہر روز لکیریں مٹتی ہیں　　زندہ دنیا کی نظروں کے میزان بدلتے جاتے ہیں

اللہ ری علم کی حشر گامی　　شب تک گماں صبح کا ہر عقیدہ

بشر کو مشعل ایماں سے آگہی نہ ملی　　دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی

بیماری انساں کم نہ ہوئی جتنے بھی طبیب آئے اب تک
یا جسم انساں بھول گئے یا روح انساں بھول گئے

اک رخ ہے وجود اِک رخ ہے عدم، عمر گزراں کا ہر لمحہ
اس مٹی بنتی دنیا کا آغاز بھی ہے انجام بھی ہے

دنیا ہے نقابوں کا میلہ نقلی چہرے جھوٹی باتیں
اوڑھے ہے ردائے شبنم جو اکثر وہ شرراندام بھی ہے

اتنا مہیب لہجۂ انساں ہے ان دنوں
سہمے سے جارہے ہیں خود اپنی صدا سے ہم
پیش نظر ہے ایک گروہٗ شکستہ پا
پوچھیں گے راہ اب نہ کسی رہ نما سے ہم

رہروی ہے نہ رہ نمائی ہے آج دور شکستہ پائی ہے
ہے اُفق در اُفق رہ ہستی ہر رسائی میں نارسائی ہے
کنجیاں جیسے کھوگئی ہوں کہیں دل نہیں آج بند تالے ہیں

ہوگئی گم کہاں سحر اپنی رات جاکر بھی رات آئی ہے

آزاد جہاں میں کوئی نہیں، سب قیدی ہیں بس فرق یہ ہے
کس نے کتنے اس زنداں کی دیوار میں روزن پھوڑ دیے

وہ شب زیست آئی ہے جس میں   خواب بن کر کوئی سحر بھی نہیں

دانش کی تباہی سے ممکن ہے کہ بچ نکلے
پہلو میں ترے دنیا جب تک دل ناداں ہے

دانش کی تباہی کے دور میں دل ناداں پر اصرار گہری سماجی معنویت رکھتا ہے۔ ملا دراصل خارجی اور باطنی تقاضوں اور اجتماعیت اور انفرادیت میں ہم آہنگی کے قائل ہیں۔ ان کی شاعری میں سماجی وقومی جہت یعنی پیکار حیات کے ساتھ ساتھ ذاتی واردات کی شخصی جہت بھی اتنی ہی متاثر کن ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے تخلص کی رمزیت سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں اور عاشقی ورسوائی کے لطیف احساس کی ایک تازہ لہر پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کا ذہن عاشقانہ جذبات کو ایک بالیدہ سطح پر پیش کرتا ہے جس میں ربط و تعلق کی ہلکی میٹھی دھوپ چھاؤں اور نفسیاتی اسرار کی گرہ کشائی کی کوشش ملتی ہے۔ ان چند اشعار سے اندازہ ہوگا کہ دشت واردات کی بادیہ پیمائی میں بھی ملا کسی سے پیچھے نہیں۔

بڑھ گیا دو دلوں میں شاید ربط   گفتگو ہوتی جاتی ہے کم کم
بے حرف و بے صوت پیغام الفت   سینہ بہ سینہ دیدہ بہ دیدہ

دل جیے ایسی نظر ہی کے سہارے کب تک
جو توجہ بھی نہیں اور تغافل بھی نہیں

کھنچ آتی ہیں اُسی ساحل پہ خود دو اجنبی موجیں
محبت ایک جذب بے اماں معلوم ہوتی ہے

اس نظر پہ پلکوں کے چھا رہے ہیں یوں سائے
جھنڈ میں درختوں کے جیسے دھوپ کھو جائے

یہ غم بھی نہیں راحت بھی نہیں، آخر اس کا کچھ نام بھی ہے
اک میٹھی دل میں خلش جو صبح بھی ہے شام بھی ہے

یہ دل کیا ہے کسی کو امتحانِ ظرف لینا تھا
تن خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کردی

جھجک اظہار ارمان کی یہ آسانی نہیں جاتی
خود اپنے شوق کی دل سے پشیمانی نہیں جاتی

ملا کی ایک حیثیت اردو کے مجاہد کی بھی ہے۔ اردو ان کے نزدیک صرف وسیلۂ اظہار یا زبان ہی نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کی جمالیاتی روح کی تڑپ اور اس کی ممزوج ثقافت کی مظہر بھی ہے۔ پچھلے دو

دھوں میں اردو تحریک اور ملا دو الگ الگ نام نہیں رہے۔ جس جرات، بیباکی اور دلیل کی مضبوطی سے ملا اردو کے مقدمے کو پیش کرتے رہے ہیں، انھیں کا حصہ ہے۔ یہ بات کہ "میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں، اردو کونہیں نہیں چھوڑ سکتا" ہر شخص کہہ سکتا۔ ملا کی غزل چوں کہ ان کے عقائد میں پیوست ہے، اردو سے یہ قلبی لگاؤ غزل کے پردے سے کہیں کہیں جھانکنے لگتا ہے۔

لب مادر نے ملا لوریاں جس میں سنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

بزم ادب ہند کے ہر گل میں ہے خوشبو
ملا گل اُردو کی مہک اور ہی کچھ ہے

ملا بنادیا ہے اسے بھی محاذ جنگ
اِک صلح کا پیام تھی اردو زباں کبھی

ملا نے ایک جگہ کہا ہے" شاعر کی دو مائیں ہوتی ہیں۔ ایک اس کا اپنا دور، دوسری آنے والی نسلیں۔ شاعر کی اصل ماں اس کی دوسری ماں ہوتی ہے کیوں کہ یہی اس کو زندۂ جاوید بناتی ہے۔ ملا کے اپنے دور نے تو ان کو اپنایا ہے اور امتیازی مقام دیا ہے۔ آئندہ بھی امید ہے کہ ان کی شاعری کی کشش کم نہ ہوگی۔ ان کے جمالیاتی اظہار میں انسان کو جو مرکزیت حاصل ہے، اس کے مصائب اور اس کے مسائل کو جو عرفان ہے، رسمیات سے بغاوت کی جو امنگ ہے، حقیقت کی جو بے لاگ ترجمانی ہے، زندگی کی دھوپ چھاؤں، دکھ سکھ، جبر و اختیار اور نیکی و بدی کے گھٹتے بڑھتے دائروں کو سمجھنے اور پرکھنے کا جو جذبہ ہے اپنی زبان سے جو محبت ہے، سماجی اور قومی زندگی کی محرومیوں اور کوتاہیوں پر جرات مندانہ موقف اختیار کرنے اور کلمۂ حق کو بے باکانہ لب اظہار تک لانے کا جو حوصلہ ہے، کون دوسری ماں ہے جو ایسی شاعری کی قدر نہ پہچانے گی اور اس کو عزیز نہ رکھے گی۔ ملا اپنی شاعری میں جو بنیادی

سوال اُٹھائے ہیں، ان کے جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ ایک ایسے دور میں جب نظریاتی ادعائیت سے حسن کے معیار طے پانے لگے تھے، ملا کا اپنی فکر، اپنی نظر اور اپنی راہ پر اصرار کرنا اور جرات بے باکی سے اظہار خیال کرتے رہنا ایسی دولت ہے جسے آنے والی نسلیں کبھی ہاتھوں سے نہ جانے دیں گی، کیوں کہ شاعری میں روشنی اور عظمت اپنے ذہن سے سوچنے اور ضمیر کی آواز سننے ہی سے آتی ہے، اور ملا نے اسی کی راہ دکھائی ہے۔

کی مصلحت وقت سے اس نے نہ کبھی صلح
ملا کے سے دوچار ہی دیوانے ملیں گے

گوپی چند نارنگ

غزل سے

دلھن تھی تجھے میں نے ساتھی بنایا
شبستاں سے میدان میں کھینچ لایا
ترے نرم لہجے کو للکار دے دی
ترے دستِ نازک میں تلوار دے دی
دیا دردِ انساں کا احساس تجھ کو
کھڑا کر دیا نظم کے پاس تجھ کو

☆

کون دل ہے نہیں جو شعلہ بہ جاں
زندگی ہے بلائے بے درماں
آ گیا انتخابِ پیرِ مغاں
چند دن مے رہے گی اب ارزاں
ہر طرف عقل ہی کے ہنگامے
دل کی آواز کھو گئی ہے کہاں
اور سب کاروبارِ زیست ہیں بند
آج گھر گھر ہے آنسوؤں کی دکاں
اِن حسینوں سے اور امیدِ کرم؟
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں
ظلمتِ زیست میں تلاشِ سحر
کس ستارے سے آ رہے ہو میاں؟
کتنے آنسو پیے ہیں نظروں میں
آنکھیں یونہی نہیں بنی ہیں زباں
شیخ کہتے ہیں یہ صفائی میں
میکدے میں یہ دے رہے تھے اذاں
فصلِ گل میں جو ہم پہ بیت گئی
کیا بتائے گی اور آ کے خزاں

داستاں بشر ازل سے یہی
خواب پھولوں کے، پتھروں کا جہاں

ق

نیکی و شر میں کوئی جنگ نہ دنگ
لڑ رہی ہے بدی بدی سے یہاں
سب چھپائے ہوئے ہیں سینے میں
اپنے اپنے الگ الگ شیطاں
شاعری آج نعرے ہی نعرے
اور ملا تو بس اذاں ہی اذاں

☆

غم کے بادل پھر بھی چھائے رہ گئے
آنکھ سے دریا کے دریا بہہ گئے

خوفِ عقبیٰ اور اس دنیا کے بعد
وہ بھی سہہ لیں گے جو یہ غم سہہ گئے

کس نے دیکھا ہے جمالِ روئے دوست
سب نقابوں میں اُلجھ کر رہ گئے

مختصر تھی داستانِ عرضِ شوق
بُجھ کے کچھ تارے مژہ پر رہ گئے

زیست ہے اک شامِ افسانہ کا نام
اپنی اپنی داستاں سب کہہ گئے

تب کہیں جا کر ملی سطحِ سکوں
ڈوب کر جب غم میں تہہ در تہہ گئے

وار کر کے زیست بھاگی اور ہم
آستیں اپنی چڑھاتے رہ گئے

چند شیطاں بند کر کے خوش ہیں یوں
جیسے باہر سب فرشتے رہ گئے

اشک بن پائے نہ غم کے ترجماں
یہ نمائش ہی میں اپنی رہ گئے

زندگی سے لڑ نہ پایا جوشِ دل
پَر بہت تولے مگر رہ رہ گئے

اشک تھے جب تک فروزاں غم نہ تھا
اب اندھیرے میں اکیلے رہ گئے
جیبیں سب یاروں نے بھر لیں بزم میں
ایک ملا تھے جو یونہی رہ گئے

~~~~~
~~~~~

☆

چھپے بوروں کے دانے بھی اگر خرمن میں آجائیں
مری روٹھی بہاریں پھر مرے گلشن میں آجائیں
تہی کب تک اسے رکھتا، نہ جب گل چُن سکا کوئی
تو یہ سوچا چلو کچھ خار ہی دامن میں آجائیں
کنارے پر تھپیڑے تیز تر ہیں موجِ ہستی کے
یہی بہتر ہے اب طوفان کے مامن میں آجائیں
سمجھ میں اُن کی خود آجائے گا درد زمیں کیا ہے
اُتر کے چھت کے یہ باسی ذرا آنگن میں آجائیں
ہر اک بھٹی میں علم آباد کی اب خون جلتا ہے
ہمیں خود ایک دن ایسا نہ ہو، ایندھن میں آجائیں
ہمیں دیوانہ کہہ لے اے جہاں لیکن نہیں ممکن
تری اس کھوکھلی تہذیب کے مدفن میں آجائیں
یہ غم کی کالی کالی وردیاں کب تک کوئی پہنے
کبھی کچھ تارِ زر بھی دیدۂ سوزن میں آجائیں
بھٹکتا پھر رہا ہے دشت ہی میں کارواں کب سے
کہیں ہم پھر نہ خوش گفتاریٔ رہزن میں آجائیں
وہ نظارے ہی جلوے ہیں اسیروں کے لیے ملا
کسی دیوارِ زنداں کے جو اک روزن میں آجائیں

~~~~~
~~~~~

☆

بہکی بہکی چال کو شائستگی گام دو
زندگی کو سمت دو اور آرزو کو نام دو
زیست اک تہذیب آئینِ تغیر کا ہے نام
روز و شب کو نرمی آہنگِ صبح و شام دو
مے فروشو! مغبچوں پر جب کوئی قابو نہ تھا
تم سے یہ کس نے کہا تھا یوں صلائے عام دو
مل کے کچھ باتیں کریں جھگڑے نہیں مٹنے کے یوں
میں تمھیں دُشنام دوں اور تم مجھے دُشنام دو
پختگی عقل جینے کے لیے کافی نہیں
گاہے گاہے زیست کو اک آرزوے خام دو
جام وصہبا سے نہ دے پاؤ تو اشکوں سے سہی
تیرگی زیست کو اک جگمگاتی شام دو
چھوٹے چھوٹے آنسوؤں میں لٹ نہ جائے نورِ غم
دل کے سب جلوے سمیٹو اور انھیں اک بام دو

ق

نسلِ انساں طاق کے ہر بت سے بدظن ہو چکی
آؤ فنکارو جہاں کو کچھ نئے اصنام دو
طالبِ آدابِ نو ہے بزمِ رندانِ جہاں
کچھ نئے حافظ نئے غالب نئے خیام دو

وار اوچھے ہو چلے ہیں صیدِ نو زخمی ہو گیا
ان تھکی نظروں کو اپنی اک ذرا آرام دو
اشک افشاں بزم میں ہر مریمِ معصوم ہے
خونِ پروانہ ہوا لیکن کسے الزام دو
بن چکے ہیں بارِ شمع و گل مذاقِ بزم پر
آؤ ملا کوئی لو دیتا ہوا پیغام دو

~~~~~
~~~~~

☆

فتنہ پھر آج اُٹھانے کو ہے سر ، لگتا ہے
خون ہی خون مجھے رنگِ سحر لگتا ہے
علم کی دیوقدی دیکھ کے ڈر لگتا ہے
آسمانوں سے اب انسان کا سر لگتا ہے
مجھ کو لگتا ہے نشیمن کی مرے خیر نہیں
جب کسی شاخ پہ گلشن میں تبر لگتا ہے
مان لوں کیسے کہ میں عیب سراپا ہوں فقط
میرے احباب کا یہ حُسنِ نظر لگتا ہے
کل جسے پھونکا تھا یہ کہہ کے کہ دشمن کا ہے گھر
سوچتا ہوں تو وہ آج اپنا ہی گھر لگتا ہے
فن ہے وہ روگ جو لگتا نہیں سب کو لیکن
جس کو لگتا ہے اُسے زندگی بھر لگتا ہے
احتیاطاً کوئی در پھوڑ لیں دیوار میں اور
شور بڑھتا ہوا کچھ جانب در لگتا ہے
ایک دروازہ ہے ہر سمت نکلنے کے لیے
ہو نہ ہو یہ تو مجھے شیخ کا گھر لگتا ہے
چمنِ شعر میں ہوں اک شجرِ زندہ، مگر
ابھی ملا مری ڈالی پہ ثمر لگتا ہے

~~~~~
~~~~~

☆

ظلمتِ غم نہ گئی خواب بہت چمکائے
دھوپ چھڑکا ہی کیے خاک سے پھوٹے سائے
ساقیِ وعدہ شکن مژدہ سرا ہے تو ضرور
ورنہ محفل میں نہ مے آئی نہ ساغر آئے
وہ تو کہیے کہ خطا کار تھے ہم، بچ نکلے
دامِ معصوم نگاہوں نے بہت پھیلائے
بختِ دانا ہے یہی زیست تو زنداں میں کٹے
اور پھر دوش پہ جمہور کے ارتھی جائے
صبح کی راہیں درخشاں ہیں انھیں کرنوں سے
چشمِ شاعر میں جو کل رات کچھ آنسو آئے
نام اسی کا ہے توجہ تو تغافل بہتر
جب بھی الزام لگانا ہو مرا نام آئے
افقِ صبح کی جانب ہیں رواں دل میں ہے ڈر
جانے کس موڑ پہ اس راہ میں رات آجائے
زندگی درد بھی خود، درد کا چارہ بھی ہے خود
زخمِ نو رکھتے گئے زخمِ کہن پر پھائے
دیکھ کر اُس کو نظر کھو سی گئی یوں جیسے
خواب دیکھے کوئی اور خواب ہی دیکھے جائے
سچ کی تعریف سیاست کی لغت میں ہے یہی
جھوٹ اس طرح سے بولو کہ یقیں آجائے

زیست نالہ ہے اگر خوابوں کا آہنگ نہو
ہم نے ہاں کھائے ہیں اور جان کے دھوکے کھائے

ذکر داغوں کا نہیں بزم میں چپ بیٹھے ہیں سب
اپنے دامن کی طرف بھی نہ نظر آجائے

آبلہ پاؤں نے چھوڑا نہ بیاباں کا طواف
کتنے پھولوں کے سرِ شاخ سے پیغام آئے

حیف اس رہرو معصوم کی محرومی پر
جو رہِ زیست میں بھولے سے نہ ٹھوکر کھائے

کہیے کیا اُس کی نگاہوں کا وہ جادو، وہ فریب
ماں کی آغوش میں بھی طفل نہ تسکیں پائے

یوں غمِ دہر میں اپنا غمِ دل بھول گیا
جیسے گر کے کسی ساگر میں ندی کھو جائے

وہی بے باکی و حق گوئی ملا ہے ابھی
کاش اس کو کبھی جینے کا سلیقہ آئے

~~~~~
~~~~~

☆

غمِ انساں سے جو دل شعلہ بہ جاں ہوتا ہے
وہی ہر دور میں معمارِ جہاں ہوتا ہے
دل میں رہرو کے اگر عزمِ جواں ہوتا ہے
گام بھٹکا بھی تو منزل کا نشاں ہوتا ہے
ہونٹ سینے سے سوا سوزِ نہاں ہوتا ہے
شعلہ دبتا ہے تو کچھ اور دھواں ہوتا ہے
نعرۂ حق کو دباتے ہیں کھلی بزم میں جب
یہ کسی گوشۂ زنداں میں جواں ہوتا ہے
کون پتھر ہے گہر کون، پرکھنے کی ہے بات
دیکھنے ہی سے یہ اندازہ کہاں ہوتا ہے
عشق میں شکرو شکایت میں کوئی فرق نہیں
اپنا اپنا الگ اندازِ بیاں ہوتا ہے
میں بھی انصاف کا خواہاں ہوں مگر اے مالک
تیری دنیا میں اب انصاف کہاں ہوتا ہے
کون سا ہے یہ محبت میں مقام اے ملا
کلمۂ لطف بھی اب دل پہ گراں ہوتا ہے

~~~~~
~~~~~

☆

کبھی تو ختم پر صحرا کی شامِ انتظار آئے
لیے صد گلستاں در پر کوئی بنتِ بہار آئے
بہت کچھ پا کے اور کھو کے بہ بامِ اختیار آئے
زمانہ بھر سے جو جیتے وہی اپنے کو ہار آئے
کسی غم میں نہ تپ کر جب تلک دل پر نکھار آئے
نہ جینے ہی کا ڈھنگ آئے نہ مرنے کا شعار آئے
نہیں غم میں کوئی اپنا یہ جتنے غم گسار آئے
کسی مجلس سے جھٹکے اشک کچھ لے کر اُدھار آئے
میں اُس کے پاس کیا جاؤں نہ جانے منہ سے کیا نکلے
مجھے اپنی زباں پر بھی تو پہلے اختیار آئے
کوئی بلبل چہک پائے نہ کوئی گل مہک پائے
خدایا میرے گلشن میں نہ یوں فصلِ بہار آئے
کبھی تو غم میں اک آنسو کا قطرہ بھی نہیں نکلا
مگر آنے پہ جب آئے قطار اندر قطار آئے
ابھی تک تو یہی ترتیب تاریخِ گلستاں ہے
خزاں کے دور پھر پھر کر بہ اعلانِ بہار آئے
کسی میں دم نہیں اہلِ ستم سے جا کے کچھ کہتا
مگر بیکس کو سمجھانے سب آئے ، بار بار آئے
نہ ہو یہ عدل گہہ کوئی کہ جب نکلے یہی دیکھا
ستم راں خندہ زن آئے ، ستم کش اشک بار آئے

جہانِ تیرہ میں نکلے تھے ہم بھی شمعِ دل لے کر
نہ محفل راس آئی جب، تو ویرانے سنوار آئے
خزاں کا ذکر اتنا ہے کہ گل مرجھائے جاتے ہیں
کسی لب پر تو بھولے سے کبھی نامِ بہار آئے
مبارک ہو تمھیں تیغ و سناں یارو مگر ہم تو
فقط اک شاخِ گل لے کر بہ سوئے کارزار آئے
بہ پائے شمع اردو نامِ ملا دوستو لکھ دو
کوئی پھر اس کی سُو شاید نہ یوں پروانہ وار آئے

~~~~~
~~~~~

☆

چیز دل ہے، رخِ گلفام میں کیا رکھا ہے
کیف صہبا میں ہے خود جام میں کیا رکھا ہے

گنگناتا ہوا دل چاہیے جینے کے لیے
اس نزاعِ سحر و شام میں کیا رکھا ہے

کون کس طرح سے ہوتا ہے حریفِ مئے زیست
اور تلخابۂ ایام میں کیا رکھا ہے

عشق کرتا ہے تو کر اور نگاہوں کو بلند
رشتۂ رہگذر و بام میں کیا رکھا ہے

مرغ آزاد ہوا کیا تری خود داری کو
چند دانوں کے سوا دام میں کیا رکھا ہے

حُسن فنکار کی اک چھیڑ ہے عِشق ناداں
بے وفائی کے اس الزام میں کیا رکھا ہے

دیکھنا یہ ہے کہ وہ دل میں مکیں ہے کہ نہیں
چاہے جس نام سے ہو نام میں کیا رکھا ہے

دیں مرے ذوقِ پرستش کو دعائیں ملا
ورنہ پتھر کے ان اصنام میں کیا رکھا ہے

~~~~~
~~~~~

☆

نظر خموش ہوئی عرض نا تمام کے بعد
کچھ اور کہہ نہ سکے اشک بے کلام کے بعد

یہ مُغبّچے ترے ساقی ابھی ہیں خیرہ بہت
ہر ایک جام تہی اور صلائے عام کے بعد

بس اتنی بات کہ کیا کیا ہیں بزم میں چرچے
وہ مسکرا سے دیے تھے مرے سلام کے بعد

نماز جام پڑھی صبح نے۔ نہیں ۔ لیکن
عجب سا نور ہے رخ پر طلوع شام کے بعد

ہر اک نزاع کا حل انتقام ہی ہے ابھی
مگر سوال تو یہ ہے کہ انتقام کے بعد ؟

یہ لگ رہا ہے کہ جیسے بکھر رہی ہے حیات
پلٹ پلٹ کے نگاہیں ہیں گام گام کے بعد

کسی محفل ، کسی وادی ، کسی چمن میں نہیں
وہ گل جو دل میں مہکتا ہے ٹھیک کام کے بعد

فرار تشنہ لبی بھی ہے کوئی شے ساقی
تقاضہ نا تمام تھیں کرنے کے جام جام کے بعد

یہ سچ نہیں کہ مرے دل میں اور نام نہیں
مگر یہ سچ ہے کہ یہ سب ہیں تیرے نام کے بعد

ہے زیست اسی کی کہ جس کے بازو کو
عروسِ صبح بھی ڈھونڈے نگارِ شام کے بعد

بدلتی قدروں میں کچھ ہوں کہ کچھ نہیں ملا
سوالیہ سا نشاں ہوں خود اپنے نام کے بعد

~~~~~
~~~~~

☆

سب خضر مگر رستہ دو گام نہیں ملتا
ہر موڑ کا اک ساقی اور جام نہیں ملتا

یہ علم کے زینے ہیں صدیوں سے بشر ان پر
چڑھتا چلا جاتا ہے اور بام نہیں ملتا

پھولوں سے لدا بستر ظالم کو میسر ہے
اور پھر بھی کسی پہلو آرام نہیں ملتا

سَو نام دیے تجھ کو ہر نام کو پھر کاٹا
تو جس میں سما پائے وہ نام نہیں ملتا

کیا ختم پہ آپہنچا افسانہ محبت کا
ملتی ہیں نگاہیں اور پیغام نہیں ملتا

کیا عصمتِ فن کی ہے ضامن یہی شے ملا
فنکار کو جیتے جی انعام نہیں ملتا

~~~~~
~~~~~

☆

رفتہ رفتہ ایک آہنگِ فغاں بنتا گیا
غم ہی آخر غم گسار بے کساں بنتا گیا

دردِ انساں مشترک تھا اہلِ غم خود آئے پاس
خضر لڑتے ہی رہے اور کارواں بنتا گیا

حسرتِ تعمیر انساں کی کہیں کیا داستاں
اک قفس ہی آشیاں در آشیاں بنتا گیا

برق و شبنم، بادو باراں، خار وگل، سب آئے کام
رفتہ رفتہ اک مزاج گلستاں بنتا گیا

ہر نفس عمر رواں کا ہے خدائے مرگ و زیست
اک جہاں مٹتا گیا اور اک جہاں بنتا گیا

زیست کی تلخی تو الفت سے نہ مٹ پائی مگر
جامِ سم پر ایک خطِ ارغواں بنتا گیا

~~~~~
~~~~~

☆

اس نظر پہ پلکوں کے چھا رہے ہیں یوں سائے
جھنڈ میں درختوں کے جیسے دھوپ کھو جائے
دل کی گزری یوں اکثر مصلحت کی دنیا میں
جیسے اپنے پَر طائر تولے اور رہ جائے
روشنی کا لے کر نام لڑ رہے ہیں آپس میں
اِس طرف بھی کچھ سائے اُس طرف بھی کچھ سائے
جہدِ زیست کے شایاں ہو چلا ہے دل شاید
آئے اشک آنکھوں میں اور تم نہ یاد آئے
دل میں ہر طرف پھیلی چاندنی انھیں کی ہے
وہ لطیف سے غم جو اشک بھی نہ بن پائے
آہ پیری ملا ورنہ کیا یہ ممکن تھا
زیست اور نظر پھیرے، پاس سے گزر جائے

~~~~~
~~~~~

☆

زیست بدلا ہی کی محاذِ نبرد
وہی انساں وہی حیات کا درد

اس گلستاں کی خیر ہو یارب
جتنے وارث ہیں سب ہیں دشت نورد

قافلہ گم ہے اور ہر جانب
گرد ہی گرد سرخ، کالی، زرد

نگۂ خار پڑ نہ جائے کہیں
اپنے پھولوں پہ ڈال لی خود گرد

نام ہر لب پہ سبزہ زار کا اور
ہر نشیمن سے چھن رہی ہے گرد

اور خوشیاں بھی ہیں مگر تم ہو
وہ خوشی جو ہے میرا سارا درد

~~~~~
~~~~~

☆

پتھر بھی پگھلتا ہے اپنا تو یہ ایماں ہے
ڈھونڈو گے تو پاؤ گے دشمن میں بھی انساں ہے
یہ نیک بھی ہے بد بھی، شیطاں بھی ، فرشتہ بھی
انساں کو کیا کہیے، ہر سطح پہ انساں ہے
نغمہ جو نہیں ممکن، نالہ ہی سہی اے دل
یہ تو نہ کہے کوئی یہ خانہ ویراں ہے
پھولوں سے ہٹا کر جب کانٹوں پہ نظر ڈالی
تب مجھ کو یقیں آیا ہاں فصلِ بہاراں ہے
کل جلوۂ محفل دے آنکھوں کو ضیا شاید
نظارہ ابھی تک تو نظروں سے پشیماں ہے
نیکی کے خدا تجھ کو اس کی بھی خبر ہوگی
جنت میں اندھیرا ہے دوزخ میں چراغاں ہے

~~~~~
~~~~~

☆

ستم اکثر بہ عنوانِ کرم ایجاد ہوتا ہے
چمن میں باغباں کے بھیس میں صیّاد ہوتا ہے
کبھی ہارا ہے جوشِ گل بھی دستِ جورِ گلچیں سے
نشیمن جلتے جاتے ہیں چمن آباد ہوتا ہے
نہ ہو جب تک سکت بازو میں یکساں قید و آزادی
قفس کے ٹوٹنے سے بھی کوئی آزاد ہوتا ہے
نہیں ہے صید بھی معصوم صیّادی کی دنیا میں
جب اس کا داؤں چلتا ہے یہی صیّاد ہوتا ہے
خوشی کیا ہے فسانہ روزِ رفتہ کا بھلا سکنا
وہی غمگیں ہے جس کو یہ فسانہ یاد ہوتا ہے
چمن کو برق و باراں سے خطر اتنا نہیں ملاّ
قیامت ہے وہ شعلہ جو نشیمن زاد ہوتا ہے

~~~~~
~~~~~

☆

مل پائے ہیں اب تک نہ یہ فرزانے ملیں گے
اک روز انھیں روند کے دیوانے ملیں گے

وہ کنجِ طرب چھوٹ گیا، دشتِ غم آیا
اب آج سے بے گانے ہی بے گانے ملیں گے

بکھرے ہوئے زینوں پہ ہر اک بامِ خرد کے
کچھ واہمے، کچھ خواب، کچھ افسانے ملیں گے

اے شمع نہیں ملنے کے یونہیں تو پر ستار
جب خود کو جلائے گی تو پروانے ملیں گے

دنیا ترے گلشن نہ قریب آئے اگر آج
پھر کل ترے ویرانوں سے ویرانے ملیں گے

جویائے حقیقت اِدھر آ روئے خطا دیکھ
نیکی کی نقابوں میں تو افسانے ملیں گے

~~~~~
~~~~~

☆

صبح نو آگئی تیرگی مٹ گئی شور ہے ہر طرف انقلاب آگیا
مجھ کو ڈر ہے اندھیرا کوئی رات کا منہ پہ ڈالے سحر کی نقاب آگیا
حسن کی یہ ادا بھی ہے کتنی حسیں اک تبسم میں سب کچھ ہے کچھ بھی نہیں
اپنی اپنی سمجھ اپنا اپنا یقیں ہر سوالِ نظر کا جواب آگیا
بزمِ ہستی میں ہنگامہ برپا کیے کوئی گیتا لیے کوئی قرآں لیے
میں بھی ساقی کے ہاتھوں سے پائی تھی جو، لے کے اپنی سنہری کتاب آگیا
فطرتِ حُسن کو کون سمجھے بھلا، گہہ عطا ہی عطا، گہہ جفا ہی جفا
گاہ تقصیر کی اور ہنسی آگئی گاہ سجدے کیے اور عتاب آگیا
زیست کی تلخیاں الاماں پھر بھی وہ چھین پائیں نہ میرے لبوں سے ہنسی
عشق تو نے دیا وہ غمِ شادماں ہو کے نا کام، میں کامیاب آگیا
گردشِ روز و شب نے نہ جانے کہاں کی نکالی ہے ملاّ سے یہ دشمنی
اس نے ساغر اٹھایا، سحر ہو گئی، اس نے ساغر رکھا، ماہتاب آگیا

~~~~~
~~~~~

☆

سینہ کی حرارت سے خالی گرمیِ چراغِ شام نہ لے
یہ دل ہے امانت دنیا کی اپنا ہی بس اس سے کام نہ لے
ہستی ہے نام تسلسل کا ماضی سے مفر ممکن ہی نہیں
وہ صبح نہ ہوگی صبح کبھی جو جائزۂ ہر شام نہ لے
مَے سب کو نہ ہو تقسیم اگر اپنا بھی الٹ دے پیمانہ
یہ کفر ہے کیشِ رندی میں ساقی سے اکیلے جام نہ لے
اس جہدِ خرد کے میداں میں کچھ بھی نہ ملے لاشوں کے سوا
گرتے ہوئے مضروبوں کو اگر آغوشِ محبت تھام نہ لے
اس مَے کو نہ پی قطرہ قطرہ گن گن کے نہ لے سانسیں اپنی
جینا ہے تو جی جینے کی طرح جینے کا فقط الزام نہ لے
محفل کے سبو و جام سے لے ملّا نہ کبھی اپنی صہبا
لے کیفِ مذاقِ عام مگر بر سطحِ مذاقِ عام نہ لے

~~~~~
~~~~~

☆

بات بھی کہہ کے کھوؤں کیوں جب کوئی آسرا نہیں
ہاں مجھے کوئی غم نہیں، ہاں مجھے کچھ گِلا نہیں

تم وہی، میں وہی مگر، دل میں وہ ولولہ نہیں
آتشِ تیز عشق میں شعلۂ دیر پا نہیں

چھیڑ کے دل کو دیکھ لو نغمۂ جاں سنائے گا
ساز فقط خموش ہے یہ ابھی بے صدا نہیں

توڑ کے دل کی ہر اُمید پوچھ رہے ہیں چپ ہو کیوں
اور وہ ہنس کے اس طرح، جیسے کہ کچھ ہوا نہیں

تنگ ہے ذوقِ عشق کو جادۂ قیس و کوہکن
ڈھونڈ رہا ہوں راہ وہ جس میں نقوشِ پا نہیں

ہو چکی التجا تمام، بن چکے اشکِ خوں سفید
ملاؔ انھیں گرا بھی دو، ان میں کچھ اب رہا نہیں

~~~~~
~~~~~

☆

جب کبھی امن کی انساں نے قسم کھائی ہے
لبِ ابلیس پہ ہلکی سی ہنسی آئی ہے
عشق جس دل میں نہیں تکملۂ کیف نہیں
زندگی نیم کشیدہ سی اک انگڑائی ہے
شمع ایک موم کے پیکر کے سوا کچھ بھی نہ تھی
آگ جب تن میں لگائی ہے تو جان آئی ہے
چشمِ خونبار میں باقی نہ رہا کیا کوئی اشک
آج بیمارِ محبت کو ہنسی آئی ہے
یہ بھی درکار ہے رعنائی گلشن کے لیے
وہ جو بازو میں اسیروں کے اک انگڑائی ہے
عشق مفلس کا ہے اک نیم کشیدہ سی شراب
اور جوانی بھی ادھوری سی اک انگڑائی ہے

~~~~~
~~~~~

☆

نہیں میں پیار کے قابل تو مجھ کو پیار نہ کر
مگر نگاہِ ترحّم سے شرمسار نہ کر
بدل نگاہِ غضب کو نہ تو تغافل سے
تعلقاتِ گوارا کو ناگوار نہ کر
اب اس قدر بھی نہ دنیا کو کم نگاہ سمجھ
غموں کو خندۂ باطل سے آشکار نہ کر
دیارِ حسن کی رنگینیاں قبول مگر
نگاہِ شوق کا جلدی سے اعتبار نہ کر
مآلِ زیست سے گھبرا کے کر نہ خونِ شباب
خزاں کے خوف سے رسوائیِ بہار نہ کر
خزاں رسیدہ چمن کی بہار ہی کیا ہے
مری بہار سے اندازۂ بہار نہ کر
جفائے دوست پہ شکوے نہ چھیڑ اے ملا
عدو کے رنگ کو بھولے سے اختیار نہ کر

~~~~~
~~~~~

☆

رُت جوانی کی نگاہوں میں پیام آنے کا نام
لے کے انگڑائی کلی کے پھول بن جانے کا نام
قطرہ قطرہ زندگی کے زہر کا پینا ہے غم
اور خوشی ہے دو گھڑی پی کر بہک جانے کا نام
انتظارِ فصلِ گل میں کھو چکے آنکھوں کا نور
اور بہارِ باغ لیتی ہی نہیں آنے کا نام
شمعِ سوزاں بجھ چکی رخصت ہوئے وہ جاں نثار
اب تو محفل میں فقط باقی ہے پروانے کا نام
باغباں کے حکم سے اب کوئی ویرانہ نہیں
اب تو شالی مار ہے ہر ایک ویرانے کا نام
اولاً سینے میں جس نے مے کو جا دی مے کشو
گھونٹ پہلا لے کے اس گمنام پیمانے کا نام
واقفِ ملا نہ تھی بزمِ خرد، یہ طے ہوا
ہو نہ ہو یہ ہے کسی مشہور دیوانے کا نام

~~~~~
~~~~~

☆

خسرو خاک یہ لگتا ہے وہ دن دور نہیں
مہریں ذرّوں کی ہیں اور چاند ستاروں کی جبیں
وادیِ نور بنے گی یہی شعلوں کی زمیں
ابھی مٹی کے فرشتے سے میں مایوس نہیں
دو ہی قانون ہیں طاقت کے کرم یا بیداد
عدل تو بندۂ مجبور کا اک خوابِ حسیں
حُسن اتنا بھی نہ اب چشمِ تمنا سے گریز
کہیں رکھے ہوئے رہ جائیں نہ یہ جام یونہیں
صرف چھونے کا گنہگار ہوں اے ساقیِ بزم
دیکھ جو جام اُٹھایا تھا وہ رکھا ہے وہیں
ایک ہنگامۂ آتش نفساں بھی ہے حیات
یہ فقط انجمن شعلہ رُخاں ہی تو نہیں
دل جیے ایسی نظر ہی کے سہارے کب تک
جو توجہ بھی نہیں اور تغافل بھی نہیں
زیست اس کی ہے میّسر ہوں جسے شام کے ساتھ
آبِ تلخ و لبِ شیریں و کبابِ نمکیں
لبِ تہذیب کا اندازِ بیاں ہے، ورنہ
شکر میں کون سی شے ہے جو شکایت میں نہیں

تیری باتوں کا یقیں تو نہ کیا دوست مگر
ہائے وہ لذتِ لمحاتِ گریزاں یقیں

جنت اُجڑی ہے تو کیا ہم سے؟ فرشتوں کو بلا
ہم نکالے بھی گئے اور بسائیں بھی ہمیں

مہرِ غالب نہ اُبھرتا تو نہ دیتی یہ چمک
خاکِ ملا تو کیا اقبال کی چوٹی بھی نہیں

~~~~~
~~~~~

☆

ہموار کیا یوں، گلشن بھی ویرانے بنا کر چھوڑ دیے
کانٹوں پہ تو کچھ بس چل نہ سکا، شاخوں سے شگوفے توڑ دیے
ایک شورِ سلاسل ہے ہر سُو، اب نغمہ و گل کی بات کہاں
اس دام و قفس کی دنیا نے آدابِ نشیمن چھوڑ دیے
ہونٹوں پہ رہا پیغامِ سحر، مٹی پہ قدم، تاروں پہ نظر
راتوں میں کٹی، راتوں میں مگر خوابوں کے اُجالے جوڑ دیے
قرنوں، صدیوں میں انساں نے جینے کے سلیقے کچھ سیکھے
جینے کے سلیقے جب آئے جینے کے ارادے چھوڑ دیے
آزاد جہاں میں کوئی نہیں، سب قیدی ہیں بس فرق یہ ہے
کس نے کتنے اس زنداں کی دیوار میں روزن پھوڑ دیے
اس عدلِ مغاں کا کیا کہنا، جابر پہ کرم، بیکس پہ ستم
شحنہ کے سبو محفوظ رہے، رندوں ہی کے ساغر توڑ دیے
تصویرِ حقیقت کھنچ نہ سکی مجھ سے مانا، پھر بھی میں نے
وہ ٹیڑھے میڑھے خط ہی سہی، خا کے تو بنا کر چھوڑ دیے
اب آگے تیری قسمت ہے اے قافلۂ گمراہ بشر
میں نے تو اندھیری راہوں میں کچھ دیپ جلا کر چھوڑ دیے
تاریخ بشر بس اتنی ہے، ہر دور میں پوجے اس نے صنم
جب آئے نئے بُت پیشِ نظر اصنام پُرانے توڑ دیے
اس بحث کو چھوڑو خود ملا پہنچا کہ نہ پہنچا منزل تک
لیکن اس نے یاروں کو نئی کچھ راہیں دیں کچھ موڑ دیے

~~~~~
~~~~~

☆

شب کی تاریکی تو ہاں کم ہے مگر کافی نہیں
ہر کرن دھندلی سی ہے نورِ سحر کافی نہیں

اس تمنا ہی کا شاید بڑھ کے حسرت نام ہے
جس تمنا کے لیے خونِ جگر کافی نہیں

مشعلِ دل بھی تو سینے میں فروزاں چاہیے
راہِ منزل میں چراغِ رہ گزر کافی نہیں

عارضی سی اِک تڑپ محفل کو کیا دے گی فروغ
نور بننا ہے تو دل! رقصِ شرر کافی نہیں

اشک بن کر آئی ہیں وہ التجائیں چشم تک
جن کے کہنے کے لیے حرف و نظر کافی نہیں

اس فضا میں تجھ کو جینا ہے تو اے طائر ذرا
تیز رکھ منقار و ناخن، بال و پر کافی نہیں

دن سے گرمی چھینی ہے رات سے تاریکیاں
اس غمستاں میں ابھی شام و سحر کافی نہیں

ضبطِ دل بھی چاہیے تہذیبِ لب بھی چاہیے
جلوہ گاہِ حُسن میں ذوقِ نظر کافی نہیں

اپنے شعروں کو ابھی کچھ اور دے دل کا لہو
ہے تو ان میں زندگی ملا، مگر کافی نہیں

~~~~~
~~~~~

☆

دشتِ ظلمت میں ہے، وہیں پہ ابھی
گامِ انساں ہے راہِ کیں پہ ابھی
کینہ جُو دل بنیں گے جام فروش
جی رہے ہیں اسی یقیں پہ ابھی
حرفِ دل، لب پہ آ نہیں پاتا
اک شکن ہے کسی جبیں پہ ابھی
دلِ معصومِ حُسن کیا کہیے
نامِ کوئی نہیں نگیں پہ ابھی
نکتہ چینی ہے اہلِ چرخ پہ، اور
پاؤں ٹکتے نہیں زمیں پہ ابھی
دورِ ظلمت تو ہے، دیے لیکن
جل رہے ہیں کہیں کہیں پہ ابھی
رنگِ طوفان سے میں نہیں مایوس
ہے یقیں موج تہ نشیں پہ ابھی
حُسنِ بے پردہ کس نے دیکھا ہے
بحث ہے پردۂ حسیں پہ ابھی
رند تھے، اب ہیں رہ نما ملّا
لطفِ رزّاق ہے ہمیں پہ ابھی

~~~~~
~~~~~

☆

خورشید گہن سے چھوٹ چکا بدلی سے رہائی باقی ہے
طوفاں سے تو کشتی کھے لائے ساحل پہ لڑائی باقی ہے
وہ پیشِ نظر ہے وادیِ گل، ہمت سے ذرا اک اور قدم
اب کوہ تو تم سر کر ہی چکے تھوڑی سی ترائی باقی ہے
پیروں کی کٹی بیڑی جس دم قیدی سمجھا آزاد ہوا
یہ بھول گیا گردن میں ابھی زنجیرِ طلائی باقی ہے
رہرو دونوں خطروں سے اگر بچ نکلا منزل پائے گا
اب راہزنی تو ختم ہوئی ہاں راہ نمائی باقی ہے
اک جنگ پہ آمادہ دنیا یہ راز نہ کب تک سمجھے گی
طاقت کی دہائی فانی ہے انساں کی اکائی باقی ہے
گردوں کے ستارے بجھنے دو دنیا سے کہو ماتم نہ کرے
ذرّوں سے شعاعیں پھوٹیں گی مٹی کی خدائی باقی ہے
اغیار کے قبضے سے چھٹ کر خرمن میں تو اپنی فصل آئی
اس فصل کی ملاّ اب خالی ہموار بٹائی باقی ہے

~~~~~
~~~~~

☆

صدائے دل ہی کو آوازۂ جہاں نہ کہو
خود اپنی حدِّ نظر ہی کو آسماں نہ کہو
ہر ایک ذرے کو ہنستا دیا بناتا ہے
فلک کے چاند ستاروں کی داستاں نہ کہو
نہ لاؤ یا تو زباں پر حدیثِ ناکامی
نہیں تو اپنی تمنا کو پھر جواں نہ کہو
یہ اپنا گھر ہے چلو اس پہ تصفیہ کر لیں
قفس کہوں نہ اسے میں، تم آشیاں نہ کہو
نہ اتفاقِ عمل ہے نہ ایک سمت قدم
ابھی تو بھیڑ ہے یہ اس کو کارواں نہ کہو
خصومتوں میں خرد کی جہاں سُنے نہ سُنے
مرے سرودِ محبت کو رائگاں نہ کہو
جہاں ہر ایک کو سجدے کا حق نہیں حاصل
اسے خدائے محبت کا آستاں نہ کہو
اجڑ بھی جائے نشیمن تو پھر نشیمن ہے
قفس میں پھول بھی رکھ دیں تو آشیاں نہ کہو
زمانہ مجھ پہ نہیں تم پہ خندہ زن ہوگا
تم آج دوستوں ملاّ کو نکتہ داں نہ کہو

~~~~~
~~~~~

☆

علم وجاہ و زور و زر کچھ بھی نہ دیکھا جائے ہے
بزمِ ساقی میں دلوں کا ظرف جانچا جائے ہے
زیست ہے صدیوں کے نقاشوں کا شہہ کارِ عظیم
اپنی اپنی جا ہر اک کچھ رنگ بھرتا جائے ہے
کوششیں ہیں دشت کھنچ آئے گلستاں کی طرف
اور گلستاں ہے کہ سوئے دشت کھنچتا جائے ہے
ہے یہی رسم اس چمن کی ہر نیا بادل یہاں
بن کے نیساں آئے ہے اور آگ برسا جائے ہے
بول میٹھے پیار کے ہونٹوں میں یوں پھنستے ہیں آج
طفل جیسے گھر کے انجانوں میں شرما جائے ہے
شاخِ گل گلپوش ہو، اس کو نہیں کہتے بہار
جب یہ رُت آئے ہے کانٹے پر کلی آجائے ہے
برق بھی ہے باد بھی اور گھات میں صیاد بھی
پھر بھی یہ سچ ہے چمن پر رنگ آتا جائے ہے
خستگی و تشنگی و رہزن و ریگ و سراب
کتنی صدیاں ہوگئیں انسان چلتا جائے ہے
اس طرف امن و بقا اور اس طرف جنگ و فنا
دیکھیے یہ کارواں کس سمت ملا جائے ہے

~~~~~
~~~~~

☆

شب دنیا کا نیا جب بھی نظام آیا ہے
اپنے ہونٹوں پہ لیے صبح کا نام آیا ہے
بزمِ دنیا میں غریبوں کے لیے دَور یہ دَور
جرعۂ اشک وہی جام بہ جام آیا ہے
ناز صیّاد کو اب جور پہ اپنے وہ نہیں
جب سے اک صید زبوں خود تہہِ دام آیا ہے
وہی غم جس نے رفیقو تمھیں دیوانہ کیا
وہ مری تربیتِ زیست کے کام آیا ہے
طالب امن ہیں سب بزم میں لیکن ہر رند
لے کے اک ہاتھ میں تیغ، ایک میں جام آیا ہے
سحرؔ عمر! اسے آنسو نہ سمجھ یہ تیرے نام
دل کی کچھ چاندنی راتوں کا سلام آیا ہے
زیست ہے مرحلۂ جوشِ جنوں سے آگے
اس میں ہاں دار و رسن کا بھی مقام آیا ہے
ہاتھ بڑھتا نہیں، ملتی نہیں ساقی سے نظر
پی کے جس جام کو اُٹھنا ہے وہ جام آیا ہے
عشق اک وہ ہے جو ہے نغمۂ خاموشِ حیات
اور اک وہ ہے جو افسانوں کے کام آیا ہے
کتنے نا پختہ سخن میں نے چبائے ملاّ
تب کہیں جا کے یہ اندازِ کلام آیا ہے

~~~~~
~~~~~

☆

کرب میں پھر ہے مادرِ عالم
اک نیا دور لے رہا ہے جنم

تم وہی ہو اب نہ ہم ہیں وہ ہم
انقلاباتِ زندگی کی قسم

دوست کی چشمِ خشمگیں پہ نہ جا
صورتِ شعلہ سیرتِ شبنم

بڑھ گیا دو دلوں میں شاید ربط
گفتگو ہوتی جاتی ہے کم کم

پھر خداؤں میں اس پہ اَن بَن ہے
لوٹ لے کون ورثۂ آدم

اس گلستاں کی خیر ہو یا رب
کیاری کیاری کا ہے الگ پرچم

میکدے کے خلاف ہیں دونوں
زندہ بادِ اتحادِ دیر و حرم

آشیاں کا نہ کر قفس پہ گماں
شاخِ گل کا بھی ہو اگر پرچم

حسن کی رہ گزارِ جور میں بھی
ہو ہی جاتے ہیں سانحاتِ کرم

کفر بدظن تو ہم سے دیں بیزار
نام ملا ہے آستیں میں صنم

~~~~~
~~~~~

☆

رہروی ہے نہ رہ نمائی ہے
آج دورِ شکستہ پائی ہے
عقل لے آئی زندگی کو کہاں
عشقِ ناداں تری دہائی ہے
ہے اُفق در اُفق رہِ ہستی
ہر رسائی میں نا رسائی ہے
شکوے کرتا ہے کیا دلِ ناکام
عاشقی کس کو راس آئی ہے
ہو گئی گم کہاں سحر اپنی
رات جا کر بھی رات آئی ہے
جس میں احساس ہو اسیری کا
وہ رہائی کوئی رہائی ہے
کارواں ہے خود اپنی گرد میں گم
پاؤں کی خاک سر پہ آئی ہے
بن گئی ہے وہ التجا آنسو
جو نظر میں سما نہ پائی ہے
برقِ ناحق چمن میں ہے بدنام

آگ پھولوں نے خود لگائی ہے
وہ بھی چپ ہیں خموش ہوں میں بھی
ایک نازک سی بات آئی ہے
اور کرتے ہی کیا محبت میں
جو پڑی دل پہ وہ اٹھائی ہے
نئے صافی میں ہو نہ آلائش
یہی ملا کی پارسائی ہے

~~~~~
~~~~~

☆

فقط اپنی صدا ہی کو نہ آوازِ جہاں سمجھو
حدودِ آشیاں ہی کو نہ صحنِ گلستاں سمجھو

خروشِ بزم میں بھی سازِ دل چھیڑے ہی جاتا ہوں
اکیلا ہوں ابھی لیکن مجھی کو کارواں سمجھو

وفا کیشی ، بغاوت بن نہ جائے، کب تلک آخر
قفس کو دل پہ پتھر رکھ کے اپنا آشیاں سمجھو

فلک والو فلک پر رہ کے سمجھے ہو نہ سمجھو گے
زمیں کا درد کیا ہے آ کے زیرِ آسماں سمجھو

کہیں تیغ و قلم سے بھی مٹے ہیں تفرقے دل کے
مٹانا ہیں تو پہلے رکھ کے ساغر درمیاں سمجھو

سبب میری خموشی کا مجھی سے پوچھتے کیا ہو
خموشی کیا نہیں کہتی محبت کی زباں سمجھو

لبِ مادر نے ملّا لوریاں جس میں سنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

~~~~~
~~~~~

☆

نگاہ و دل کا افسانہ قریبِ اختتام آیا
ہمیں اب اس سے کیا، آئی سحر یا وقتِ شام آیا
زبانِ عشق پر اک چیخ بن کر تیرا نام آیا
خرد کی منزلیں طے ہو چکیں دل کا مقام آیا
اُسے آنسو نہ کہہ اک یادِ ایامِ گذشتہ ہے
مری عمرِ رواں کو عمرِ رفتہ کا سلام آیا
نظامِ مے کدہ ساقی بدلنے کی ضرورت ہے
ہزاروں ہیں صفیں جن میں نہ مے آئی نہ جام آیا
کبھی شاید اسی سے رنگِ فردوس بشر پائے
ابھی تک تو لہو انساں کا شیطاں ہی کے کام آیا
مکمل تبصرہ کرتا ہوا ایامِ رفتہ پر
نگاہِ بے سخن میں ایک اشکِ بے کلام آیا
توانا کو بہانہ چاہیے شاید تشدد کا
پھر ایک مجبور پر شوریدگی کا اتہام آیا
نہ جانے کتنی شمعیں گل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب اک خورشید اِتراتا ہوا بالائے بام آیا
برہمن آبِ گنگا، شیخ کو ثرلے اُڑا اس سے
ترے ہونٹوں کو جب چھوتا ہوا ملا کا جام آیا

~~~~~
~~~~~

☆

آثارِ زیست پھر سے نمایاں ہوئے تو ہیں
کچھ قافلے رواں سوے زنداں ہوئے تو ہیں
کالے پرے افق پہ نمایاں ہوئے تو ہیں
کچھ آمدِ بہار کے عنواں ہوئے تو ہیں
منبر پہ شیخ، بزم میں پیرِ مغاں وہی
کچھ کاروبارِ زیست کے آساں ہوئے تو ہیں
نیکی کی جھونپڑی میں دیا تک نہ جل سکا
اقلیمِ اہرمن میں چراغاں ہوئے تو ہیں
کانٹوں کا شکریہ کہ اُلجھ کر انھیں کے ساتھ
دو چار گل بھی دولتِ داماں ہوئے تو ہیں
کیا انتخابِ شیخ کا پھر وقت آگیا
کچھ مومنانِ جام سے پیماں ہوئے تو ہیں
مہکی تھی زیست بازوے ملا پہ بھی کبھی
گیسو کسی کے اِن پہ پریشاں ہوئے تو ہیں

~~~~~
~~~~~

☆

گل کام نہ دے گی تری نا کردہ گناہی
گلچیں کی عدالت ہے تو کانٹوں کی گواہی

وہ داد و ستد دل کی نہ بزم نہ وہ رند
انساں کی جگہ آج ہے وردی میں سپاہی

میں نالہ بہ لب اُجڑے نشیمن پہ نہیں ہوں
دیکھی نہیں جاتی ہے گلستاں کی تباہی

ممکن ہے کہ ہونٹوں کو تو میں سی بھی لوں لیکن
لے جاؤں کہاں آنکھوں کی افسانہ نگاہی

میں نے تو اندھیروں میں بھی ڈھونڈھے ہیں اُجالے
ڈھونڈیں جنھیں ملتی ہو اجالوں میں سیاہی

ملتی ہے نظر اب بھی کبھی اس سے مگر یوں
جس طرح سر راہ گزر جاتے ہیں راہی

اب آنکھ ملاتے ہوئے ڈر لگتا ہے تم سے
مہتاب میں آنے لگی خورشید نگاہی

دل نور سے معمور ہو ممکن ہے مگر شیخ
ذہنوں میں اتر جاتی ہے ماتھے کی سیاہی

محفل میں ہے خودداریٔ ملا کا فسانہ
جاں دے دی مگر نیم نگاہی بھی نہ چاہی

~~~~~
~~~~~

☆

جینے کی یہی رُت ہے شاید، ہر سانس میں ایک پیغام بھی ہے
اِک شام بھی ہے اک بام بھی ہے، اک جلوہ فروز بام بھی ہے
یہ غم بھی نہیں راحت بھی نہیں، آخر اس کا کچھ نام بھی ہے
اِک میٹھی میٹھی دل میں خلش جو صبح بھی ہے اور شام بھی ہے
دونوں سے بصیرت مجھ کو ملی، دونوں نے سنواری زیست مری
آنکھوں میں درخشاں اشک بھی ہیں، ہاتھوں پہ فروزاں جام بھی ہے
اُس کسبِ نور سے کیا حاصل جو شمعِ ہدایت بن نہ سکے
ہے زیست کے شایاں زیست وہی، جو زیست بھی ہے پیغام بھی ہے
اک رُخ ہے وجود، اک رُخ ہے عدم، عمرِ گزراں کا ہر لمحہ
اس بنتی مٹتی دنیا کا آغاز بھی ہے انجام بھی ہے
شمعوں کے حسیں میناروں کے قدموں میں ہے خاکِ پروانہ
مینا کے صدائے قلقل میں آوازِ شکستِ جام بھی ہے
دنیا ہے نقابوں کا میلہ، نقلی چہرے، جھوٹی باتیں
اوڑھے ہے ردائے شبنم جو اکثر وہ شرر اندام بھی ہے
دشمن سے نہ کھائی مات کبھی اور دوست کی شہ سے بچ نہ سکا
ملاّ کی حقیقت کیا کہیے پختہ بھی ہے کچھ، کچھ خام بھی ہے

☆

ابرِ بہار ہے مگر میرے چمن سے دور دور
جام چھلک رہے ہیں کچھ کام و دہن سے دور دور

نعرۂ گرم انقلاب، میں نے بھی ہاں سنا تو ہے
جام و سبو کے آس پاس دار و رسن سے دور دور

طائرِ صلح جو تجھے اُڑتا ہے یوں فضا میں آج
زاغ و زغن کے درمیاں زاغ و زغن سے دور دور

اپنی ہر ایک راہ آج دور اسی کے نور سے
جس نے دیے جلا دیے خاکِ وطن سے دور دور

دی ہے مجھے دوآبۂ گنگ و جمن نے جو زباں
آج اُسی کو حکم ہے گنگ و جمن سے دور دور

اپنی فصیلِ باغ کو کوہ کی دے بلندیاں
آندھیاں سرخ ہوں کہ زرد خاکِ چمن سے دور دور

ملا اُدب میں ڈھونڈھ لی جادے سے ہٹ کے اپنی راہ
رنگِ جدید سے الگ، طرزِ کہن سے دور دور

~~~~~~
~~~~~~

☆

جن پاک نفس انسانوں میں کردار کی عظمت ہوتی ہے
ایسوں سے نہ مل پائیں بھی اگر، نادیدہ عقیدت ہوتی ہے
کم دل سے ہوس کی آلائش غم ہی کی بدولت ہوتی ہے
اشکوں کی نمی جب ملتی ہے شاداب محبت ہوتی ہے
تنگی فضائے گردوں کے شاکی، وہ وقت بھی آتا ہے
ہلکی سی بھی جنبش جب پر کی طائر کو غنیمت ہوتی ہے
کیسی ہی حقیقت ہو لیکن بے کس کی زباں پر افسانہ
آتی ہے لب طاقت پر جب، تب جا کے حقیقت ہوتی ہے
تو ڈھونڈھ فلک پر باغِ ارم، اپنا تو عقیدہ ہے زاہد
جس خاک پہ دو دل پیار کریں وہ خاک ہی جنت ہوتی ہے
آواز میں رس، ہونٹوں پہ عنب، باتوں میں شکر، یہ سب دھوکے
انسان کی اک پہچان یہ ہے آنکھوں میں مروت ہوتی ہے
میں کیا، تم کیا اور دنیا کیا انسان کی کچھ فطرت ہے یہی
اپنے لیے عذر ہزاروں ہیں، اوروں کو نصیحت ہوتی ہے
اُٹھ آئیں نہ اُس محفل سے جو ہم کیا اور کریں جب حال یہ ہو
چپ ہیں تو ستائے جاتے ہیں، بولیں تو شکایت ہوتی ہے
اک جرمِ خیانت تو نے کیا، طاقت کو جہاں اپنا سمجھا
مسند پہ پہنچ کر بھول نہ جا، طاقت تو امانت ہوتی ہے
محفل کی نظر ہی میزاں ہے، تول آپ نہ اپنے کو ملا
جس دام بکے جو چیز وہی اس چیز کی قیمت ہوتی ہے

~~~~~
~~~~~

☆

تنظیم چمن کے عزم وہ سب، وہ قول وہ پیماں بھول گئے
جو قبلِ بہاراں لب پر تھے، ہنگامِ بہاراں بھول گئے

ہر سو وہ ہراس و دہشت ہے اپنوں کو بھی انساں بھول گئے
دل رسمِ محبت بھول گئے، شاعر غمِ جاناں بھول گئے

پھولوں میں نہیں وہ خندہ لبی، نکہت تنفسی، شبنم دہنی
وہ دورِ سموم و برق آیا، تہذیبِ گلستاں بھول گئے

زخمی کی جاں کی فکر نہیں، اور جامہ دری پر حشر بپا
یہ چاکِ گریباں پر نالاں، چاکِ دلِ انساں بھول گئے

یوں خاک میں کانٹے پھیلے ہیں، سبزہ کہیں جم پاتا ہی نہیں
کانٹے ہی برنگِ سبزہ تھے، گلشن کے نگہباں بھول گئے

لب ریز فقط جام اپنوں کے، اوروں کے لیے قطرہ بھی نہیں
مَے بانٹنے والے محفل کے، کیا جرأتِ رنداں بھول گئے

پھولوں ہی سے رشتے جوڑ لیے، گلشن ہی کے آخر ہو کے رہے
جتنے بھی سحاب اُٹھے اب تک صحرا و بیاباں بھول گئے

جب تک تھے قفس میں گلشن تھا، اک نور کی دنیا خوابوں میں
نکلے تو اندھیرا وہ پایا تاریکیِ زنداں بھول گئے

مسند کی درخشاں شمعوں میں، محفل کے خروشِ تحسیں میں
بجھتی ہوئی ویراں نظروں کے خاموش چراغاں بھول گئے

کر دے نہ سپردِ خاک وہی جس نے یہ بلندی دی ہے انھیں
یہ شوخ ستارے مژگاں کے کیا جنبشِ مژگاں بھول گئے

بیماریِ انساں کم نہ ہوئی، جتنے بھی طبیب آئے اب تک
یا جسمِ انساں بھول گئے یاروحِ اِنساں بھول گئے
نالہ نہ سرود، آنسو نہ ہنسی، شکوہ نہ دعا، حسرت نہ طلب
شاید مرے دل کے ساحل کو سب زیست کے طوفاں بھول گئے
دنیا نے کسے کب یاد رکھا، نظروں سے ہٹا تو دل سے مٹا
ملا تو کسی گنتی میں نہ تھا مجنوں کو بیاباں بھول گئے

~~~~~
~~~~~

☆

پردے کو جو لَو دے وہ جھلک اور ہی کچھ ہے
نا دیدہ ہے شعلہ تو لپک اور ہی کچھ ہے
ٹکراتے ہوئے جام بھی دیتے ہیں کھنک سی
لڑتی ہیں نگاہیں تو کھنک اور ہی کچھ ہے
عشرت گہِ دولت بھی ہے گہوارۂ نکہت
محنت کے پسینے کی مہک اور ہی کچھ ہے
ہاں جوشِ جوانی بھی ہے اک خلدِ نظارہ
اک طفل کی معصوم ہمک اور ہی کچھ ہے
شب کو بھی مہکتی تو ہیں یہ ادھ کھلی کلیاں
جب چوم لیں کرنیں تو مہک اور ہی کچھ ہے
کمزور تو جھکتا ہی ہے قانون کے آگے
طاقت کبھی لچکے تو لچک اور ہی کچھ ہے
اشکوں سے بھی ہو جاتا ہے آنکھوں میں چراغاں
بن برسی نگاہوں کی چمک اور ہی کچھ ہے
رو کر بھی تھکے جسم کو نیند آتی ہے لیکن
بچے کے لیے ماں کی تھپک اور ہی کچھ ہے
بزمِ ادبِ ہند کے ہر گل میں ہے خوشبو
ملاؔ گلِ اردو کی مہک اور ہی کچھ ہے

~~~~~
~~~~~

☆

وہ دورِ گُل رہا نہ رہی وہ ہوائے گل
کانٹوں کی انگلیوں میں ہیں بند قبائے گل
میں بھی چمن پرست ہوں میں بھی فدائے گل
لیکن کسی روش پہ نظر بھی تو آئے گل
میں کیا سمجھ سکوں ترے آئینِ عدل کو
کانٹوں کا بھی تو ہی تو خدا ہے خدائے گل
دو دن کی زندگی میں بھی نشتر ہر ایک سانس
کن کن جراحتوں کو تبسم بنائے گل
اوروں سے پھر کہے کہ لہو دیں چمن کو وہ
پہلے ذرا کچھ اپنا پسینہ بہائے گل
تاریخ گلستاں تو ہے سبزے کی داستاں
یہ نالۂ ہزار نہ یہ خندہ ہائے گل
اب ہر ہنسی پہ قید ہے ہر پنکھڑی کی ناپ
شاید غرض یہی ہے کہ جینے نہ پائے گل
گلچیں ہے پُر فریب عمل اور قول اور
نعرہ بنام سبزہ و سجدہ بہ پائے گل
ملا اور اک صنم کا بہت اِن دنوں ہے ساتھ
ڈرتا ہوں ساتھ یہ نہ کہیں کچھ کھلائے گل

~~~~~
~~~~~

☆

سمجھے تھے آشیانہ ہے زنداں میں آگئے
اُف کس نظر فریبیِ عنواں میں آگئے

یوں چاک بڑھ رہے ہیں کہ اللہ کی پناہ
دامن بھی اب حدودِ گریباں میں آگئے

اپنے غموں کو نام دوں اب کیا الگ الگ
جتنے بھی غم تھے سب غمِ دوراں میں آگئے

ناصح نے چھیڑ دی ہے جنون و خرد کی بات
لو پھر نزاعِ مشکل و آساں میں آگئے

وقفہ، وہ ڈھونڈتا تھا نئے جور کے لیے
اور ہم فریبِ چشمِ پشیماں میں آگئے

ہے ایک درسِ حُسن کی فنکاری کلام
مشکل سخن تبسمِ آساں میں آگئے

جن بولوں کو خرد نے مٹایا لبوں سے آج
ایک ایک کر کے سب دلِ ناداں میں آگئے

دل اعترافِ جُرم سے پھر جگمگا اُٹھا
سب داغ دُھل کے اشکِ پشیماں میں آگئے

صحرا کو نام دو نہ چمن کا جو چند پھول
کانٹوں کے ساتھ اُلجھ کے بیاباں میں آگئے

پائندہ کچھ سرود بھی ملا زہے نصیب
میری حدیثِ عمرِ گریزاں میں آگئے

~~~~~
~~~~~

☆

گلشن ہے اسی کا نام اگر، حیراں ہوں بیاباں کیا ہوگا
ہنگامِ بہاراں جب یہ ہے، انجامِ بہاراں کیا ہوگا
یہ جنگ تو لڑنا ہی ہوگی ہر برگ سے چاہے خوں ٹپکے
کانٹوں سے جو گل ڈر جائے گا دارائے گلستاں کیا ہوگا
الفت کو مٹانے کے درپے دنیا اور میں اس سوچ میں ہوں
الفت نہ رہے گی جب باقی خوابِ دلِ انساں کیا ہوگا
میں دور بھی تم سے جی لوں گا تم میرے لیے کچھ غم نہ کرو
مانا کہ پریشاں دل ہوگا ایسا بھی پریشاں کیا ہوگا
جس ہاتھ میں ہے شمشیر و تبر، کیا اس سے امیدِ برگ و ثمر
جو شاخِ نشیمن توڑے گا معمارِ گلستاں کیا ہوگا
آوازِ ضمیر اپنی سُن کر ملا نے بتالی راہِ عمل
یہ فکر کبھی اس کو نہ ہوئی اندازِ حریفاں کیا ہوگا

~~~~~
~~~~~

☆

زیست تاروں کی رہ گزر بھی نہیں
اور پیراہنِ شرر بھی نہیں

وہ شبِ زیست آئی ہے جس میں
خواب بن کر کوئی سحر بھی نہیں

کتنی سنسان ہے وہ ہجر کی رات
جس میں آہنگِ چشمِ تر بھی نہیں

شیخ اس حور کے لیے سجدے
جو ابھی جنسِ معتبر بھی نہیں

چشمِ صیاد ہم پہ ہے پھر کیوں
اب تو وہ دورِ بال و پر بھی نہیں

آج ہر دل ہے ایک بند حصار
آنکھوں آنکھوں میں رہ گزر بھی نہیں

سو گیا دار پر بھی دیوانہ
عقل کو نیند سیج پر بھی نہیں

کالی گلیوں میں کاروانِ حیات
شاہراہوں پہ اک بشر بھی نہیں

جینے والا نہ جی سکے ملا
زندگی اتنی مختصر بھی نہیں

~~~~~
~~~~~

☆

جن کی نظروں میں مے کے پیالے ہیں
آستینوں میں سانپ پالے ہیں
کنجیاں جیسے کھو گئی ہوں کہیں
دل نہیں آج بند تالے ہیں
شیخ رکھے ہیں سر پہ یوں دستار
جیسے دنیا یہی سنبھالے ہیں
انقلاب، اتحاد، آزادی
کل یہ نعرے تھے آج نالے ہیں
آنکھیں یوں ہی نہیں بنی ہیں زباں
کتنے آنسو نظر میں ڈھالے ہیں
شیخ یہ گفتگو، ارے ہم بھی
اِسی بستی کے رہنے والے ہیں
کس کو دیوانگی کا دیں الزام
خود ہمیں کون ہوش والے ہیں

~~~~~
~~~~~

☆

ہر انقلاب کی سرخی انھیں کے افسانے
حیاتِ دہر کا حاصل ہیں چند دیوانے
خدائے ہر دو جہاں خوب ہے تری تقسیم
زمیں پہ دیر و حرم اور فلک پہ مے خانے
ہماری جا بھی کہیں ہے خدائے دیر و حرم
حرم میں غیر ہیں اور بتکدے میں بیگانے
نہ پوچھ دورِ حقیقت کی سختیوں کو نہ پوچھ
ترس گئے لبِ افسانہ گو کو افسانے
یہ جبرِ زیست محبت پہ کب تلک آخر
کہ دل سلام کریں اور نظر نہ پہچانے
الگ الگ سے افق پر ہیں چھوٹے چھوٹے غبار
یہ کارواں کو مرے کیا ہوا خدا جانے
نظامِ میکدہ ساقی چلے گا یوں کب تک
چھلک رہے ہیں سبو اور تہی ہیں پیمانے

~~~~~
~~~~~

☆

وہ نبض کی رفتار کہ چھٹتے ہیں پسینے
لگتے نہیں دنیا ترے جینے کے قرینے
نظروں میں ہمیں ہم تھے کسی بزم میں جب تھے
اُٹھ آئے تو بھولے سے بھی پوچھا نہ کسی نے
بن جاتے ہیں، تقدیر بدلتی ہے جہاں رُخ
چڑھتے ہوئے زینے ہی اُترتے ہوئے زینے
اب انجمِ فلک بن کے دکھاتے ہیں ہمیں آنکھ
ذرّے وہی کل جن کو اچھالا تھا ہمیں[1] نے
بے کس پہ ستم توڑنے والوں میں نہ ڈھونڈو
جرأت وہ جو خنجر کفِ سفاک سے چھینے
آغوش میں ساحل کی جو گزری وہ نہ پوچھو
طوفاں کو صدا دینے لگے پھر سے سفینے
وہ شوق کی بستی ہے نہ اشکوں کے چراغاں
اب دیدہ و دل ہیں کہ ہیں یادوں کے دفینے
مے خانے میں یوں وعظ کناں ملا تھا کل رات
شعلہ بہ پیارے و نگارے بہ کمینے

~~~~~

---

[1] میرے ذوق کو یہ قافیہ ناگوار نہیں۔
~~~~~

☆

طوفانِ دل ہے اب آرمیدہ
اے وائے فصلِ مژگان و دیدہ

بے حرف و بے صوت، پیغامِ الفت
سینہ بہ سینہ، دیدہ بہ دیدہ

مدت کے بچھڑے ان سے ملے تھے
دہرائے قصے کچھ چیدہ چیدہ

نرمی بھی گرمی بھی اس نظر میں
اک تارِ شبنم شعلہ و دیدہ

لایا چمن پر اکثر تباہی
اک فتنۂ گل، باغ آفریدہ

اللہ ری علم کی حشر گاہی
شب تک گماں صبح کا ہر عقیدہ

توڑی گئیں کتنی کلیاں، کھِلا تب
اک دلبرِ گلستانِ خوش دمیدہ

انجام تیرا اک داغِ دامن
اے تاجِ مژگاں اے نورِ دیدہ

کیا جانے کب ٹوٹ جائے یہ تارا
ملا ہے اشکِ مژگاں رسیدہ

~~~~~~
~~~~~~

جادۂ ملا

(1988)

انتساب

رفیقۂ حیات
انپورنا
کے نام

پیش لفظ

پچھلے پچاس ساٹھ سال میں اردو شاعری میں جو چند معتبر اور منفرد آوازیں ابھری ہیں ان میں ایک ممتاز آواز آنند نرائن ملا کی بھی ہے۔

ملا صاحب نے شاعری کا آغاز اس زمانے کے لکھنؤ میں کیا تھا جب صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی اور ثاقب لکھنوی جیسے اساتذہ کا سکہ چل رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب غزل ہی سب سے مقبول صنفِ سخن تھی۔ زیادہ تر حسن و عشق کے روایتی مضامین ہی غزل کے موضوعات میں شامل تھے۔

لکھنؤ میں ملا صاحب سے کچھ پہلے صرف چکبست ایسے شاعر تھے، جن کی شاعری میں بیسویں صدی کے ابتدائی پندرہ بیس سال کے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ لیکن چکبست کے موضوعات کا دائرہ خاصا محدود تھا۔

اس اعتبار سے لکھنؤ میں چکبست کے بعد دوسرا نام ملا صاحب ہی کا ہے، جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک زندگی اور انسانیت کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ ملا صاحب کی شاعری کا افق بہت وسیع ہے اور یہ متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔

ملا صاحب کے زمانے تک لکھنؤ کی تہذیبی فضا میں شعر گوئی اور سخن فہمی دونوں علم مجلسی کا حصہ تھے۔ انھوں نے اپنی فکر، اپنے خیال اور اپنے احساس و ادراک کے اظہار کے لیے شاعری کا میڈیم اختیار کیا۔ انھیں نظم اور غزل دونوں اصناف پر پوری قدرت ہے۔ انھوں نے نظم گوئی سے شاعری کی ابتدا کی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

ملا صاحب کی شاعری صرف ایک فردِ واحد کے دل کی آواز نہیں بلکہ یہ اس پورے عہد کی صدائے

بازگشت ہے جس میں ملا صاحب جی رہے ہیں۔ ملا صاحب کے دور کا اجتماعی شعور ان کی شاعری کا سب سے نمایاں آہنگ ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملا صاحب کی شاعری اُردو کی تمام صالح روایتوں کی امین بھی ہے اور عصری زندگی کے تقاضوں سے ہم کنار بھی ہے، انھوں نے روایت کی پاس داری کرتے ہوئے لیکن فرسودگی سے دامن بچاتے ہوئے اپنا تخلیقی سفر طے کیا ہے، اس لیے وہ اپنے عہد کے فکری اور فنی تقاضوں سے منحرف نہیں ہیں۔ ملا صاحب نے اپنے طویل تخلیقی سفر کے دوران غزل کو بُری طرح معتوب ہوتے ہوئے بھی دیکھا اور اسے ایک نئی تازگی کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس پورے عرصے میں غزل کے ساتھ ان کی مستقل اور غیر مشروط وفاداری ان کے سلیم الطبع ہونے کی دلیل ہے۔ اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس دور میں جن شاعروں نے غزل کو نئے تیوروں سے سجایا ہے ان میں ملا صاحب بھی ایک ہیں۔ غزل کو خطاب کرتے ہوئے ملا صاحب کے یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

دُلھن تھی تجھے میں نے ساتھی بنایا
شبستاں سے میدان میں کھینچ لایا
تیرے نرم لہجے کو للکار دے دی
ترے دستِ نازک میں تلوار دے دی
دیا دردِ انساں کا احساس تجھ کو
کھڑا کردیا نظم کے پاس تجھ کو

غزل کے بارے میں ملا صاحب کی ایک مسلسل غزل کے یہ چند اشعار بھی دیکھیے:

غزل محفل میں تیری پینے والوں کی کمی کب تھی
مگر ان پینے والوں میں مری شائستگی کب تھی
لب و رخسار کے قصے، نگاہ و دل کے افسانے
ترے ہونٹوں پہ لیکن آیتِ پیغمبری کب تھی

شعورِ اجتماعی عبث جس پہ خاص مہریں تھیں
تری حد تھی تجھے حاصل یہ انساں آگہی کب تھی
غزل اک نام تھا ناکامیوں پر سینہ کوبی کا
مرے پہلے یہ بانگِ کاروانِ زندگی کب تھی

غرض ملا صاحب کی شاعری نئے سفر، نئی سمت اور نئی منزل کی تلاش کی شاعری ہے۔ اور بہ قول ملا صاحب:

اب آگے تیری قسمت ہے اے قافلۂ گمراہ بشر
میں نے تو اندھیری راہوں میں کچھ دیپ جلا کر چھوڑ دیے
اس بحث کو چھوڑو، خود ملا پہنچا کہ نہ پہنچا منزل تک
لیکن اُس نے یاروں کو نئی کچھ راہیں دیں، کچھ موڑ دیے

ملا صاحب کی شاعری ایک انسان دوست کی شاعری ہے، ایک ایسے دردمند انسان کی شاعری جس پر امیر مینائی کے اس مصرعے کا "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" بھر پور اطلاق ہوتا ہے۔ انسان دوستی کی باتیں یوں تو بہت سے شعرا نے کی ہیں لیکن اسے مسلک کے طور پر اپنانے والوں میں غالب کے بعد شاید سب سے نمایاں نام ملا صاحب ہی کا ہے۔

غالب سے قبل اردو شاعری میں انسان دوستی کا نظریہ تصوف کے راستے وارد ہوا تھا جب کہ غالب کے ہاں یہ نظریہ ان کی فکر اور عقیدے کی اساس بن کر آیا ہے۔

غالب قومی یکجہتی کے نہیں بلکہ انسانی یکجہتی کے نقیب تھے اور انسانیت کو قوموں یا گروہوں یا دوسرے لفظوں میں جغرافیائی اور مذہبی حدود میں تقسیم نہیں کرتے تھے۔ غالب کا یہ شعر اُن کے مسلک کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

ملا صاحب نے جب اردو میں شعر گوئی کا آغاز کیا تو انھیں انگریزی میں شعر کہتے ہوئے آٹھ دس سال ہو چکے تھے۔ انھوں نے 1923ء میں انگریزی میں ایم۔اے کیا تھا۔ ایم۔اے کرنا تو خیر معمولی بات ہے اصل بات یہ ہے کہ ملا صاحب نے انگریزی ادب کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہ وہ عہد تھا جب انگریزی ادب کا مطالعہ کرنے والوں کو اردو میں صرف غالب ہی متاثر کرسکتا تھا۔ ملا صاحب بھی غالب سے اور اس کے بعد اپنے ہم عصروں میں اقبال سے متاثر ہوئے۔ اُن کا کہنا ہے کہ انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں نہ جانے کتنی بار شروع سے آخر تک دیوانِ غالب پڑھا ہوگا۔ سارے کا سارا دیوان انھیں حفظ تھا۔ غالب سے ملا صاحب کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کلام غالب کے کچھ حصّوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ پوری گفتگو میں نے صرف یہ بتانے کے لیے کی ہے کہ ملا صاحب کی شاعری کی بنیاد انسان دوستی پر ہے۔ وہ انسانیت کو کُل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اسے جغرافیائی اور مذہبی خانوں میں تقسیم نہیں کرتے۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں برطانوی سامراج ہندوستانی سیاست کو ہندو اور مسلم سیاست میں تقسیم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس فرقہ پرست سیاست کا سب سے بڑا اسٹیج یوپی تھا۔ جہاں ملا صاحب کی زندگی کا بڑا حصّہ گزرا۔ ہر انسانی اور عالمی قدروں پر ملا صاحب کا ایسا پختہ ایمان تھا کہ ان کے قدموں میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی۔ مجھے پچھلے تقریباً پندرہ سال سے ملا صاحب سے قربت کا فخر حاصل ہے۔ بارہا آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد ہندوستانی سیاست پر ان سے گفتگو بھی ہوئی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات پر بھی تبصرے ہوئے ہیں، میں نے اچھے سے اچھے کشادہ اور سیکولر ذہن کے لوگوں کو تنگ نظری کے دامن میں پناہ لیتے دیکھا ہے، لیکن فرقہ پرستی کے تیز طوفانوں میں بھی ملا صاحب نے انسانیت کی شمع روشن رکھا اور بڑے سے بڑے منافع کے لیے بھی انھوں نے اپنے رنگ و بو کے خوابوں کا سودا نہیں کیا۔ انسان دوستی ملا صاحب کے لیے کوئی ایک ایسی نقاب نہیں جسے وہ اپنے چہرے پر لگا کر ادب یا سماج میں کوئی جھوٹا وقار حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ انھوں نے ''میری حدیثِ عمر گریزاں'' کے دیباچے میں لکھا ہے: ''میں شاعر کو صرف فنکار نہیں سمجھتا بلکہ دانائے راز اور پیمبر بھی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک کوئی شاعر یا افسانہ نگار نوعِ انسان سے بے پناہ محبت کیے بغیر عظیم نہیں ہوسکتا اور نہ وہ ادبِ عالیہ پیش کرسکتا ہے۔ نوعِ انساں سے اس طرح محبت کرنے والا اجتماعی مفاد کو انفرادی آسودگی پر قربان کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا اور اس کی زندگی اور پیام میں

بھی کوئی اس قسم کا تضاد پیدا نہیں ہوسکتا...... میرا اپنا عقیدہ تو یہی ہے کہ جس ادب میں انسانی درد کی آواز نہیں، وہ زیادہ سے زیادہ ذہنی عیاشی کے لیے سامان فراہم کرسکتا ہے لیکن دل و دماغ کی تربیت نہیں کرسکتا۔ کلام میں تاثیر خلوص سے پیدا ہوتی ہے اور عظمتِ انسانی، درد کی آواز شامل کرنے سے۔ وہی شاعر ادبِ عالیہ پیش کرسکتا ہے، جس میں یہ دونوں باتیں موجود ہوں" (میری حدیثِ عمر گریزاں ص پ)

جب انسان کی کمر سیدھی ہوئی تو اس نے سماجی زندگی کا آغاز کیا اور اس کے شعور میں وسعت پیدا ہوئی تو سچائی اور حقیقت کی کھوج اور حق و باطل یا تیرگی اور نور کی جنگ نے اس کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ لاکھوں برس گزرنے کے باوجود ابھی تک یہ جنگ جاری ہے۔ ملا صاحب کی شاعری میں انسان کی شکست و فتح، خوشی و غم اور مسلسل جدوجہد کی عکاسی ان الفاظ میں ہوئی ہے:

خستگی و تشنگی و رہزن و ریگ و سراب
کتنی صدیاں ہوگئیں، انسان چلتا جائے ہے

مشعلِ دل بھی سینے میں فروزاں چاہیے
راہِ منزل میں چراغِ رہ گزر کافی نہیں

ہونٹوں پہ رہا پیغامِ سحر، مٹی پہ قدم، تاروں پہ نظر
راتوں میں کٹی، راتوں میں مگر خوابوں کے اجالے جوڑ دیے

یہ عقل کی مادہ پرستی مزاج دنیا بدل رہی ہے
یہ روحِ انساں کو رکھ کے اپنے قدم کے نیچے کچل رہی ہے

کبھی شاید یہ محفل بھی ستاروں سے چمک اُٹھے
ابھی تو اشکِ بے کس سے چراغاں ہے جہاں میں ہوں

جہادِ زیست کے تپتے ہوئے بیاباں میں
اُٹھائے سر، شجر سایہ دار ہیں کیا کیا

پھر جہلِ گزشتہ کی ہے دنیا متلاشی
دانائی امروز سے گھبرائی ہوئی سی

ملا صاحب انسانی زندگی کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ارتقا کی منزلوں میں انسان نے کبھی کبھی تاریکیوں سے شکست کھائی ہے تو اکثر تاریکیوں کو پسپا بھی کیا ہے۔ ملا صاحب انسانیت سے ناامید نہیں ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ:

یاس کی آندھیوں میں بھی دل سے کبھی مٹی نہ آس
کم ہوئی لو ہزار بار شمع کبھی بجھی نہیں

تیرگی بڑھ بڑھ کے تاروں کو بجھاتی ہی رہی
تیرگی کو چیر کر تارے نکلتے ہی رہے

جب بھی گھری ہے موجوں میں کشتی حیات کی
ابھرے ہیں موج ہی سے کنارے نئے نئے

کرب میں پھر ہے مادرِ عالم
اک نیا دور لے رہا ہے جنم

کیسے عزم اور حوصلے کے ساتھ ملا صاحب ابھرتے ہوئے نئے سورج کی نشان دہی کرتے ہیں:

فضا کی تیرگی، نیم شب سے کر نہ قیاس
اُفق کی گود میں ننھا سا آفتاب بھی دیکھ

وہ پیشِ نظر ہے وادیِ گل، ہمت سے ذرا اِک اور قدم
اب کوہ تو تو سر کر ہی چکا، تھوڑی سی ترائی باقی ہے

اس موضوع پر ملا صاحب کی ایک نظم "میری دنیا" کے کچھ شعر سنیے:

شعلوں میں تیرے تپ کر انساں پگھل گئے ہیں
بازارِ زندگی کے سکے بدل گئے ہیں

طاقت کی ہے پرستش اب تیرے معبدوں میں
سونے کے دیوتا ہیں، تیرے صنم کدوں میں

دل کانپتا ہے میرا انساں کی طاقتوں سے
لگتا ہے خوف مجھ کو اونچی عمارتوں سے

انساں اتر رہا ہے رہِ درندگی پہ
تہذیب آ گئی ہے، حدِ برہنگی پہ

کیا جہدِ زندگی میں طبعِ بشر یہی ہے
سو بار موت بہتر، جینا اگر یہی ہے

ملا صاحب کی شاعری کا بڑا حصہ محض جذبے اور احساس کی ترجمانی نہیں بلکہ ایک درد مند دل رکھنے والے دانشور کا فکری اظہار بھی ہے۔ وہ ایسی دنیا اور ایک ایسے سماجی نظام کے متلاشی ہیں، جس میں انسان سکون اور آرام کی زندگی گزار سکے۔ جہاں اس کا جسم اور دماغ کسی طاقت، ظلم اور استبداد کا شکار نہ ہو اور جہاں اس کے فکر، احساس اور اس کے اظہار کے پیروں میں بیڑیاں نہ ڈالی جائیں۔ ملا صاحب نے ایک خطبے میں اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا: ''تاریخ عالم ہم کو بتاتی ہے کہ روزِ آفرینش سے لے کر آج تک طفلِ انساں نے ہمیشہ ایک ایسے نظامِ ہستی کے خواب دیکھے، جس میں وہ اپنے شوق کی زندگی آزادی کے ساتھ بسر کر سکے۔ اس کا اپنا گھر ہو، جہاں وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ جب کارِ دنیا سے فرصت پائے تو کچھ لمحات سکون اور آرام کے ساتھ گزارے۔ اس کے جسم کو کسی جبر کا شکار بننے کا اندیشہ نہ ہو اور اس کے ذہن کو غلام بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اسے امن اور محبت کی کھلی اور بے خوف فضا میں سانس لے کر اپنے پورے انسانی قد تک پہنچنے کا موقع ملے۔ جہاں افسروں کی نہیں بلکہ قانون کی حکومت ہو جہاں اسے الزامات کے خلاف اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بے روک ٹوک پورا پورا اختیار دیا جائے اور جہاں آزادی، مساوات اور اخوت کے نعروں میں نہیں بلکہ نغمات کی لے میں مذہب وملت، رنگ ونسل اور جنس وذات کے سارے امتیازات، اختلافات اور تفرقے ایک نالۂ بے آواز بن کر فنا ہو جائیں۔'' (کچھ نثر میں بھی، ص ص 17-18) ملا صاحب نے اپنی نظم ''گمراہ مسافر'' میں انسان کے اسی کرب کو بڑے بھرپور انداز میں پیش کیا ہے:

دنیا کے اندھیرے زنداں سے انسان نے بہت چاہا نہ ملا
اس غم کی بھول بھلیاں سے باہر کا کوئی رستا نہ ملا

اہلِ طاقت اٹھتے ہی رہے بھاری بھاری تیشے لے کر
دیوار پسِ دیوار ملی دیوار میں دروازا نہ ملا
ایماں کا فسوں گر بھی آیا جادو کا عصا ہاتھوں میں لیے
اک لکڑی تو اندھے کو ملی آنکھوں کو مگر جلوا نہ ملا
ساقیِ سیاست محفل کے جام و مینا بدلا ہی کیا
جس میں اک تہہ تلخی کی نہ ہو کوئی شیریں جرعا نہ ملا
دولت کا مغنی بھی آیا مضرابِ فراموشی لے کر
ہر ساز سے اک نغمہ پھوٹا لیکن دل کا پردا نہ ملا
رقاصۂ عشرت نے آ کر پھر دل سے نکالیں کچھ پھانسیں
لیکن اس کی چٹکی کو بھی جو روح میں کانٹا تھا نہ ملا
تقسیمِ مساوی کے حامی پھر لے کے بڑھے میزان اپنا
جو سب کو یکساں تول کے دے میزان میں وہ پلا نہ ملا
کچھ کیمیا گر پھر ذرّوں کا دل چیر کے لائے آگ نئی
شعلوں کی خدائی ہاتھ آئی شبنم کا مگر قطرا نہ ملا
بے چاری الفت کی مشعل کونے میں پڑی جل جل کے بجھی
لیکن اسے ہاتھوں میں لے کر کوئی بڑھنے والا نہ ملا
اِر پھر کے وہیں پر آتا ہے انساں ہے رہ باطل پہ ابھی
صدیاں گزریں چلتے چلتے لیکن ہے اسی منزل پہ ابھی

انسان کے دکھ درد کا بھرپور احساس اور انتہائی موثر انداز میں اس کا اظہار ملا صاحب کی آواز کو انفرادیت بخشتا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین مرحوم نے ملا صاحب کی شاعری کے اس منفرد انداز پر گفتگو کرتے ہوئے بہت صحیح لکھا تھا کہ: "ان کے صاف، شفاف اور ذکی الحس ذہن اور انسانی دکھ درد کے تصور سے خون ہوجانے والے دل، دونوں نے مل کر ایک مخصوص شاعرانہ انداز سے زندگی کو فن کی گرفت میں لیا ہے۔" یہ ان کا ایسا انفرادی رنگ ہے جسے انھوں نے شاعرانہ، مترنم اور دل کش زبان میں پیش کیا ہے۔ اس رنگ میں ان کے حریف مشکل ہی سے نکلیں گے۔

ابھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں
ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے، جہاں میں ہوں

طالب امن ہیں سب بزم میں لیکن ہر رند
لے کے اک ہاتھ میں تیغ، ایک میں جام آتا ہے

معبد انساں بنے کیسے یہ ضد ہر دل میں ہے
اس کی پیشانی پہ ہو، میرے ہی بت خانے کا نام

بشر کو مشعلِ ایماں سے آگہی نہ ملی
دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی

دیر وحرم کے معاملے میں ملا صاحب کا ذہن بالکل صاف ہے۔ وہ تفریق کرنے والے مذاہب پر "مذہبِ بشر" کے مذہب کو ترجیح دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

کیوں کسی ایماں سے مانگوں شمع راہِ زندگی
کیا بشر کے واسطے حُبِّ بشر کافی نہیں

ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔ جس میں ملا صاحب نے شاعرانہ تعلّی سے کام نہیں لیا بلکہ انسانیت کے پیغام کو عام کرنے کے لیے اپنی جدوجہد کا ذکر کیا ہے۔ شعر ہے:

اب آگے تیری قسمت ہے اے قافلۂ گمراہِ بشر
میں نے تو اندھیری راہوں میں کچھ دیپ جلا کے چھوڑ دیے

اشعار کے مطالعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انسان دوستی ملا صاحب کے لیے کوئی شاعرانہ موضوع نہیں بلکہ اس کی حیثیت ان کے ہاں ایک ایسے عقیدے کی ہے، جس کے معاملے میں ان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ممکن نہیں۔ اردو میں یہ روایت رہی ہے کہ اگر شاعر نظم گو بھی ہے تو اس کی شعر گوئی کا آغاز غزل ہی سے ہوا ہے۔ علامہ اقبال اور جوش کی شاعری میں نظم کا پلّہ بھاری ہے۔ یہ دونوں نظم کے شاعر ہیں۔ لیکن ان دونوں نے ابتدا میں غزلیں ہی کہی تھیں۔ ملا صاحب نے شعر گوئی کی ابتدا نظم سے کی تھی۔ میرے ذہن میں اردو کا اور کوئی شاعر ایسا نہیں ہے، جس نے نظم گوئی سے اپنی شاعری کی ابتدا کی ہو۔ اس سے یہ تو پتا چلتا ہے کہ ملا صاحب عام ڈگر سے بچ کر خود اپنا راستہ بناتے ہیں۔ لیکن یہ اس حقیقت کا بھی ثبوت ہے کہ ملا صاحب کی شاعری میں فکر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اگر وہ روایتی شاعری کرتے یا صرف جذبے پر زور دیتے یا صرف زبان و اظہار کو اہمیت دیتے تو غزل ہی سے ابتدا کرتے۔ ان کی پہلی نظم ''پرستارِ حسن'' ہے جس میں معنویت بھی ہے اور فکری عنصر بھی اس نظم میں اظہار کی جو پختگی، لہجے کی متانت اور بیان کی جو تازہ کاری ہے وہ بے شمار شاعروں کو مدتوں مشقِ سخن کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی۔

نظم میں ملا صاحب کے موضوعات متنوع ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مشاہدہ اور تجربہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے زندگی کو ایک ہمدرد انسان کی حیثیت سے بہت قریب سے دیکھا ہے۔

ملا صاحب نے شملے کے دیودار--- اور ایک دن انسان جیتے گا، بہی، اندھیر نگر میں دیپ جلیں، بڈھا، عصمتِ افلاس، گرونانک، عقل و دل کا تضاد، بیسوا، محبانِ وطن کا نعرہ، جوئے شیر، موتی لال نہرو،

جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی کا قتل اردو کے نام، قحطِ کلکتہ، لال قلعہ، آخری سلام وغیرہ جیسے موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ بہت کم نظم گو شعرائے یہاں موضوعات کا اتنا تنوع ملتا ہے۔

ملا صاحب نے شاعری میں افسانے بھی لکھے ہیں۔ اُن کی اس طرح کی نظموں میں مریم ثانی، سماج کا شکار اور ٹھنڈی کافی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ مرزا شوق لکھنوی نے، مثنوی کی فارم میں افسانے بیان کیے تھے، جو خاصے طویل تھے۔ ملا صاحب نے نظم میں مختصر اور بہت موثر افسانے لکھے ہیں۔

ملا صاحب کی وطنی شاعری محض جذباتی نہیں ہے، بلکہ اس میں آہنی عزم کے جذبے کے ساتھ فکر کا عنصر بھی شامل ہے۔ ان نظموں میں محض جذباتیت نہیں بلکہ منطقی استدلال بھی ہے۔ وطنی موضوعات پر ان کی نظمیں لال قلعہ، صبحِ آزادی، سجدۂ عقیدت زمینِ وطن اور تاشقند جیسی نظمیں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

فراق کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں ہندی کے ایسے الفاظ کا برجستہ استعمال کیا ہے جو اردو میں مستعمل نہیں تھے۔ ملا صاحب کی اس خوبی کی طرف ہمارے نقادوں کی نظر نہیں گئی، ورنہ ملا صاحب نے اپنی نظموں اور غزلوں میں ہندی الفاظ کا ایسا برجستہ استعمال کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو ہی کے الفاظ ہیں۔ ملا صاحب ایسی نظموں میں شعر کا جنم، اندھی نگر میں دیپ جلیں اور سپنے بہت اہم ہیں۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

اپنے ذہنی رویّے کے اعتبار سے ملا صاحب سوفی صدی ترقی پسند ہیں۔ لیکن انھوں نے کبھی بھی اپنی شناخت اس ترقی پسندی کے ساتھ نہیں کی جو ایک زمانے میں سکّۂ رائج الوقت بن چکی تھی یہی وجہ ہے کہ جب احتشام حسین، آلِ احمد سرور اور بعض دوسرے نقادوں نے ان پر ترقی پسند کا لیبل چپکانا چاہا تو انھوں نے انھیں اس کی قطعی اجازت نہیں دی بلکہ اپنی نظم اور نثر دونوں کے ذریعے اس کی تردید کی۔ وہ سیاست کو ادب کا حصہ ضرور سمجھتے ہیں لیکن ادب کو سیاست بنانے کے قائل نہیں ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں نہ کوئی نعرے بازی ہے اور نہ ان کے ہاں انقلاب کی کوئی رومانی لے ہے۔ وہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے تشدد کے بھی قائل نہیں۔ لیکن پھر بھی شاعری کے بارے میں ان کا ایک موقف ہے، وہ جو کچھ لکھتے ہیں پورے اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں اس اعتبار سے ان کی شاعری ترقی پسند تحریک کے اس منشور کی خلاف ورزی نہیں کرتی جو 1936ء

غالب کا یہ مصرع ''ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم'' ملا صاحب کے لیے محض شاعرانہ خیال نہیں بلکہ عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے ان کی فکر اور بصیرت کائناتی ہے ان کا ایک فلسفہ اور ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی نظریہ ہے اور وہ ہے انسان دوستی۔ وہ انسانیت کو کل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اسے مذہبی یا جغرافیائی خانوں میں تقسیم نہیں کرتے۔ انھوں نے شاعری میں یہ عقیدہ روایتی مضمون کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ یہ عقیدہ ان کی گفتار اور کردار دونوں سے ہم آہنگ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روے ہستی سے
ترے ہاتھوں بہت توہینِ آدم ہوتی جاتی ہے

ہر دیر و حرم سے کترا کر ملا آیا میخانے میں
ملا کے سے لیکن دنیا میں سلجھے ہوئے انساں کتنے ہیں

بشر کے ذوقِ پرستش نے خود کیے تخلیق
خدا و کعبہ کہیں اور کہیں صنم خانے

ملا صاحب اردو کے معاملے میں صرف قلم کے میدان کے ہی مرد نہیں وہ اردو تحریک کے بھی قافلہ سالاروں میں رہے ہیں۔ دس سال تک وہ ہندستان کے سب سے بڑے ادارے یعنی انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر رہے ہیں صدر کی حیثیت سے انھوں نے مرکزی اور صوبائی حکومت کے مختلف ذمہ داران کو بہت بڑی تعداد میں میمورنڈم پیش کیے ہیں اور انھوں نے اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف زبردست احتجاج کیا ہے۔ انھوں نے اردو کے جائز حقوق کے لیے مطالبے کیے ہیں۔ جناب اندر کمار گجرال کی چیئرمین شپ میں مرکزی حکومت کی قائم کردہ کمیٹی برائے فروغ اردو کے سامنے بے شمار اردو والے پیش ہوئے اور انھوں نے اردو کے سلسلہ میں مطالبات پیش کیے، لیکن ملا صاحب نے جس مدلل طریقے سے اردو کا مقدمہ پیش کیا وہ کوئی اور نہیں

کی بدنصیبی تھی کہ مرکزی حکومت کے بعض بہت سینئر وزیروں کی وجہ سے حکومت کو اس کمیٹی کی رپورٹ اور سفارشات سرد خانے میں محفوظ کرنی پڑیں۔

ملا صاحب کی مادری زبان اردو ہے اور وہ اس معاملے میں کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں آج سے دس پندرہ سال قبل ملا صاحب نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی ایک کل ہند اردو کانفرنس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''اردو میری مادری زبان ہے۔'' میں مذہب بدل سکتا ہوں، مادری زبان نہیں۔
اردو کے نام کے عنوان سے ملا صاحب کا یہ قطعہ ملاحظہ ہو:

اِک موت کا جشن بھی منالیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مسکرا لیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اردو
اِک آخری گیت اور گالیں تو چلیں

آخر میں ملا صاحب کے چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں، جو اہلِ ذوق کے ذہنوں میں محفوظ ہیں:

اِک ہنسی تو وہ جو ہے اشکوں سے وقتی سا ضرار
اِک ہنسی ہے، انتہائے غم پہ آجانے کا نام

ہم نے بھی کی تھیں کوششیں ہم نہ تمھیں بھلا سکے
کوئی کمی ہمیں میں تھی، یاد تمھیں نہ آسکے

وہ اگر خوش بھی ہے، عرفانِ خوشی اس کو نہیں
جس نے جانا نہ کسی غم میں پریشاں ہونا

نہیں میں پیار کے قابل، تو مجھ کو پیار نہ کر
مگر نگاہِ ترحم سے شرمسار نہ کر

آئے ہو کیا تمھی، مجھے آواز دو ذرا
آنکھوں کا نور چھین لیا انتظار نے

یہ کہہ کے آخرِ شب شمع ہوگئی خاموش
کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی

نگاہِ دوست کو اس کی بھی ہے خبر، لیکن
وہ راز جس کا ابھی دل بھی راز دار نہیں

مجھے کر کے چُپ کوئی کہتا ہے ہنس کر
انھیں بات کرنے کی عادت نہیں ہے

ساتھ ہو کوئی تو کچھ تسکین سی پاتا ہوں میں
تیرے آگے جا کے تنہا اور گھبراتا ہوں میں

اک سلام، اک مسکراہٹ، اک سوال، اک شکریہ
وہ بھی یوں نہیں راہ میں آتے ہوئے، جاتے ہوئے

تیوری چڑھا کے پہلے تو کہنے دیا نہ کچھ
پھر مسکرا کے دل سے شکایت بھی چھین لی

اردو شاعری میں ملا صاحب کی آواز منفرد ہے۔ ان کی آواز ماضی کی صدائے بازگشت، حال کا رزمیہ اور مستقبل کی نقیب ہے۔ انھوں نے شاعری میں اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی مسائل کے حل کا کوئی نسخہ پیش نہیں کیا ہے، اس لیے کہ یہ شاعر کا منصب نہیں ہے۔ بڑے شاعر کا کام سماج کی صحیح صورت حال کو سامنے لانا اور انسانیت کو ایسے خطرات سے آگاہ کرنا ہے، جو اسے لاحق ہو سکتے ہیں باقی ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں، یہ وہ چیز ہے جو ہنگامی اور دائمی ادب کے بیچ ایک خط فاصل کھینچتی ہے۔ ملا صاحب کو جو چیز زندہ رکھے گی۔ وہ یہ نہیں کہ ان کی ہمدردیاں کون سی سیاسی پارٹی کے ساتھ ہیں یا وہ ادب کی کون سی تحریک سے متاثر ہوئے ہیں بلکہ یہ کہ انھوں نے زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں کیسے سوچا اور کس طرح اپنی شاعری میں اس سوچ کو سمویا۔ اس اعتبار سے ہمیں شاعر آنند نرائن ملا ایک منفرد اور توانا شخصیت نظر آتے ہیں۔

خلیق انجم

☆

اور اک دن انساں جیتے گا

(1)

کالی اندھیاری راتوں میں اک دیپ جلا اور جل کے بجھا

کچھ دیر کو قصرِ ظلمت پر اک نور کا پرچم لہرایا
کچھ دیر کو چیر کے بادل کی تہ اک تارا مسکایا
کچھ دیر کو اندھی راہوں میں ننھا جگنو مشعل لایا
کچھ دیر بدی سے لڑنے کو نیکی کا سپاہی پھر آیا

روشن پرچم آخر تک اڑا
تارا بجھتے دم تک چمکا
ننھا جگنو گر گر کے اٹھا
نیکی کا سپاہی خوب لڑا

لیکن اس دکھ کی بستی میں
اس اندھیاروں کی نگری میں

آخر وہ نوبت آ ہی گئی
آخر وہ ساعت آ ہی گئی

تاریخِ جہاں نے جب اپنا افسانہ پیشیں دہرایا

پرچم پہ اندھیرے ٹوٹ پڑے...
تارے پہ گرے بادل کے پر...

ننھا جگنو کالی راتوں کی مٹھی میں پھر بند ہوا
نیکی کا سپاہی لڑ کے گرا اور مٹی میں پیوند ہوا
پھر معرکۂ خیر و شر میں نیکی ہاری اور شر جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی

(2)

ویرانے میں اک پھول کھلا کچھ دیر ہنسا پھر مرجھایا
کچھ دم کو فضائے صحرا پر رنگ و نکہت برسا ہی گیا
کچھ دیر کو کانٹوں کے بن میں گلشن کا پیمبر آ ہی گیا
کچھ دم کے لیے اک جامِ حسیں پھر امرت رس چھلکا ہی گیا
کچھ دم کو دیارِ مرگ و فنا جینے کا سلیقہ پا ہی گیا
غنچہ آخر دم تک مہکا
امرت کا ہر قطرہ ٹپکا
گلشن کے پیمبر نے اپنی ہر سانس سے جیون رس گھولا
جنت نے پھر دوزخ کی طرف اپنا اک رنگیں پٹ کھولا
لیکن اس بنجر ریتی پر
اس خار و خس کی بستی پر
آخر وہ نوبت آ ہی گئی
آخر وہ ساعت آ ہی گئی
تاریخ جہاں نے جب اپنا افسانہ پیشیں دہرایا
گل کی جانب ہر خار لیے اک خنجرِ خوں آشام آیا
صحرا کے شیاطین میں گھر کر گلشن کا پیمبر کام آیا
سنگ و آہن کی ضربوں سے امرت کا ساغر چور ہوا
ریت اپنے بگولے لے کر اٹھی اور ہر جلوہ مستور ہوا
پھر دشت و چمن کے معرکے میں گلشن ہارا صحرا جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی

(3)

اک انساں زیست کی راہوں میں اُلفت کی مشعل لے کے بڑھا

خنجر سی نگاہیں سنگ سے دل کچھ دم کے لیے پھر نرم ہوئے
شبنم نے بھڑکتے شعلوں پر کچھ دم کے لیے پھائے رکھے
نفرت کی چٹانیں کچھ سرکیں کچھ دم کے لیے سوتے پھوٹے
کڑوے بولوں کی وادی میں کچھ دم کے لیے نغمے گونجے

شبنم جیتے جی شعلوں پر رکھتی ہی رہی ٹھنڈے پھائے
گھولا ہی کیے ہر تلخی میں میٹھا رس آخر تک نغمے

ہر قہر و بلا سے لڑنے اک انساں وفائیں لے کے بڑھا
دل میں اُلفت، اشک آنکھوں میں، ہونٹوں پہ دعائیں لے کے بڑھا
نفرت کی تپتی وادی میں اُلفت کی گھٹائیں لے کے بڑھا

لیکن اس جبر کی دھرتی پر
اس خون سے سینچی مٹی پر

آخر وہ نوبت آ ہی گئی
آخر وہ ساعت آ ہی گئی

تاریخِ جہاں نے جب اپنا افسانہ پیشیں دہرایا

شبنم کی ننھی بوندوں پر ہر سمت سے پھر شعلے لپکے
ذہنوں سے اُٹھیں وہ پھنکاریں، دل کے سارے نغمے ڈوبے
حرص اور ہوس کے زنداں میں ابنِ آدم پھر بند ہوا
اُلفت کو نہ کر پایا سجدہ طاقت کا عقیدت مند ہوا

حق اور ناحق معرکے میں پھر حق ہارا ناحق جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی

(4)

اک دیپ جلا، آندھی نے مگر تادیر اسے جلنے نہ دیا
اک پھول کھلا، صحرا نے مگر تا دیر اسے ہنسنے نہ دیا
اِک انساں اُلفت لے کر بڑھا، دنیا نے مگر بڑھنے نہ دیا
اکثر تو اسے جینے نہ دیا
جب سے یہ دنیا قائم ہے
یہ جنگ برابر جاری ہے
اب تک تو یہی ہوتا آیا انساں ہارا شیطان جیتا
لیکن جب تک یہ دنیا ہے
یہ جنگ بھی ہوتی جائے گی، میدان بدلتے جائیں گے
اور اک دن انساں جیتے گا

~~~~~

خلوصِ فن کا ہر فنکار سے پہلا تقاضا ہے
نظر اک دِل کی جانب بھی ہو جب سوئے جہاں دیکھے

~~~~~

☆

لہو کا ٹیکا

وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا
ترے ناموس پر سب کچھ لٹا دینے کا وقت آیا

وہ خطہ دیوتاؤں کی جہاں آرام گاہیں تھیں
جہاں بے داغ نقشِ پائے انسانی سے راہیں تھیں
جہاں دنیا کی چیخیں تھیں نہ آنسو تھے نہ آہیں تھیں
اسی کو جنگ کا میداں بنا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

رو پہلی برف پر ہے سرخ خوں کی آج اک دھاری
سحر کی نرم کرنوں نے یہاں دوشیزگی کھوئی
ہوئی آلودہ یہ معصوم دنیا اپسراؤں کی
اب ان ناپاک دھبوں کو مٹا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

بدلتی ہے چمن میں جیسے رُت یوں آئی آزادی
اہنسا کے پیمبر نے ہمیں دلوائی آزادی
بہت خوش تھے کہ اتنے سستے داموں پائی آزادی
جو قرضہ رہ گیا تھا وہ چکا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

سمجھتے تھے کہ نیکی سے بدی کا دل بدلتا ہے
توانا کے مقابل ناتواں کا حق بھی چلتا ہے
صداقت کا دیا باطل کی آندھی میں بھی جلتا ہے
حسیں خوابوں کی یہ شمعیں بجھا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

گرا کر ہر نزاعِ درمیاں کی چار دیواری
سیاست کی دھڑے بندی، زباں کی تفرقہ کاری
مٹا کر صوبہ و ایمان وملت کی حدیں ساری
ہمالہ پر نئی سرحد بنا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

ہر اک آنسو کا شعلہ جذب کر کے دل کے خرمن میں
ہر اک فریاد کی لے ڈھال کر اک عزمِ آہن میں
ہر اک نعرے کی بجلی کر کے آسودہ نشیمن میں
پھر اس بجلی کو دشمن پر گرا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

ہر اک خوابیدہ طاقت کو پیامِ بزم دیتا ہے
ہر اک بیدار جذبے کو مزاجِ عزم دیتا ہے
ہر اک سازِ طرب کو آج سوزِ رزم دیتا ہے
ہر اک شہری کو اب وردی پہنا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

ہر اک مزدور اور دہقاں کی نم پیشانی یارو!
غریبوں کا لہو یارو، امیروں کے درم یارو!
ہر اک کشت و دکاں یارو، ہر اک سیف و قلم یارو!
وطن کے داؤں پر سب کچھ لگا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

ہر اک بازار و کوکو رزم گہ شاید بناتا ہو
ہر اک دیوار و در پر مورچہ شاید بناتا ہو
خود اپنی کشت کو آتش کدہ شاید بناتا ہو
ہر اک چپے پہ آہوتی چڑھا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

یہ اہلِ خانہ کی غاصب لٹیروں سے لڑائی ہے
یہ چڑھتی رات کی، روشن سویروں سے لڑائی ہے
چراغ آدمیت کی، اندھیروں سے لڑائی ہے
ہر اک بستی میں انساں کی صدا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

عدو کے مکروفن کا ہے عجب اک دورخی منظر
تبسم اس کے اس رخ پر تو شعلے لب پہ اس رخ پر
ادھر کربلا کا ساغر ہے، ہلاکو کا اُدھر خنجر
اب اس یوسف کے بھائی کو سزا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

نقاب نو رخ کے پیچھے ہے پہلی شکل خاقانی
وہی سفاک نظریں ہیں وہی ہے چین پیشانی
وہی چنگیز کا جذبہ، وہی خوابِ جہاں بانی
اب ان خوابوں کو مٹی میں ملا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

خبر پہنچا دو اس خطرے کی اب ہر بزمِ انساں میں
درندہ پھاند کر دیوار، پھر آیا ہے میداں میں
وہی، دنیا نے پہلے بھی جسے رکھا تھا زنداں میں
اٹھو! پھر اک نئی دیوار اٹھا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

جوانانِ وطن آؤ! قطار اندر قطار آؤ
دلوں میں آگ، نظروں میں لیے برق و شرار آؤ
بڑھو! قہر خدا اب بن کے سوئے کارزار آؤ
جلالِ غیرت قومی دکھا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا
بہادر ہند کے لڑتے ہیں کیسے آج دکھلاؤ
روایاتِ شجاعت کو نئے کچھ باب دے جاؤ
مٹو تو داستانیں ہوں، جیو تو تاج دار آؤ
لہو کا، ماں کو پھر ٹیکا لگا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا
ترے ناموس پر سب کچھ لٹا دینے کا وقت آیا

~~~~~

رُخِ صنم خانہ تمتمایا، شکن جبینِ حرم پہ آئی
ادھر جہاں کے الم کدے میں کسی نے راحت کا خواب دیکھا

~~~~~

☆

شعر کا جنم

گرنے لگے کیوں!
ذہن پہ پھر پردے پردے
کھوئے کھوئے سے کچھ خواب
جھل مل جھل مل چند خیال
پرچھائیں سی ہر تصویر

چھانے لگے کیوں!
آنکھوں پر بادل بادل
سایہ سایہ ہر جلوہ
جلتے بجھتے کچھ دیپک
گہنائی سی ہر تنویر

ہونے لگا کیوں!
دل کا ورق سادہ سادہ
نقش ہر اک دھندلا دھندلا
اُڑا اُڑا ہر چتر کا روپ
مٹی مٹی سی ہر تحریر

آنے لگے کیوں!
ہونٹوں پر اُلٹے سلٹے

مبہم ٹوٹے پھوٹے لفظ
بے حرف د بے ربط سے گیت
بے آوازسی اک تقریر

شاید مجھ سے دور کہیں
مجھ میں رہتا ہے جو میں
چھپ کے الگ تنہا تنہا
پھر کربِ تخلیق میں ہے
جب وہ پلٹ کر آئے گا
نئے سندیسے لائے گا
نئی شعائیں پھوٹیں گی
اور گہن سے چھوٹ کے پھر
میں خود کو پا جاؤں گا

پردے الٹ کر ذہن کے پھر
اُبھرے گی تعمیر نئی
سائے چیر کے آئے گی
آنکھوں میں تصویر نئی
دل سے اُبلے گا پھر رنگ
چمکے گی تحریر نئی
اور مرے جلتے ہونٹوں پر
دہکے گا اک گیت نیا
شعر نیا جنم لے گا

میرے سر میں ابھی ملا یہ خلل باقی ہے
آج گم نام ہوں لیکن ابھی کل باقی ہے
نقشِ پا سے مرے روشن نہ سہی راہِ ادب
میری تابانی کردار و عمل باقی ہے

~~~~~
~~~~~

☆

ایوانِ عدالت سے رخصت ہوتے ہوئے

یہ ہمتِ مردانہ پھر آئے کہ نہ آئے
مجھ سا کوئی پروانہ پھر آئے کہ نہ آئے
طاقت کی رعونت کے مقابل بہ لبِ عدل
یوں حرفِ حریفانہ پھر آئے کہ نہ آئے
ساقی سے سوا تشنہ لبوں سے تھا جسے انس
محفل میں وہ پیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے
جادے سے ہٹے گام تو اک جادۂ نو اور
یہ لغزشِ مستانہ پھر آئے کہ نہ آئے
سو خوشوں کی مستی بھی ہر اک بوند میں جس کی
وہ دانۂ صددانہ پھر آئے کہ نہ آئے
چنتی ہی رہی شیخ کی داڑھی کے جو تنکے
یہ جرأتِ رندانہ پھر آئے کہ نہ آئے
قانون کی آواز میں نغمے کی کھنک سی
یہ سازِ حکیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے
آتے ہی رہیں گے سرِ طور اور بھی موسےٰ
یہ ضربِ کلیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے

مسند پہ پہنچ کر بھی رہا خامی جمہور
مُلا کا سا دیوانہ پھر آئے کہ نہ آئے

~~~~~~

نظر ہشیار

سیاحِ نظر دیکھ بہت دور نہ جانا
لٹ جائے گا ورنہ
اس وادیِ چشم ولب ورخسارِ حسیں میں
زنہار نہ جانا
سینے کے پہاڑوں پہ نہ ان بالوں کے بن میں
قزاقِ محبت بھی اسی جا ہے کمیں میں

~~~~~~

☆

چڑیوں کا گیت

صد شکر کہ میں ایک چڑیا ہوں
اک ننھی منی سی چڑیا
عقاب نہیں
شاہیں بھی نہیں
یہ چونچ مری تلوار نہیں
میرے پنجوں میں خون نہیں
میں اُڑتی ہوں اور گاتی ہوں
یہ وادیِ منڈل میرا ہے

چھوٹی چھوٹی چڑیو! آؤ
ہم اپنا پورا دل لے کر
اک بادل بن کر چھا جائیں
اور اپنی کروڑوں چونچوں میں
ننھے ننھے کنکر لے کر
ان عقابوں پر برسائیں
شاہینوں پر پتھراؤ کریں
ان کے بازو پنجے توڑیں

اور اپنے وایومنڈل میں
یہ خون و غارت بند کریں
صد شکر کہ میں چھوٹے قد کا
معمولی سا اک انساں ہوں
میں دھرتی کا
دھرتی میری
یہ مٹی میری ماتا ہے
اور میں اس کا مالک بھی ہوں، وارث بھی ہوں رکھوالا بھی
صد شکر کہ میں اک دیو نہیں
میرے دانتوں میں ماس نہیں
اور میرے نوکیلے سینگوں سے
چھاتی میں کسی کے گھاؤ نہیں
اور میرے پیروں کے نیچے
کچلی ہوئی کوئی لاش نہیں
معمولی انسانو! آؤ
ہم سب مل کر ان دیوؤں کے
قلعوں کی دیواریں توڑیں
محلوں کے چراغاں ختم کریں
ہر کٹیا میں اک دیپ جلے
اور سب مل کر اک جشن کریں
دھرتی کا نیا نغمہ گائیں
تاریخ جہاں کے صفحوں میں
اب قصۂ شاہیں ختم ہوا
چڑیوں کا فسانہ آیا ہے
دیوؤں کا زمانہ بیت گیا

انساں کا زمانہ آیا ہے
آکاش کے تارے بجھنے دو
دنیا سے کہو ماتم نہ کرے
ذروں سے کرنیں پھوٹیں گی
مٹی کی خدائی باقی ہے"
صد شکر کہ میں اک چڑیا ہوں
صد شکر کہ میں چھوٹے قد کا
معمولی سا اک انساں ہوں
صد شکر کہ میں اک دیو نہیں

~~~~~~

ستم پر ستم کر رہے ہیں وہ مجھ پر
مجھے شاید اپنا سمجھنے لگے ہیں

~~~~~~

☆

علمِ ناداں

علم نعمت تو ہے مگر اے دوست
اس سے پُر کر نہ یوں دماغ اپنا
کہ خیالوں کو راستہ نہ ملے
اور اس بے ہوا کے کمرے میں
ہر طرف صرف جالے ہی جالے
کوئی کھڑکی بھی کھل سکے نہ جہاں
دم نہ گھٹ جائے آگہی کا کہیں
اور کتابوں کی یہ شناسائی
دیکھ کر دے نہ بے خبر تجھ کو
اس بدلتے غمِ جہاں سے کہیں
اس خراباتِ زندگی سے کہیں
اور تیرا دل و دماغ و شعور
علمِ ناداں کی نذر ہو جائے
اور تو ایک قبر ہو جائے

~~~~~
~~~~~

☆

شاعر کے ترانے

شاعر کے ترانے
اک آگ لگا دیتے ہیں حسّاس دلوں میں
ادراک کی راہوں میں چراغاں ہے انھیں سے
اس دشتِ جہاں میں
چٹکاتے ہیں کلیاں سی مہکتی ہوئی ہر سُو لیکن اثر ان کا
ان ذہنوں پہ جو پست ہیں اور تنگ نظر ہیں
کچھ بھی نہیں ہوتا
جس طرح کہ مہتاب کی کرنوں کے اثر سے
سینے میں سمندر کے تو اک حشر بپا ہے
اک گندے تنگ ظرف سے تالاب میں لیکن
بھولے سے بھی کروٹ نہیں لیتی ہے کوئی لہر
پتھر ہی گرے اس میں تو دیتا ہے یہ آواز

~~~~~
~~~~~

☆

عصمتِ افلاس

من گھڑی اپنی امیری کی الف لیلائیں
بیٹھ کر محفلِ یاراں میں سناتا ہی رہا
کچھ نے لیں چٹکیاں اور کچھ مری باتوں پر ہنسے

چٹکیاں لیں کہ ہنسیں
اس سے ہوتی نہیں توہین مری
میرے احساس کو غیرت کو تو لگتی نہیں چوٹ
میرے درجے مری عزت میں تو آتا نہیں فرق
ان کا ہم بزم تو ہوں
مسخرہ بن کے سہی
مجھ کو اک سائلِ نادار و غرض مند کی صف میں لاکر
اپنی دولت کے مناروں پہ کھڑے ہو ہو کر
ڈال سکتے نہیں جھک جھک کے مری سمت اک آقا کی نظر
بیٹھ کر ایک ہی صوفے پہ برابر ان کے
ملتا رہتا تو ہے اک رشتۂ ہموار کے ساتھ
ان کے سگریٹ کے مہکتے سے چمکتے سے دھوئیں میں مری بیڑی کا سم آلود سیہ فام دھواں
میز کے ایک ہی گوشے میں کبھی
اک کھنک دیتا تو ہے ٹکرا کر

ان کی وہسکی کے گلاسوں سے مرا چائے کا کپ
گونجتی رہتی تو ہے
ان کے پُر کیف ترانوں کی فضاؤں میں بھی
گاہے گاہے مری سہمی ہوئی سیٹی کی صدا

ورنہ کھل جائے اگر ان پہ حقیقت میری
کہ میرے ایک عدد کوٹ کے پردے میں نہاں
جسم ہی جسم ہے
بس ماں کا جنا ننگا جسم
کوئی بنیان پھٹی سی بھی نہیں
تو یہ اغیار صفت یار مرے
اپنے صوفے سے اٹھا کر فوراً
خاک پر مجھ کو اُتاریں گے بڑی نرمی سے
ایک میت کی طرح
اور کھا کھا کے ترس
کھول ڈالیں گے مرے کوٹ کا ایک ایک بٹن
اور پھر کر کے یہ عریاں مجھ کو
خوب جی بھر کے مجھے گھوریں گے
پُر ہوس انگلیوں سے نوچیں گے ہر عضوِ برہنہ میرا
روئیں روئیں میں چبھو کر یہ نکیلے ناخون
لوٹ لے جائیں گے عصمت مری ناداری کی

~~~~~
~~~~~

☆

دنیا ہے یہ کتنی بڑی چھوٹا ہے کتنا یہ جہاں

اتنے بڑے سنسار میں
میرا فقط اک دیس ہے
اور اس بڑے سے دیس میں
میرے لیے بس اک نگر
اور اس بڑی نگری میں بھی
میرا ہے خالی ایک گھر
اور گھر کے اندر ہے مرا
چھوٹا سا اک کمرہ فقط
جس کے بس اک کونے میں ہے
بستر کسی کا اور مرا
اور میری دنیا ہے یہی
آنسو مرے خوشیاں مری
آہیں مری نغمے مرے
دو بستروں کی داستاں
سارے کے سارے ہیں یہیں
اور میرے چہرے کی نقاب

آ کر اترتی ہے یہیں
دنیا ہے یہ کتنی بڑی، چھوٹا ہے کتنا یہ جہاں

~~~~~

منزل

گزرے ظلمات جہاں سے بہ سلامت ملا
ڈر رہے تھے نہ گزر پائیں گے ہارے گزرے
کچھ تو راہیں تری نظروں نے فروزاں کر دیں
کچھ سے ہم اپنے ہی اشکوں کے سہارے گزرے

~~~~~

☆

بڈھا

سانجھ سویرے بڈھا جاگا
کانکھا۔کھانسا
جلدی سے بیڑی سلگائی
جسم پہ خالی ایک لنگوٹی
ننگے بدن پر کپڑے ڈالے
پھٹے، پرانے، میلے کچیلے
رات کی تاپی آگ سے داغی
اور پھر دھیرے دھیرے اُٹھا
ٹانگیں کانپیں۔ٹیسیں اٹھیں
منہ سے بہتی رال میں آکر مل گئے آنسو کے کچھ قطرے
سیدھی کیں سُن ٹیڑھی ٹانگیں
ہاتھ سے ان کو دبا دبا کر
اور ہمت کا لے کے سہارا
آخر سیدھا کھڑا ہوا
جنبش دی مفلوج بدن کو
اور مٹھی میں
مضبوطی سے لاٹھی پکڑی
سرد ہواؤں کے جھونکوں میں

کانپتے اپنا بدن سکیڑے
نئے روز کی لمبی سڑک پر
نکلا اپنے پیٹ کی خاطر
پھر دنیا سے کشتی لڑنے

~~~~~

آشیاں والوں کی اب گلشن میں گنجائش نہیں
آج صحنِ باغ میں یا صید یا صیاد ہیں

~~~~~

دکھا سکے گی نہ ہرگز جہاں کو امن کی راہ
ستمگری کی وہ مشعل جو دور سے ہے سیاہ

~~~~~
~~~~~

☆

معاہدۂ شملہ

فلک کے تاروں کو جھک جھک کے کیوں سلام کریں
خود اپنے گھر کے چراغوں کا انتظام کریں
خرد ہے خوب مگر دل کی موت بن کے نہیں
کبھی کبھی تو کوئی آرزوئے خام کریں
مذاقِ چند خصومت پسند ہونے دیں
مذاقِ چند سے اونچا مذاق عام کریں
زباں کا قفل بھی اک روز ٹوٹ جائے گا
ابھی دلوں کی خموشی کو ہم کلام کریں
اٹھیں گے ہاتھ تبسم بھی آئے گا لب پر
نظر ملا کے ابھی دور سے سلام کریں
وہ شعلے تیغ کے پانی سے جو نہ بجھ پائے
انھیں کو آؤ بہم ہوکے غرقِ جام کریں
سحر کی کرنوں میں ڈھونڈیں نئی حیات کے باب
فسانۂ شبِ ماضی کو اب تمام کریں

~~~~~
~~~~~

☆

بوئے گم شدہ

(ذاکر صاحب کی وفات پر)

اُٹھ گیا وہ جو تھا اک عارفِ کامل ساقی
مردِ درویش کا پہلو میں لیے دل ساقی
پاک دل، پاک نفس، دیدۂ بینا میں لیے
ایک میزانِ تمیزِ حق و باطل ساقی
اپنے ہر جلوۂ شب تاب پہ پردہ ڈالے
اپنی لیلیٰ کو چھپائے پسِ محمل ساقی
سادگی، جو نہ تھی کم مایگیِ رنگ کا نام
بلکہ وہ جس میں ہر اک رنگ تھا شامل ساقی
عجز وہ جو نہ تھا اک جھوٹی رعونت کی نقاب
بلکہ دانش کی تھی جو آخری منزل ساقی
وہ توازن کہ جو کوتاہیِ احساس نہ تھا
بلکہ تہذیبِ دل و ذہن کا حاصل ساقی
ایک آئینِ وفا تنگ نگاہی سے پرے
دلِ انساں کے جوہر خواب کا حامل ساقی
کوئے دشنام میں آیا لیے ہونٹوں پہ سرود
سنگ و آہن کی دکانوں میں لیے دل ساقی

جام بنتے ہی رہیں گے مگر آئے گی کہاں
پھر یہ فردوس کے پھولوں میں بسی گل ساقی
کتنی بے ربط ہے دھارے پہ سفینوں کی قطار
صرف اک ناؤ گئی جانبِ ساحل ساقی
صفِ اوّل سے اٹھا ایک ہی مے خوار فقط
کتنی سنساں ہے لیکن تری محفل ساقی
ایک ہی شمع بجھی موت کے ہاتھوں لیکن
کتنی تاریک ہوئی قوم کی منزل ساقی
اک کلی آئی تھی خوشبو لیے کچھ دم کے لیے
وہ گئی پھر وہی کانٹوں کی ہے محفل ساقی
دفن ہو جائے نہ خوشبو بھی کہیں پھول کے ساتھ
یہی خوشبو تو ہے اس بزم کا حاصل ساقی

~~~~~
~~~~~

☆

سحر و شب

رات کٹتی ہی نہیں
سحر آتی ہی نہیں
مگر اُمیدِ سحر ہے کہ دلِ انساں کو
ایک دم کے بھی لیے چھوڑ کے جاتی ہی نہیں
ارتقا ہے اسی اُمید کا نام
اور ہستی کی رگوں کو یہی دیتی ہے لہو
سوزِ ہر ساز یہی خالقِ فردا ہے یہی
ہر افق کے رُخِ شب تاب کا غازہ ہے یہی
دل کی دھڑکن ہے یہی نبض کا نغمہ ہے یہی
آنکھ کا نور یہی ذہن کا ادراک یہی
قلبِ پُرسوز یہی جرأتِ بیباک یہی
اور افلاک پہ ہے فوقیتِ خاک یہی
یہ ہر اک لحظہ بدلتی ہوئی تعمیرِ جہاں
یہ ہر اک آن بدلتی ہوئی تصویرِ حیات
ان کی فنکار یہی ان کی اداکار یہی
ابنِ آدم کے لیے

جہدِ پیہم ہی ہے سرمایۂ زیست
پُر خطر دہر کی راہوں میں فنِ راہروی
ہر نئے علم میں کچھ تازہ بلاؤں کے نشاں
ہر نئی فتح کے دامن میں چھپی تازہ شکست
ہر نئے موڑ پہ کچھ تازہ غموں کے صحرا
اور ان سب کو لیے جنبشِ پا میں اپنی
گھول کر دیدۂ پرنم میں تبسم کی کرن
خم بہ خم رہگذرِ عمر گریزاں پہ رواں
ان گنت صدیوں کو طے کرتا ہوا دور بہ دور
خواب در خواب جلاتا ہوا نظروں میں چراغ
شب بہ شب قافلۂ آبلہ پا گزرا ہے
کل یونہیں گزرا تھا اور کل بھی یونہیں گزرے گا

سحر و شب میں کوئی فرق نہیں
رات ہے آج کی رات
شبِ ماضی شبِ فردا ہیں نگاہوں میں سحر
رات دیدار فریب
صبح نظارہ دور
دور سے رات کو دیکھو تو سحر لگتی ہے
اپنے چہرے کی سیاہی یہ چھپا لیتی ہے
اوڑھ کر چادرِ رنگین کبھی کچھ یادوں کی
اور کبھی ڈال کے چہرے پہ تمنا کے ستاروں کی نقاب
اس رو کاہکشاں ہی پہ بشر گام بہ گام
وادیِ شب میں اترتا ہی چلا جاتا ہے
سفر تنہا ہی حیات

جس میں ممکن نہیں دم بھر کا قیام
جس میں رکنا ہی ہے موت
اور جس کی کوئی منزل ہی نہیں
شوقِ آغوش میں ناکامیٔ پیہم کو لیے
ایک شرمندۂ تعبیر سا خواب

~~~~~

انساں کی جہالت کا ابھی ہے وہی معیار
ہے سب سے سوا پختہ دلیل آج بھی تلوار

~~~~~

جل کے بھی اندھے پتنگوں کو نہ کچھ عقل آئی
آج بھی شمع کی ہے گرمیٔ بازار وہی

~~~~~
~~~~~

☆

سپنے

ہر انساں کے سینے میں چھپا
اک چھوٹا بالک رہتا ہے
جو اس کا جیون ساتھی ہے
اور سپنے دیکھتا رہتا ہے
انساں مٹی، بالک جوالا
انساں چھایا بالک تارا
اور انگلی پکڑ اس بالک کی
جیون کے اندھیرے رستوں پر
ہر انساں چلتا رہتا ہے

جیون کے خونی میداں میں
سانسوں کے دہکتے شعلوں پر
سپنوں کی برکھا ہونے دو
کچھ ہنستے آنسو گرنے دو
یہ آنسو گیت سناتے ہیں
یہ سپنے پھول کھلاتے ہیں
اور دھرتی کو مہکاتے ہیں

جیون پتھ کا سچا گیانی
جیون پتھ پر یوں چلتا ہے
اک رشتہ آج کی راتوں سے
اک رشتہ کل کی صبحوں سے
مٹی پہ قدم تاروں پہ نظر
مٹی سے قدم اکھڑیں نہ کبھی
تاروں سے نظر بھٹکے نہ کبھی
انساں بھی چلے، بالک بھی چلے

دنیا کے زہریلے تیرو!
اے دُکھ کے دہکتے انگارو!
چھینو نہ مرے سپنے مجھ سے
میں ان کے سہارے جیتا ہوں
جس روز یہ مجھ سے روٹھ گئے
اس روز نہ جانے کیا ہوگا
میں، میں نہ رہوں گا
بلکہ کوئی
گم نام سی شے ہو جاؤں گا

اس لمبے سفر میں جیون کے
دھرتی کے پتھریلے پتھ نے
جب بھی مجھے بڑھنے سے روکا
یہ سوہن ڈگر آڑے آئی
میں کترا کر اس رستے سے
پھر جیون پتھ پر آ ہی گیا

سپنوں کے کومل ہاتھوں نے
زخموں پہ مرے مرہم رکھ کر
اپنی دھیمی ٹھنڈک دے کر
ہر بار بچایا ہے مجھ کو
مٹی سے اُٹھایا ہے مجھ کو

یہ سپنے میرے لیے کیا ہیں!
میں کچھ بھی نہیں سپنے سب کچھ
یہ میرا رشتہ ہیں کل سے
یہ رشتہ ہی جیون ہے مرا
جس روز یہ رشتہ ٹوٹ گیا
میں اپنا بالک کھو دوں گا
اس جیون کے اندھیارے میں
اک اندھا بن کر بھٹکوں گا
اور مٹی میں مل جاؤں گا
چھینو نہ مرے سپنے مجھ سے

~~~~~
~~~~~

☆

جیون کا کیسا تِری کون

میری جاں ہے جس پہ نثار
وہ کرتی ہے غیر کو پیار
غیر کے دل کی رانی اور
میری چاہنے والی اور

آخر اس کا کیا مطلب؟

کبھی نہ سلجھے گی یہ ڈور
اس کا کوئی اور نہ چھور
ہر خانہ میں اک خانہ
پیٹ میں دانے کے دانہ
جسم کی بھوک
من کی ہوک
ہر رہ کے ہر موڑ میں موڑ
ہر من کے ہر چور کا چور
جیون جگ پریم اور شریر
دکھ ہی دکھ کی اک زنجیر

عالمگیر

ہر کا، کھا، میں گا، اور ما
الف اور بے اور تے اور ٹے
میں اور تو اور وہ اور یہ
آخر اس کا کیا مطلب؟
بھاڑ میں جائیں سب کے سب

~~~~~

کبھی موجِ دریا نے مڑ کر نہ دیکھا
سفینہ لگا کون تھک کر کنارے

~~~~~

میں اب بھی منصبِ اُلفت کے اہل ہوں کہ نہیں
عدو کو میں نے ترا نام لے کے پیار کیا

~~~~~
~~~~~

☆

انساں کو ملاؤ انساں سے

انساں کا لہو پینے والا
مذہب سے بڑھ کر کوئی نہیں
ایماں کے قبرستاں سے بڑا
صحرائے خموشاں کوئی نہیں
جاتی ہے نظر میری جب بھی
ان ایمانی چہروں کی طرف
شیطان مجھے پیارا لگتا ہے

یہ دین اور دھرم کے نعرہ زن
یہ نقلی جعلی پیغمبر
یہ کرودھ، گھنا کے سوداگر
یہ بڑے بڑے ٹیکے والے
لمبی لمبی داڑھی والے
یہ پریم کا راگ الاپتے ہیں
یہ امن کے گیت سناتے ہیں

اور خون بہاتے جاتے ہیں
سیلاب ہو یا ہالا ڈولا
وہ جنگ ہو یا ہو کوئی وبا
لے کر جانوں کے نذرانے
کچھ دیر تباہی کرتی ہیں
اور پھر غائب ہو جاتی ہیں

لیکن ایماں کے یہ مرگھٹ
صدیوں سے کھلی ہے ان کی دکاں
دم بھر کے لیے یہ بند نہیں
لے لے کر نام خداؤں کا
دن رات ہے جاری کام اِن کا
جلتی ہیں چتائیں پے در پے
لاشوں پر لاشیں آتی ہیں
اور یہ لاشوں کے بیوپاری
اپنے جسموں کی چربی کو
اپنے جسموں کی بدبو کو
خرقوں کی تہوں کی آڑ لیے
ہر آن بڑھاتے جاتے ہیں

اِن دھرم کے چوکیداروں سے
اِن مذہب کے رکھوالوں سے
اِن سورگ کے ٹھیکے داروں سے
اِن حوروں کے دلالوں سے
اب لڑنے کا وقت آیا

اللہ کو چھینوں بندوں سے
ایشور کو چھڑاؤ بھگتوں سے
دنیا کو بچاؤ ایماں سے
انساں کو ملاؤ انساں سے

~~~~~~
~~~~~~

☆

شہیدِ امن

(لال بہادر شاستری کی وفات پر)

(1)

تاشقند!
آج مٹی میں تیری
مل گئی آ کے ہمیشہ کے لیے
صبحِ مشرق کے کھلائے ہوئے اک باغ کی اک ادھ کھلی نازک سی کلی
جو ابھی پھول نہ بن پائی تھی
اپنے سینے میں لیے اپنی مہک
برگ ہی برگ فقط
جس میں کانٹے کا کہیں نام نہ تھا
جس کی پاکیزہ سفیدی میں کسی رنگ کی شوخی کی نہ تھی آلائش
بھینی بھینی سی مہک جو تیری وادی میں پہنچ کر بنی عطر
اور تجھے دی گئی اک نکہت و رنگِ ابدی

(2)

تاشقند!
تیری آغوش میں آج

سو گئی آ کے ہمیشہ کے لیے
صبح مشرق کے اُجالے ہوئے اک دیس کی اک بزم لجاتی سی کرن
اپنی چاندی میں چھپائے ہوئے سونا اپنا
نور ہی نور فقط
جس میں شعلے کی کوئی بات نہ تھی
اک چمکتی ہوئی شبنم کی روپہلی سی لکیر
اور ہر ذرّۂ خاکی کو تیرے دے گئی تابِ دوام

(3)

تاشقند!
آج پر کیف فضاؤں میں تری
بس گیا کھو کے ہمیشہ کے لیے
صبح مشرق کی سجائی ہوئی اک بزم کی دنیا کا اچھوتا اک گیت
زیرِ لب ہی تھا ابھی جس کا سرود
راگ ہی راگ فقط
جس میں ہلکا سا بھی لفظوں کی کثافت کا کوئی میل نہ تھا
جس کی شیرینی میں تلخی کا کہیں نام نہ تھا
جیسے نظروں سے کسی پیار بھرے دل کی پکار
اور تجھے تابہ ابد کر گیا انسان کے خوابوں کے ترانوں کی زمیں

(4)

تاشقند!
اجلی اجلی سی جبیں پر تیری
لکھ گیا آج ہمیشہ کے لیے نام اپنا
صبح مشرق کے اہنسا کے پیمبر کے جگائے ہوئے اک دیس کا اک مردِ جواں

موم میں اپنے چھپائے ہوئے آہن اپنا
عزم پہنے ہوئے اک موجِ تبسم کی نقاب
سطحِ انساں سے نہ اترا جو کبھی جنگ میں بھی
اور جب موڑ دیا جنگ کا خونی پنجہ
اپنی جاں صلح کی اس جیت پہ قرباں کر دی
اور مرّیخ کی بڑھتی ہوئی اولاد کی اس دنیا میں
کر گیا گوتم و گاندھی و مسیحا کے سروں کو اونچا
اور تاریخِ بشر میں نئے اک صفحۂ زرّیں کا اضافہ کر کے
دے گیا تجھ کو حیاتِ ابدی

(5)

آج سے تو ہمیشہ کے لیے
اک زیارت گہِ امن
اک محبت کا دیار
نئے بھارت نے جہاں اپنا اک انمول رتن
روس کی خاک کو نذرانہ دیا
امنِ عالم کے لیے
معبدِ انساں کے لیے

~~~~~
~~~~~

☆

اندھیر نگر میں دیپ جلیں

(1)

جو کچھ جیون نے گیان دیا
جو کچھ سیکھا، جو کچھ جانا
اس کو جانچا، پرکھا، تولا
پھر منہ کھولا
اور سچ بولا
میرے بولوں کی گونج بنی
میرے شبدوں سے لہر اٹھی
یہ لہر گئی
ہر موڑ موڑ، ہر ڈگر ڈگر
ہر گرام گرام، ہر نگر نگر
اور گونج اٹھے بولوں سے مرے وایو منڈل، دھرتی، امبر
یہ شبد مرے دہرائے گئے
ہر محفل میں، ہر حلقے میں
اونچے نیچے ہر طبقے میں
ہر دفتر ہر ودیالے میں
چرچا ان کا

بازاروں میں
اخباروں میں
دوکانوں، قہوہ خانوں میں
کھیتوں میں اور میدانوں میں
اجلے روشن ایوانوں میں
اندھیارے کالا گاروں میں
آناً فاناً یہ پھیل گئے
پورب، پچھم، اتر، دکھن
ہر کٹی کٹی، ہر بھون بھون
اور دیس کے کونے کونے سے جنتا کے دل کی لے بن کر
آواز آئی

یہ سچا ہے، یہ سچا ہے
اس مٹی کا ذرّہ، ذرّہ
اس دھرتی کا ہر اک باسی
ہر بوڑھا، بالک، نر، ناری
مِل کر چیخا
یہ سچا ہے، یہ سچا ہے، یہ سچا ہے، یہ سچا ہے،

(2)

لیکن دھرتی سے دُور اوپر دھرتی کا ایک آکاش بھی ہے
دھرتی ہی کے کچھ ذرّوں نے جہاں
آباد کیا ہے ایک نگر
آکاش نگر کے یہ باسی
(دھرتی ہی نے بَل اپنا دے کر آکاش پہ جن کو بٹھلایا)
اونچائی پر رہتے رہتے

مغرور ہوئے
طاقت کے نشے میں چور ہوئے
آکاش نگر کے سکھ پائے
جگ مگ، جگ مگ، کرتی مسند
شیتل صبحیں، کومل شامیں
بھینے بستر، میٹھی راتیں
ان کے جی کو اتنی بھائیں آکاش ہی کے یہ ہو بیٹھے
اور اپنی حقیقت بھول گئے
تاروں کی محفل میں آ کر ذروں کے دکھ سب بھول گئے
اونچے اونچے میناروں کے رہنے والوں سے ساز کیا
دھرتی سے ناتے توڑ لیے
رفتہ رفتہ
مٹی کے دیے سورج کے بیٹے بن بیٹھے
اب کان تھے جے کاروں کے لیے
آنکھیں تھیں فقط یاروں کے لیے
اور گردن تھی ہاروں کے لیے
باہر کی ہوا آئے نہ کہیں
سورج کی کرن چمکے نہ کہیں
جے کار کے نعروں میں ذروں کی چیخیں مل جائیں نہ کہیں
محفل کے دیوں میں دھرتی کے آنسو بھی نظر آئیں نہ کہیں
ہر اونچی کرسی والے نے
ہر ٹوپی، پگڑی، پھُندنے نے
کالے کالے چشمے پہنے
اور کھڑکیوں پر میناروں کی موٹے موٹے پردے ڈالے
آکاش نگر کا نام مٹا

آکاش نگر کے دیپ بجھے
اور اس کی جگہ
اندھیر نگر آباد ہوا

(3)

میرے بولوں کی گونج مگر
میرے شبدوں کی لہر مگر
اندھیر نگر تک آ ہی گئی
میناروں کے موٹے موٹے پردوں کو چیر کے یہ پہنچی
جے کار کے نعروں سے اپنی آواز بڑھا کر یہ پہنچی
ہر شور پہ چھا کر یہ پہنچی
اندھیر نگر میں جاگ ہوئی
دم بھر کے لیے اک ہالا ڈولا سا آیا
لیکن سورج کے بیٹے اب ذرّوں کی دہائی کیا سنتے
یہ سچ کی تاب نہ لا پائے
لیکن جی میں یہ خوف ہوا ڈولے نہ کہیں شاسن اپنا
ہر ٹوپی پگڑی گھمنڈ نے کی آنکھوں میں شعلے لہرائے
مینار کے رہنے والوں نے
گھبرا کے پکارا تاروں کو
تاروں نے کانپتے ہونٹوں سے
آواز دی کالے بادل کو
کالے کالے بادل گرجے
آکاش سے وانی یہ آئی
یہ جھوٹا ہے، یہ جھوٹا ہے
مٹی کے دیوں کی لو بھڑکی

ہر تارے نے تیوری بدلی
میناروں سے پھنکار آئی
یہ جھوٹا ہے، یہ جھوٹا ہے
اور یہ سن کر اک جشن ہوا
ہر کالی رات کے ڈیرے میں
ہر جھوٹ کپٹ کے حلقے میں
ہر پاپ اور جرم کے اڈّے میں
ہر چکلے میں، ہر تھانے میں
اور سب نے مل کر شور کیا
آکاش کی وانی سچی ہے
اندھیر نگر کا فتویٰ ہے
یہ جھوٹا ہے، یہ جھوٹا ہے، یہ جھوٹا ہے، یہ جھوٹا ہے

(4)

میرے آگے یہ پرشن نہیں
میں سچا ہوں یا جھوٹا ہوں
میں نے تو جانچ پرکھ کر ہی
اور خوب سوچ سمجھ کر ہی
منہ کھولا تھا
سچ بولا تھا
میرے آگے اب پرشن یہ ہے
اس دھرتی اور آکاش میں کیا سمبندھ کوئی اب باقی ہے؟
کیا ایک دُھرا ہے دونوں کا؟
مجھ کو تو ایسا لگتا ہے
جس دھرتی پر میں رہتا ہوں آکاش یہ اس دھرتی کا نہیں

دونوں کی اب بانی ہے الگ
آپس کے ناتے ٹوٹ چکے
ساتھی جو کبھی تھے چھوٹ چکے
آکاش الگ دھرتی ہے الگ
اب آمنے سامنے دو سینائیں جیسے مورچہ باندھے ہیں
دھرتی کے ذرّے اس جانب
آکاش کے تارے اس جانب
میری تو یہی آشا ہے ابھی
آکاش کی آنکھیں کھل جائیں
اور روشنی میناروں کو ملے
کالے کالے چشمے اتریں
موٹے موٹے پردے اُٹھیں
دھرتی کی ہوائیں پھر آئیں
سورج کی کرنیں پھر چمکیں
پھر جگ مگ، جگ مگ دیپ جلیں
اندھیر نگر کی مٹی پر آباد ہو پھر آکاش نگر
ڈرتا ہوں اگر ایسا نہ ہوا
دھرتی سے ابھرے گی جوالا
اور اس باغی اندھیر نگر کو اور اندھے میناروں کو
اک راکھ بنا کر رکھ دے گی
اور اپنے اچھالے ذرّوں کو
جو اپنی حقیقت بھول کے آج اپنے کو تارا کہتے ہیں
پھر ناچ کے اک خونی تانڈو
پھر روند کے پیروں کے نیچے
مٹی میں ملا کر رکھ دے گی

اے کاش نہ آئے یہ ساعت!
اے کاش پھر ان میناروں کے دھرتی سے ناتے جڑ جائیں!
اندھیر نگر میں دیپ جلیں
ورنہ
ورنہ، نہ کہیں

~~~~~

حریف بن کے مقابل میں آ سکا نہ جہاں
تو دوست بن کے پسِ پشت آ کے وار کیا

~~~~~

☆

رشوت

آیا جو ہوا کا اک جھونکا
پربت کی اونچی چوٹی سے
ننھے منّے سے کچھ کنکر
چٹّان بنے جو بیٹھے تھے
وادی میں لڑھک کر آکے گرے
جس خاک سے اڑ کر پہنچے تھے اس خاک پہ پھر واپس آئے
کچھ کھسیائے کچھ جھنجلائے
اور اپنی جھیپ مٹانے کو
کچھ چیخے اور کچھ چلائے
جب کچھ نہ چلی
تب یہ کہہ کر
اک دوسرے کو سمجھانے لگے
اک ادنیٰ اور کم ظرف بشر
چوٹی پہ پہنچ تو سکتا ہے
لیکن اس کا
چوٹی پہ ٹھہرنا مشکل ہے
پھر کان میں چپکے سے بولے
جب تک نہ ہوا کو رشوت دے

☆

نقابیں

(1)

شاعر کبھی دل میں نہ اُٹھا جس کے کوئی درد
الفاظ پرونے کا مگر لے کے سہارا
اس نے غمِ کاذب کے ہر اک رُخ کو اُبھارا
اشکوں کے ترانے
آہوں کے فسانے
دنیا کو یقین آ ہی گیا صاحبِ دل ہے
ایک عارفِ غم ہے

(2)

اک کشتۂ غم جس کی ہر اک سانس ہے اک ٹیس
محرومِ زباں سے
ہر حسنِ بیاں سے
اک ٹوٹے ہوئے دل کی حقیقت کو کہے کیا
اشکوں میں ستارے ہیں نہ آہوں میں شرارے
اس کے غمِ خاموش کو کوئی بھی نہ سمجھا
دنیا میں نہیں کوئی حقیقت کا پرستار
ہر سمت نقابوں ہی نقابوں کے خریدار

~~~~~
~~~~~

☆

(قطعات)

دردِ زیست

زیست اک کوہِ گراں ہے وہ یہاں ہو کہ وہاں
درد ہی نغمۂ جاں ہے وہ یہاں ہو کہ وہاں
آج بھی ہر افقِ صبح کو کجلائے ہوئے
شبِ ہستی کا دھواں ہے وہ یہاں ہو کہ وہاں

نُور وظلمت

نور وظلمت نے اس طرح مل کر
دائرے دائروں میں ڈالے ہیں
آج آساں نہیں ہے یہ کہنا
یہ اندھیرے ہیں، وہ اُجالے ہیں

کانٹوں کی بہار

اُگ رہے ہیں چمن میں یوں کانٹے
گل کا کوسوں تلک نشاں ہی نہیں
آشیانہ تو کب کا جل بھی چکا
دل میں اب خواب آشیاں بھی نہیں

اضطرابِ دنیا

کوئی کروٹ بڑی سے لینے پھر
مضطرب بار بار ہے دنیا
جیسے مرگِ ناگہاں کے لیے
ہمہ تن بے قرار ہے دنیا

انتقام

شیخ صاحب کی تلخ گوئی نے
اور اُلٹا ہی کچھ اثر ڈالا
جانے کتنوں نے سن کے وعظ ان کا
انتقاماً گناہ کر ڈالا

حسن کی پوشاک

اس حسنِ خدا داد کو کچھ اور سنوارا
ترشے ہوئے الماس کے ہر رُخ کو اُبھارا
گل ہے تہہِ شبنم کہ ہے صہبا پسِ مینا
پوشاک کی پوشاک نظارے کا نظارا

جبرِ پشیماں

میرے چہرے کا رنگ یوں زرد ہے کیوں!
میرے ہونٹوں پہ یہ دمِ سرد ہے کیوں!
میں نے ہی تو دشمن کو کیا تھا خود قتل
پھر آج یہ پہلو میں مرے درد ہے کیوں!

انفرادیت

اپنی باتیں بھی مجھ کو کر لینے دو
دنیا سے الگ اک آہ بھر لینے دو
یارو نہ سکھاؤ مجھ کو جینے کے طریق
مجھ کو اپنی ہی طرح مر لینے دو

بڑھاپا

اب کوئی گیت سناتے ہیں گزرتے ہوئے دن
نہ کوئی درد جگاتے ہیں گزرتے ہوئے دن
دل سے چپ چاپ دبے پاؤں گزر جاتے ہیں
جیسے اب آنکھ چراتے ہیں گزرتے ہوئے دن

~~~~~
~~~~~